بھوپال

تحریکاتِ آزادی کے آئینہ میں

سید عابد علی وجدی الحسینی
(قاضی شہر بھوپال)

بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ بھوپال

بھوپال
تحریکاتِ آزادی کے آئینہ میں

سید عابد علی وجدی الحسینی
(قاضیٔ شہر بھوپال)

بھوپال بک ہاؤس بدھوارہ بھوپال

بھوپال تحریکاتِ آزادی کے آئینہ میں

(C) مصنف

پہلا ایڈیشن ایک ہزار

سالِ اشاعت سنہ ۱۹۸۶ء

طباعت کلاسیکل پرنٹرس دہلی

قیمت

ساٹھ روپے

ناشر عبدالباسط خاں

بھوپال بک ہاؤس بدھواڑہ۔ بھوپال

فہرست مضامین

فہرست کتابیات و حوالہ جات کتاب ہٰذا

۱۔ خزائن الفتوح از ڈاکٹر محمد یوسف علیگ
۲۔ تاریخ ہندوستان مولوی ذکاء اللہ دہلوی
ترجمہ مولوی غلام ربانی ۱۳۰۱ھ
۳۔ تمدنِ عرب ڈاکٹر گیبٹ ولیبان
ترجمہ سید علی بلگرامی
۴۔ سیر المتاخرین غلام محمد
۵۔ ترجمہ تاریخ مغربی یورپ ڈاکٹر جیمس ہارڈی و رابن سین
۶۔ ترجمہ تاریخ یورپ جے گرانٹ
۷۔ تاریخ روما آر ایچ ایف بلیھم
۸۔ قسطنطینِ اعظم ارجان لی مرتھ اسکوائر

۹- یورپ سولہویں صدی میں	اے ایس جانسن لولو
۱۰- تاریخِ امریکہ	محمد یحییٰ صاحب تنہا
۱۱- تاریخ ہند برطانیہ	جے سی مارش مین
۱۲ منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی
۱۳- سوانح احمدی	محمد جعفر تھانیسری
۱۴- شہادۃ الثقلین	عبدالجبار استانوی
۱۵- اسیر مالٹا	حضرت مولنا حسین احمد مدنی
۱۶- شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات	پروفیسر خلیق احمد نظامی
۱۸- کمپنی کی حکومت	پروفیسر باری
۱۹- تاریخ خاندانِ عباسیہ	نور احمد قادری
۱۹- تاریخ سلطنتِ خداداد	محمود خاں
۲۰- تحریکِ شیخ الہند	مولنا محمد میاں
۲۱- علمائے حق اول، دوم	مولنا محمد میاں صاحب
۲۲- روح روشن مستقبل	طفیل احمد منگلوری
۲۳- تاج الاقبال	نواب شاہجہاں بیگم
۲۴- ریاستوں کی سیاست	ابو سعید بزمی
۲۵- صبح وطن	شاکر علیخاں
۲۶- شعلۂ حیات	ایم عرفان
۲۷- شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک	مولنا نور الحق علوی
۲۸- تزک سلطانی	سلطان جہاں بیگم
۲۹- حیاتِ قدسی	
۳۰- الکۂ بھوپال	نواب یٰسین محمد خاں
۲۱- القار المنن	نواب صدیق الحسن خاں
۲۲- تذکرہ علماء و صوفیاء بھوپال	وجدی الحسینی

دیباچہ از مصنّف

حامداً و مصلیاً

"تاریخ انسانیت کا حافظہ ہے" یہ ایک بلیغ مقولہ ہے۔ ہر قوم نے عوامی کہانیوں مقامی کہاوتوں، اور لوک گیتوں سے اس حافظہ کی حفاظت کی ہے۔ چونکہ قانونِ توارث کے ماتحت موروثی خصائص کی حفاظت و نگہداشت ضروری ہے اس لئے ہر قبیلہ اور ہر خاندان نے اپنے بیتے ہوئے اہم لمحات، گزرے ہوئے خصوصی حوادث و واقعات کی یادوں کو زندہ اور تازہ رکھنے کے لئے ہر دور میں سعی کی ہے۔ اقوام عالم میں ملت اسلامیہ ایک تاریخی ملت ہے جس کا تاریخی تسلسل آج تک نہیں ٹوٹا۔ دنیا کی کوئی قوم اس کے ہم دوش ہو کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔ آغاز اسلام سے ہی ہمارے ملک ہندوستان سے اسلام کا اقامتی و وطنی تعلق عہد خلافت سے تاریخی حقائق کی روشنی میں ثابت ہے۔ جس کی تفصیلی تاریخ ایک محقق مورخ کے انتظار میں ہے۔

البتہ غوری کے حملہ کے بعد اسلامیان ہند کی تاریخ کا جب سے دفتر کھلا اس کے تفصیلی واقعات تاریخ کے سینہ میں محفوظ اور اوراق کتب میں پھیلے ہوئے ہیں۔ "بھوپال تحریکات آزادی کے آئینے میں" اسلامیان ہند کے آٹھ سو دعوتی و اصلاحی اور سیاسی تاریخ کا ایک جائزہ ہے جس کے اندر ریاست بھوپال کو زمین بنا کر پوری تاریخ اسلامی ہند کے عطر کی کشید کی گئی ہے۔

ہندوستان پر مسلم حکومتوں، ترک، افغان اور مغلوں کے دور میں جب ہندوستانی مسلمانوں میں مذہبی بگاڑ اور دینی خرابیوں نے اسلام کے نورانی چہرہ پر پردہ ڈالنا اور شریعت مقدسہ کے شفاف آئینہ پر اپنوں اور

غیروں نے گرد و غبار اڑانا چاہا تو بزرگوں نے اس پردہ کو چاک کر کے اسلامی تعلیمات کے اصلی چہرہ کو نمایاں کیا اور کن کن مصلحوں کے ہاتھوں نے اس گرد و غبار کو صاف کر کے اس آئینہ کو جلا بخشی۔ مغل شہنشاہوں کے دور میں جب شرک و بدعت کے مہیب و تاریک فتنوں نے اسلام کو تحریف و تصحیف کی گمراہیوں کا نشانہ بنانا چاہا تو دو عظیم دعوتوں " دعوت الف ثانی اور دعوت ولی اللّٰہی نے اپنے اصلاحی و انقلابی درخشاں کارناموں سے ہندوستان کو جگمگا دیا۔

پھر جب فرنگی سامراج نے اپنے رسوائے عالم ڈپلومسی (ڈیوائیڈ رول) کے ذریعہ ہمارے ملک کو غلامی کے شکنجہ میں کس لیا تو علماء حق نے مردانہ وار راہ جہاد پر گامزن ہو کر برطانوی شہنشاہیت کے خلاف کہاں کہاں معرکہ آرائیوں کا میدان گرم کیا۔ اور کن کن محاذوں پر مقابلہ کیا۔ اس کا مختصر مگر ضروری تذکرہ کیا گیا ہے۔ ماضی کی اس سبق آموز و عبرت انگیز داستانوں کو دلکش و دلآویز اور ولولہ انگیز انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس سے برطانوی سامراج کا اصلی مکروہ چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور مجاہدین حق کی عظیم قربانیوں کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ کتاب مذکور جہاں مسلمانوں کی شاندار ماضی کی آئینہ دار ہے وہیں ان کے روشن مستقبل کے لئے شمع راہ بھی ہے۔ مغرب کی شیطانی مادی تہذیب نے جن سیاسی ہتھکنڈوں سے مشرق کی روحانی اقدار کو پامال کیا اور پوری انسانیت کو تباہی و بربادی کے جس دہانے پر لا کھڑا کیا ہے اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ جس مغربی تہذیب کے پیچھے مشرقی اقوام آنکھیں بند کر کے سرپٹ دوڑ رہی ہیں ان کو اس سے ہوشیار و خبردار کیا گیا ہے۔ کتاب کا ہر باب دعوت فکر و عمل کا حامل ہے۔ مصنف کو اہل نظر سے پوری پوری توقع ہے کہ تاریخی حقائق کے تجزیہ کے سلسلہ میں جو نتائج اخذ کئے ہیں انکی لغزشوں اور کوتاہیوں سے مطلع فرما کر ممنون کریں گے تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کا لحاظ رکھا جا سکے

پیش لفظ

تاریخ اور سیرت ہر قوم ہر ملک کا قیمتی سرمایہ اس کی عظمتِ گذشتہ کا درخشاں آئینہ، عہد رفتہ کا یادگار صحیفہ اور بقول ایک مفکر "انسانیت کا حافظہ ہے"۔
دورِ ماضی اور عہدِ گذشتہ کے یہ وقائع واحوال قوموں اور ملّتوں کے حال اور استقبال کی تمہید بنتے اور انفرادی واجتماعی زندگی کے لیے عزم وحوصلہ اور ترقی و پیش قدمی کے لیے جوش وولولہ پیدا کرتے ہیں کارزارِ حیات کے ہر معرکہ ء سنگیں میں یہی واقعات صدہا موانع اور ہزار ہا رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے لوگوں کو قسمت آزمائی اور نبرد آرائی کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کی قدیمی تاریخی قومیں بابل، اشوری اور مصر نے اپنے آباؤ اجداد کے جنگ وامن کے واقعات کو اور عمومی حالات کو مسماری (میخی) اور تصویری (ہیروغلیفی) رسم الخطوں کے اندر پتّیوں (پیپرس) پتھروں، کچّی اور پکّی اینٹوں میں محفوظ کر کے اور زیرِ زمیں دفن کر کے آنے والی نسلوں کے لیے عظیم ذخیرہ چھوڑا۔ اس سے تاریخ کے آغاز کا مسئلہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے ہوش مند باشعور انسانوں نے اپنے خاندان و قبیلے کے گزرے ہوئے واقعات کو اولاً لوحِ حافظہ میں ثبت کیا لیکن عرب کی کہاوت کے مطابق۔
اَلْعِلْمُ صَیْدٌ وَّالْکِتَابَۃُ قَیْدٌ یعنی علم یا معلومات انسانی ایک شکاری جانور یا ایک آہوئے رم خوردہ ہے جو تلاش وجستجو کے صحرائے بیکراں میں یکایک آنکھوں کے سامنے آیا پھر چھلاوہ کی طرح ایک دم نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ اس لیے تحریر ونگارش اس جنگلی شکار کے لیے ایک مضبوط جال ہے جس کے اندر وہ باندھا جاکر

مقید و پابند ہو جاتا ہے تحریر کتابت کی زنجیر میں بندھ جانے کے بعد اب وہ بھاگنے کے قابل نہیں رہتا اس لیے علم انسانی کی فتوحات اس کے قوتِ حافظہ کی مرہونِ منت ہے لیکن خود حافظہ کا عظیم الشان ذخیرہ قلمی نگارشات کی بدولت انسانیت کے ہاتھ لگا ہے۔

علوم انسانی کا قافلہ اسی قلم کی جولانیوں کی بنا پر منزلِ ارتقا کی طرف مسلسل رواں دواں ہے عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ کتاب فطرت کا یہ بلیغ اشارہ اسی حقیقت کبریٰ کے لیے ہے۔

بہر حال حیاتِ انسانی کے پچھلے واقعات و احوال سب سے پہلے لوحِ حافظہ میں ثبت ہوئے پھر لوحِ حافظہ سے منتقل ہو کر پتھروں، چٹانوں، غاروں، گپھاؤں میں کندہ کیے گئے۔ جب ان واقعات و احوال اور حوادث و سوانح نے تحریری شکل اختیار کی تو اس کا نام علمِ تاریخ ہوا اس لیے تاریخ انسانیت کا سب سے قدیم علم ہے پھر علم تاریخ کا تعلق ایک طرف تو عام اجتماعی زندگی سے رہا جس کے اندر خاندانوں، قبیلوں اور قوموں کے وقائع و احوال کو سمیٹا گیا ہے اور دوسری طرف مخصوص افراد کے حالات اور ان کے غیر معمولی اصلاحی و انقلابی ملکی و انتظامی اور سیاسی کارناموں سے رہا اس کا نام سیرت ہے جس کو انگریزی میں Bio. graphy کہتے ہیں۔

تاریخ کا ایک شعبہ شاہانِ عالم فاتحانِ اعظم کی قوت و سطوت اور ان کے جلال و جبروت کے مظاہرے کا نام ہے تو دوسرا پہلو انسانیت کے مصلحوں، پیشواؤں اور عظیم رہنماؤں کی روح پرور نمود سے عبارت ہے جس کو ہم سوانح عمری کہتے ہیں۔

تاریخ کا اجتماعی حصہ جس طرح شان و شوکت، طاقت و حشمت کے مبالغہ آمیز احوال کی بنا پر افسانوی حیثیت اختیار کر کے بسا اوقات اصل حقیقت سے دور ہو گیا ہے اسی طرح تاریخ کا انفرادی پہلو بھی واقعیت کی اصلی و سچی روشنی

سے بہت سے مقامات پر خالی نظر آتا ہے کیونکہ فطرتِ انسانی اپنی محبوب شخصیت کے لیے ہالہ بن کر اصل چہرہ کو چھپا دیتی ہے اس لیے عہدِ قدیم کے اندر تاریخ قرآنی زبان میں اساطیر الاولین (اگلوں کے سچے قصے کہانیوں کا نام ہو گیا) اور تاریخ کا اصلی مقصد جو انسانی حیات کے انفرادی و اجتماعی گوشوں سے عروج وزوال کی عبر و بصائر اور ترقی و تنزل کے مراحل و منازل کی معرفت تھا وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا لیکن فطرت بشری کا یہ فطری مطالبہ کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم اور بہتر سے بہتر ہدایت اس وقت تک انسانوں کے لیے جاذبِ قلب و نظر نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیچھے کوئی باعمل مثالی شخصیت جلوہ فرما نہ ہو اپنی جگہ پر بدستور باقی رہا اس لیے اسلام نے تاریخ کو ایک نیا حقیقت پسند روپ دیا اور سیرت کے ذریعہ ہدایتِ انسانی کا نیا باب کھولا اب تاریخ و سیرت واقعات کی محض کھتونی، اور صرف وقائع احوال کا مجموعہ نہیں رہے بلکہ عہدِ ماضی کے آئینہ میں حال و مستقبل کے سنوارنے کا ذریعہ ہو کر ایک مستقل علم بن گئے۔

تاریخِ انسانی کا یہ عظیم الشان بلند و بالا اور وسیع و فراخ محل اپنے استحکام و مضبوطی میں ایران کے طاقِ کسریٰ اور مصر کے عظیم اہرام اور اپنی وسعت و بلندی میں قدیم یمن کے مشہور قصرِ غمدان سے کم نہیں ہے بلکہ کبھی نہ کبھی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جانے والی ان عمارتوں کے مقابلہ میں تاریخِ انسانی کی عمارت بہت رفیع و بلند اور مضبوط و مستحکم ہے۔

جس طرح ایک عالیشان محل کے بنانے کا منصوبہ جب زیر عمل آتا ہے تو سب سے پہلے اس عمارت کی داغ بیل چونا یا راکھ سے ڈالی جاتی پھر اس کی نیو کھودی جاتی ہے اس کے بعد بنیادوں کو استوار کر کے ایک عرصہ تک چھوڑ دیا جاتا ہے کیونکہ ساری عمارت کی پختگی و مضبوطی کا دارومدار ان ہی بنیادوں پر ہوا کرتا ہے پھر ان ہی پختہ و مستحکم بنیادوں پر دیواریں چنی جاتیں اور ان دیواروں پر چھت تانی جاتی ہے جتنی بلند و بالا اور اونچی کئی منزلہ

عمارت ہوگی اتنی ہی چوڑی چکلی اور گہری بنیادیں ہوا کرتی ہیں آخر میں بلند گنبد و مینار اور فلک بوس کنگورے اس عمارت کی رفعت و بلندی اور عظمتِ شان کی نشانی بن کر نمودار ہوتے ہیں اور ہر دور و نزدیک سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اور ہر ایک کی نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ عام انسانوں کی نگاہیں ان اونچے گنبدوں اور میناروں پر جم کر رہ جاتی ہیں۔ ان شاندار خوشنما گنبدوں میناروں کو دیکھ کر ظاہر بیں انسان ٹھٹھک جاتے اور ان کی رفعت و عظمت کے تصور میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ اس عمارت کی بنیادوں کا تصور تو کجا اصل عمارت کا خیال بھی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے جو حال اس بلند و بالا قصرِ شاہی کا ہے اس سے زیادہ حالت تاریخ کے عالیشان محل کی ہے دنیا کی سلطنتوں کو قائم کرنے حکومتوں کے اندر انقلاب و تبدیلی لاتے ہیں جن عوام و رعایا کا خون پسینہ ہی شامل نہیں بلکہ ان کی جاں فروشانہ قربانیوں اور فداکارانہ جاں فشانیوں کا زبردست عمل دخل ہے ان کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا تاریخ کے صفحات پر فاتحوں، سپہ سالاروں اور بادشاہوں مہاراجوں کے نام تو جلی حروف میں لکھے نظر آئیں گے لیکن جن لوگوں نے ان سرداروں کے دست و بازو بن کر ان کو سرداری عطا کی تاریخ کے اوراق ان کے ذکر سے خالی ہیں اس لیے تاریخ نام ہو گیا ان سرداروں، سربراہوں، راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے کارناموں کا جو ان خونی معرکوں کے سمندر سے سرخرو ہو کر اور کامیاب ہو کر نکلے لیکن وہ جاں نثار عوام جفاکش فوجی اور جانباز سپاہی جنھوں نے ان معرکوں میں خون پانی ایک کیا اپنے جسموں کو لہولہان کیا اور زندگیوں کی بازی لگائی کہ وہ ہی ان فتح یابیوں اور کامرانیوں کی عمارت کے در و دیوار بلکہ جڑ بنیاد اور وہی اصلی تاریخ ساز ہیں ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کے احوال سے سینۂ تاریخ ویران اور اس کے صفحات خاموش ہیں خال خال کسی جگہ کسی غیر معمولی کارنامہ پر ان کا ذکرِ خیر

آگیا ہو تو آگیا ہو لیکن عام نگاہیں ان اونچے گنبدوں اور رفیع الشان میناروں پر ٹھہر کر رہ گئیں۔

اسلام نے جہاں اور علوم و فنون کو مخصوص طبقوں کی اجارہ داری سے نکال کر انسانیت کی متاعِ مشترک قرار دیا وہیں تاریخ و سیرت ایک زبردست انقلاب سے دوچار ہوئے۔ کتابِ حکمت نے تاریخ کو افسانوی ماحول کی تنگ نائیوں سے نکال کر حقیقت پسندی اور واقعیت نگاری کی فراخ و وسیع فضاؤں میں لاکر کھڑا کر دیا اور انسانی زندگی پر اس کے ذریعہ اثر ڈالنے کا کام لیا گیا۔

لقد کان فی قصصہم عبرۃ لاولی الالباب

صحیفۂ فطرت نے انسانی قصص کو جن کے مجموعے کا نام تاریخ ہے دانشمندوں کے لیے سامانِ عبرت قرار دیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس نظمِ حکمت میں جو معنویت پوشیدہ ہے اور اس کے پس پردہ جو حقیقت عالیہ جلوہ گر ہے اس پر گہری نظر ڈالی جائے چنانچہ جب ہم اس لفظ پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ عبرت و عبور کا ایک ہی ماخذ ہے جس کے معنی دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پہنچنے اور سمندر پار کرنے کے ہیں۔ انسانی زندگی انفرادی زندگی کے کنارے سے اجتماعیت کے ساحل تک پہنچنے میں برابر آگے بڑھتی رہتی ہے ایک مجموعۂ افراد کے اٹھ جانے پر دوسرا مجموعہ اس کی جگہ لے لیتا ہے اس طرح کاروانِ حیات صحرائے وجود میں مسلسل قدم آگے بڑھاتا ہوا جا رہا ہے۔ تعاقب امثال کی جو حقیقت فرد کے اندر جاری و ساری ہے وہی اجتماعیت میں بھی جلوہ فرما ہے یعنی جس طرح جسمِ انسانی ہر وقت تحلیل ہوتا رہتا اور ان تحلیل شدہ ذروں یا فنا ہونے والے خلیوں کی جگہ دوسرے ذرہ یا خلیئے لے لیتے ہیں اور شعلہ جوالہ کی طرح درمیان میں انفصال یا جدائی کا احساس نہیں ہوتا اس لیے انسان عالمِ طفولیت سے عہدِ پیری تک ہر لمحہ ہر لحظہ مسلسل بدلتا رہتا ہے لیکن رہتا وہی ہے بالکل اسی طرح اجتماعی زندگی کا حال سمجھنا چاہیئے کہ افراد کی ایک جمعیت چلے جانے پر

دوسری جمعیت اس کی جگہ لے لیتی ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ حیاتِ انسانی اگرچہ ازلی نہیں ہے لیکن اس کا مستقبل ابدیت سے ہم آغوش ہے تاریخِ انسانی اس ابدی زندگی کا ابتدائی کنارہ ہے جس سے سفینۂ حیات گزر کر دوسرے کنارے کی طرف رواں ہے جس طرح زندگی کا یہ سمندر بے پایاں ہے اسی طرح اس سے بڑھ کر اس کا ساحل حلقۂ حد نظر سے آگے ہے۔ زندگی کی مسلسل سرگرمی وجولانی وقافلہ حیات کی متواترہ پیمائی انسانیت کو فکر وعمل کا پیغام دیتی ہے اور تاریخ اسی دعوتِ فکر وعمل کی ترجمان ہے تاریخ کا یہ داخلی اور روحانی تصور ہے جس کو ہم نے اپنی علمی بے مائگی کی بساط کے مطابق پیش کر دیا ہے لیکن اس کی ایک مادّی وخارجی حقیقت بھی ہے اور وہی خارجی حقیقت تاریخ انسانی کی تدوین میں جلوہ فرما ہے جس کے مرقع میں قوموں اور قبیلوں کے حالات وواقعات اور اہم عظیم شخصیتوں کے سوانح واحوال کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے پڑھنے سے دلوں میں حوصلۂ حیات اور ولولۂ ارتقا وثبات پیدا ہوتا اور پچھلی غلطیوں اور بیتی ہوئی لغزشوں سے جو قوموں کے ادبار وتنزل کا باعث بنتی ہیں ان سے خود کو بچائیے اور بچ کر آگے بڑھنے کا سبق ملتا ہے۔

ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ ہم اپنے عظیم الشان ملک کی پچھلی تاریخ کو واقعیت کے اعلیٰ معیار اور صحیح قومی خطوط پر آزادی کے تیس سال گزر جانے پر بھی ترتیب دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ برطانوی سامراجی مورخین نے اپنے شیطانی منصوبہ کے مطابق تاریخ ہند کو توڑ مروڑ کر جس عیاری مکاری اور دجل انگیز انداز میں ترتیب دیا ہے اس کے بین السطور میں پھوٹ ڈالو حکومت کرو کا فرعونی نظریہ اور سامراجی پالیسی کارفرما ہے جس کو پڑھ پڑھ کر ہماری نئی پود جوان ہوئی ہے اور اس کے پڑھائے ہوئے اسباق ملک کے خرمنِ امن وسکون کو ہر وقت فسادات کے شعلوں سے ہوا دیتے رہے ہیں ان نفاق پرور فرقہ پرست برطانوی مورخین نے تاریخی واقعات کے پردہ میں انسانیت

دشمنی کا زہر گھول دیا ہے جس کو دل فریب اور خوشنما عنوانات دے کر اور شکر چڑھی گولی بنا کر یہاں کے باشندوں کے حلق میں اتار دیا ہے برطانوی مصنفین کی لکھی ہوئی تاریخ کا یہ عطرِ مجموعہ باہمی نفرت و عداوت کے زمین پر تیار کیا گیا ہے۔ جس نے اولاً پورے ملک کی فضا کو مسموم کیا پھر متحدہ ہند کو تین تیرہ کر کے رکھ دیا۔

وہ ملک جو ایک چھوٹے برّاعظم کی حیثیت سے ابھرا تھا اور مختلف مذاہب کے ماننے والے اور رنگا رنگ تہذیب و تمدن کے رکھنے والے باشندوں پر مشتمل ایک خوشنما چمنستان بن کر متحدہ قومیت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا سامراج کی بے رحم تلوار نے اس کو تقسیم کے چشیم زخم کا شکار بنا کر یہاں کے رہنے والوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر دیا اس خانہ جنگی اور بدامنی کی شب تاریک کی شاید کوئی سحر نہیں ہے؟ باہمی رقابتوں، آپس کی عداوتوں نے اس ملک کے آسمان پر ایسا گھٹا ٹوپ اندھیرا ڈال دیا ہے کہ اتفاق و اتحاد کی شعاعیں چمکنے کی امیدیں موہوم' اور محبت و مودت' پریم پیار کی بارانِ رحمت کے نزول کی توقعات دور دراز کی بات نظر آ رہی ہے۔ کیا دلوں کی دوری کی یہ مسافتیں سمٹ جائیں گی؟ کیا دلوں کے فاصلے گھٹ جائیں گے؟ قوموں کے باہمی تعلقات کی تاریخ میں یہ انہونی بات نہیں۔

چونکہ ایشیائی اقوام کا قوام میل، ملت، محبت و الفت سے بنا ہے اور ہر سچّے مذہب کی بنیاد محبت پر اٹھائی گئی ہے اس لیے نقطۂ اتحاد پیدا کرنا کوئی امر محال نہیں اس نقطۂ اتحاد کی جدید ذہن کے لیے تلاش و جستجو اس لیے دشوار و مشکل ہو رہی ہے کہ سامراجی تاریخ نے قوموں کے اندر زہریلی فرقہ پرستی کا ایسا بیج بویا ہے جو تناور درخت بن کر اپنے سایہ میں تینوں ملکوں کو لے چکا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ ان بنیادی غلطیوں کی نشاندہی کی جائے جس کی بنا پر دلوں کا میل اور نفرت کا غبار چھٹ جائے اور انسانیت کا اصلی نورانی چہرہ نگاہوں کے سامنے

آجائے۔

انسانیت کی تاریخ قبیلوں، خاندانوں اور قوموں کے ایک دوسرے سے تعلقات، میل ملاپ اور باہمی کشمکشوں اور معرکہ آرائیوں کی تاریخ ہے۔

مشرق جہاں سے سورج نکلتا ہے وہیں سے تہذیب انسانی کا آفتاب بھی طلوع ہوا اور پھر انسانوں کے یہ قافلے مختلف علاقوں میں بکھر گئے۔ مشرق نے جس تہذیب و تمدن کی داغ بیل ڈالی وہ چار دانگ عالم میں پھیل گئی اور پھر ہر علاقے کی مقامی خصوصیات وہاں کی آب و ہوا کے رنگ میں رنگ کر اس خاکدانِ عالم میں تہذیبوں کے رنگارنگ گلدستے تیار ہو گئے۔ اشوری و فنیقی، بابلی و مصری اقوام اقوام کے زوال کے بعد مغربی اقوام روم و یونان نے اپنی ذہنی و عسکری فتوحات کے بل پر مشرقی علاقوں کو زیر نگیں کیا پھر اپنی سربلندی اور برتری کا پرچم لہرایا۔

جب اسلام نے چھٹی صدی عیسوی میں پرانی دنیا کی ناف (عرب) سے نکل کر ایک عالمگیر تہذیب کی انسانیت کو دعوت دی تو اس وقت ایرانی و رومی شہنشاہتیں آدھی دنیا پر اپنے اقتدار و تسلط کے لیے باہم معرکہ آرا تھیں اسلام نے اپنی سادگی و نرمی اور فطری کشش انگیزی کے ذریعہ بہت ہی مختصر مدت میں مشرق سے مغرب تک اپنے تہذیبی نقش و نگار اور تمدنی آثار صفحۂ گیتی پر مرتسم کر دئے جبکہ مغرب قرونِ وسطیٰ کے تاریک دور سے گزر رہا اور گہرے خوابِ غفلت میں پڑا ہوا تھا۔

اسلام کی عالمگیر دعوت کی پکار سے وہ خوابیدہ قومیں جاگ اٹھیں جب انھوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو سورج سر پر چمک رہا تھا کچھ سعادت مند روحوں نے خدا کی اس عالمگیر روشنی سے اکتسابِ نور کیا اور کچھ کورنظر انسانوں کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں انھوں نے چمگادڑوں کی طرح آنکھیں بند کر کے چمکتے ہوئے سورج کی روشنی سے انکار کیا اور اسلام کے خلاف اندرونی و بیرونی

سازشوں کا جال ہر طرف پھیلا دیا اور حق کے خلاف مسلسل جنگ آزمائیوں کا میدان گرم کر دیا ایرانی شہنشاہیت نے تو اپنے مغرور اور خودسرانہ رویہ کی بنا پر تھوڑے ہی عرصہ میں دم توڑ دیا لیکن رومی حکومت یا دوسرے لفظوں میں عیسائیت نے اسلام کے خلاف مسلسل جنگ جاری رکھی قرونِ وسطیٰ کی صلیبی جنگوں کا تسلسل اسی دیرینہ عداوت کا ایک شاخسانہ ہے بہر حال مشرق و مغرب کی یہ کشمکش سولھویں صدی تک پہنچ کر مغربی اقوام کی فتحیابی پر منتج ہوئی اور سترھویں صدی کے اختتام اور اٹھارھویں صدی کے آغاز پر ایک بڑا حصہ ان کا غلام بن چکا تھا اس سلسلہ میں مشرق کی جس عظیم طاقت نے سامراج سے لوہا لیا اور قدم قدم پر سامراجی حکومتوں کا جم کر مقابلہ کیا اور جو قوم ان کے مقابلہ میں سخت جان نکلی وہ ملتِ اسلامیہ تھی اس لیے فرنگی سامراج نے جب ہندوستان جنت نشان پر اپنے منحوس قدم رکھے جس قوم کو سب سے پہلے اپنی وحشت و بربریت اور درندگی کا نشانہ بنایا وہ مسلمان تھے۔ چونکہ ایشیا کے ہر علاقے میں مغربی اقوام کو ملتِ اسلامیہ ہی سے حوصلہ فرسا اور جانگسل مزاحمت کرنا پڑی تھی اس لیے جذبۂ انتقام کے زیرِ اثر ہر محاذ پر ان کو پیچھے ڈھکیل دینے کی سامراجی اسکیم بنائی ایک ہزار سال سے زائد اہلِ اسلام ہندوستان کی مختلف قوموں میں شیر و شکر ہو کر آپس میں گھلے ملے چلے آ رہے تھے اور مسلمانوں اور یہاں کے باشندوں میں میل محبت کی فضائیں قائم تھیں اور بہت سے میدانوں میں یہاں کی سبھی قوموں نے مل جل کر انگریز سامراج کا مقابلہ کیا تھا اس لیے فرنگی مورخین نے اسی رسوائے عالم پالیسی divide & rule پھوٹ ڈالو حکومت کرو کو بروئے کار لا کر سب سے پہلے ہندوستان کی تاریخ کو اسی سامراجی نقطۂ نظر سے ترتیب دیا تاریخ ہند میں مسلمانوں کے period کو سب سے زیادہ وحشتناک اور خونچکاں پیرائے میں تحریر کیا گیا چنانچہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے سلسلہ میں جس دروغ بافی اور غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے وہ

ان کی سامراجی پالیسی کا ایک گھناؤنا حصہ ہے۔ موجودہ زمانے میں ہر تعلیم یافتہ آدمی اس تاریخی حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ عرب و ہند تعلقات ما قبل تاریخ سے چلے آرہے ہیں سکندرِ اعظم کے حملہ (۳۲۵ ق م) سے پہلے عربوں کی ہند میں آمد و رفت جاری ہے جب اسلام آیا تو اس نے عربوں کے دلوں میں ایک نیا کشش انگیز جذبہ پیدا کیا کہ ہندوستان مسلمانوں کا آبائی وطن ہے انسانیت کے مورثِ اعلیٰ حضرت آدمؑ کے آسمانی جنت سے اس ارضِ بہشتی (سراندیپ یا لنکا) میں اتارے گئے اس لیے عربوں کے سمندری بیڑے عہدِ رسالت اور خلافت سے اس کی زیارت کے لیے آنے جانے اور اسلام کے پیغام سے اس سرزمینِ امن و آئین کو آشنا کرتے رہے۔

پہلی صدی ہجری (چھٹی صدی عیسوی) میں مسلمانوں کے قافلے خشکی و تری کے راستوں سے نہ صرف اس ملک میں اترتے رہے بلکہ شروع میں ساحلی مقامات اور بعد میں اندرونِ ملک نوآبادیاں قائم کرتے ہوئے اور یہاں کے مقامی راجوں مہاراجوں کی حکومتوں کے ماتحت اس ملک کے قدیم باشندوں کے ساتھ دوش بدوش زندگی و ترقی میں حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں انگریز مورخین اور ان کے کاسہ لیس پیروکاروں نے مسلمانوں کے ابتدائی حالات کو سیاسی مصلحتوں کے پیشِ نظر اوراقِ تاریخ سے اڑا دیا اور مسلمانوں کے اولین داخلہ محمد ابن قاسم کے حملہ کو ۹۳ھ قرار دے کر اہلِ اسلام کی خونخواری کی غلط تصویر پیش کی جو ہر ایک تاریخ خواں کے دل میں نفرت کو ابھارتی اور مسلمانوں کو غلط طور پر حملہ آور ٹھہراتی ہے حالانکہ صحیح تاریخی حقائق اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری ہی سے مسلمانوں نے اس ملک کو اپنا وطن قرار دے کر بود و باش اختیار کرلی تھی اور ہر طرح کے اچھے برے حالات میں یہاں کے باشندوں کا ساتھ دیتے چلے آرہے تھے غزنوی اور غوری کے حملوں سے صدیوں پہلے نہ صرف ساحلی مقامات بلکہ ملک کے اندرونی علاقوں میں طرحِ اقامت ڈال کر

ہندوستانی بن چکے تھے جس پر ہم اپنی کتاب "ہندوستان اسلام کے سایہ میں" میں روشنی ڈال چکے ہیں۔

تاریخ اسلامی ہند کے ان ابتدائی اوراق کو حذف کر کے ہندوستان میں مسلمانوں کی مستقل اقامت اختیار کرنے کے واقعہ کو غزنوی اور غوری کے حملوں سے جوڑ دیا ہے۔ سلطان محمود غزنوی کو ایک غارت گر کے روپ میں پیش کیا ہے حالانکہ وہ ایک مہم جو، مہم پسند، حوصلہ مند سپہ سالار تھا۔ محمود نے ایک مہم جو حوصلہ مند فوجی جرنیل کی طرح ملک گیری اور اپنے دائرۂ اقتدار کی وسعت پذیری کے لیے جو مہمیں اس نے اختیار کیں ان کا اشاعتِ اسلام سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں چونکہ محمود نے سب سے پہلے ان مسلم حکمرانوں کے خلاف معرکہ آرائیوں کا میدان گرم کیا تھا جو اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے پھر اس کی حوصلہ مندی کی تکمیل کے لیے ہندوستان جیسے وسیع و عریض رقبہ کا ملک سامنے آگیا۔ محمود غزنوی کے دو سو سال بعد جب غزنی کی عنانِ سلطنت اس کے خاندان سے چھوٹ کر غوری خاندان کے ہاتھ میں آئی تو مشہور فاتح شہاب الدین غوری نے جو ایک دلاور و باحوصلہ سردار تھا اپنی مہم جوئی کے لیے اس ملک کو اپنی جولان گاہ بنایا اس کو تاریخ ہند میں حملہ آور کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے حالانکہ غوری مہاراجہ قنوج کی دعوت پر پرتھوی راج کے مقابلہ میں اس کا حمایتی بن کر وارد ہوا تھا اس نے یہاں کے راجاؤں کی متحدہ طاقت سے ٹکرا کر ابتداءً شکست کھائی پھر بعد میں فتحیاب ہو کر افغان حکومت کی بنیاد ڈالی یہ مہم جوئی، مہم پسندی پچھلے زمانے کے حوصلہ مند سرداروں کا عام مزاج تھا جیسے موجودہ زمانے میں کوہ پیمائی اور دیگر میدانوں میں مقابلہ آرائی باکسنگ کی گرم بازاری ہے۔ شہرت و نام آوری کے حصول کے لیے آج کل انتخابی مہموں کی ہنگامہ آرائیوں اور قتل و خوں ریزیوں کا ہے وہی اس زمانے میں ملک گیری کے لیے تھا۔

دوسری قوموں پر چڑھائی کرنا عام رعایا کا خون خرابہ کرنا غریب عوام کے جان و مال سے کھیلنا تاریخ کے سربراہوں کا دلچسپ و محبوب مشغلہ رہا ہے اس علم و دانش، حریت و جمہوریت کے دور کی انتخابی مہموں میں جو باہمی آویزش اور ایک فریق کے حامیوں کی دوسرے فریق کی حمایتوں کے ساتھ جو کشمکش برپا ہوتی ہے وہ بعض اوقات خون خرابہ تک لے جاتی ہے تو اس دور ظلمت و جہالت میں جبکہ انسان اتنا مہذب نہیں ہو سکا تھا فتوحات کا یہ جذبہ سفاکی و خونخواری کی حد تک اگر پہنچ گیا تو اس میں تعجب کیا ہے فطرتِ انسانی وہی ہے لیکن وہ فتنہ اب ذرا سانچے میں ڈھل کر سامنے آتا ہے اس خونخوار جذبہ کی تسکین حاصل کرنے میں کسی قوم کی تخصیص نہیں بلکہ یہ عالمگیر جذبۂ غرور و برتری کا ایک نشہ تھا جو شہرت پرست سرداروں کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا کیا خود ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے یہاں کے راجوں مہاراجوں کے درمیان لڑائیوں کے میدان گرم نہیں رہے۔

تیمور لنگ جو سمرقند سے آندھی بن کر اٹھا اور اس زمانہ کے بادشاہوں کو چیلنج دیتا ہوا بادل بن کر گرجا اور قہر الٰہی بن کر ایشیا و یورپ کے علاقوں میں برسا اپنے زور و قہر مانی اور ظلم و ستم رانی کے ہاتھوں وہ مظالم ڈھائے کہ انسانوں کے کشتوں کے پشتے لگا دئے۔ مقتولوں کی کھوپڑیوں سے فتح کے مینار قائم کیے بڑے بڑے اسلامی ملکوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی یہاں تک کہ اس ظالم و جابر انسان نے خلیفۂ اسلام بایزید عثمانی کو جو تمام رعایا اور مسلمانوں کی نظر میں قابل احترام ہستی تھی گرفتار کر کے درندوں کی طرح ایک لوہے کے پنجرہ میں قید کر کے اسلام کی توہین کی اور خود کو مدعی اسلام کہتا تھا اور موقع پر اسلام کا نام لیتا رہا اس کی یہ ساری سفاکیاں اور ساری خونخواریاں کیا ہم مذہب بادشاہوں کے خلاف نہ تھیں؟

بہر حال اقتدار پرستی و جاہ طلبی کی چنگاری جن جن کے دل کی انگیٹھی میں

سلگی ہے اس نے ہر قوم کے طاقت پرست افراد کیا مسلمان کیا ہندو ہر ایک کے سینوں میں خونخواری و خون آشامی کے شعلوں کو بھڑکایا ہے۔ تاریخ عالم کے صفحات ان خونی سرخیوں سے رنگے ہوئے ہیں۔

برطانوی اور سامراجی مورخین نے مسلم افغان و مغل پیریڈ کو جس طرح ترتیب دیا ہے اس کے اندر غوری کے بعد تمام گذشتہ جنگوں کو ہندو مسلم لڑائیوں کے روپ میں پیش کیا ہے جن کے اندر زیادہ تر مسلمانوں (جو حملہ آور یا غارت گر کی حیثیت سے دکھائے گئے ہیں) کے مقابلہ میں برادرانِ وطن کو شکست کھاتے یا ہتھیار ڈالتے دکھایا گیا ہے جس سے عام ذہن میں ایک غلط نقش قائم ہوتا ہے کہ اتنے بڑے ملک میں جو ہمیشہ سے بہادروں، سورماؤں کا ملک رہا ہے کوئی بھی ایسا دلاور سپہ سالار یا بہادر لوگ موجود نہ تھے جو آنے والے سیلاب کو روک سکتے یا ان حملہ آوروں کو ڈھکیل سکتے تاریخ کی اس غلط آمیزی سے یہاں کے باشندوں کے دامنِ مردانگی پر بزدلی و نامردی کا داغ لگتا اور برادرانِ وطن کے دلوں میں کمتری کا غلط احساس پیدا کرتا ہے حالانکہ حقیقت واقعی یہ ہے کہ نہ ہر حملہ میں مسلمان فتحیاب ہوئے اور نہ ہر موقع پہ باشندگانِ ہند نے ہتھیار ڈالے نہ یہ جنگیں اور لڑائیاں ہندو مسلم بنیادوں پر ہوئیں چونکہ اکثر جنگوں میں ہندو مسلم دونوں برابر کے شریک رہے خود تاریخ سے محمود غزنوی کی فوجوں میں ہندوؤں کی پلٹنوں کا ثبوت ملتا ہے

یہ من گھڑت تاریخ ہمارے ملک کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے اس تاریخ کا سب سے افسوس ناک اور تعجب خیز پہلو یہ ہے کہ جنگِ آزادی کی تحریک جس کے اندر ہندو مسلم، سکھ عیسائی سبھی قوموں نے کندھے سے کندھا ملاکر حصہ لیا اور جن کا خون بہہ کر اس سرزمین پر ایک ہو گیا تھا آزادی کی یہ تاریخ جو ملکی مصنفوں کی تحریر کردہ ہے اس کے اندر دانستہ یا نادانستہ طور پر فرقہ پرستی کو شامل کیا گیا ہے اور جگہ جگہ فرقہ پرستی کے جراثیم دیکھے جا سکتے ہیں۔

زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ تاریخ بھی سامراجی نقطۂ نظر ہندو مسلم تفریق
کی بنیاد پر لکھی گئی ہے چنانچہ اس سلسلہ تاریخ کی سب سے حیرت خیز کڑی یہ
ہے کہ ہماری قومی جماعت (کانگریس) کی تاریخ نگاری میں بھی اس سامراجی نظریہ
کا عمل دخل صاف نظر آتا ہے اس کے سرسری مطالعہ سے ہر خالی الذہن آدمی
اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ آزادئ ہند کی تحریک کے بانی مبانی صرف برادرانِ وطن
ہیں جنھوں نے اس تحریک کو مرحلۂ آغاز سے منزلِ انجام تک پہنچایا تحریک کے
جملہ مراحل قید و بند، گرفتاری و قربانی سے کامیابی و کامرانی تک پہنچانے میں
زیادہ تر انہی کا حصہ ہے اس محاذ جنگ کے تمام جرنیل اور کرنیل سپہ سالار اور
زیادہ تر سپاہی ہمارے وطنی بھائی ہیں اتفاق سے کہیں کوئی عہدیدار یا قائد
و لیڈر مسلمان نظر آجاتا ہے ورنہ اکثر و بیشتر سپاہی و چپراسی کے لباس میں مسلمانوں
کا نام دکھائی دیتا ہے حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے انگریز سامراج
کے ہندوستان میں داخل ہوتے ہی شروع ہی سے سامراج دشمن تحریکات
جاری کیں اور بیش از بیش قربانیاں دیں لیکن وہ قربانیاں ان مسلمان مجاہدوں
اور شہیدوں کے ساتھ زیر زمین دفن ہوگئیں کیونکہ ہر ناکام تحریک دنیا میں
بغاوت سے موسوم کی جاتی رہی ہے فرنگی سامراج اپنی جنگی صلاحیت اور حربی
قابلیت سے یہاں فتح یاب نہیں ہوسکا وہ اپنی شاطرانہ پالیسی اور یہاں کی قوموں
کو باہم دست و گریباں کرادینے کی ڈپلومیسی سے اس ملک پر ناجائز متصرف و
قابض ہوگیا چنانچہ سب سے پہلے بنگال کے مسلم علماء نے اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ
یعنی ساری زمین خدا کی ہے کا قرآنی آیت کا نعرہ دے کر زمین داروں کے
خلاف فرائضی تحریک جاری کی تھی جس نے صوبہ میں زبردست ہل چل پیدا
کردی تھی اس اہم و زبردست تحریک کا ذکر تاریخ آزادی کے حاشیہ تک میں
نہیں ملتا اور امام جہاد شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندی کے جہادِ
آزادی کا کوئی تفصیلی باب تاریخ آزادی کے صفحات میں نہیں ملتا۔ مردِ انقلاب

مولانا عبید اللہ سندھی، مجاہدِ حریت مولانا برکت اللہ بھوپالی، شہید آزادی مولانا محمد میاں وغیرہم کا جنھوں نے اپنی مقدس و پاکیزہ زندگیوں کو ملک وملت کی آزادی کے لیے وقف کر دیا۔ افسوس ہے کہ ان انقلابی مسلم زعما و قائدین اور مسلم عوام کی جاں نثارانہ قربانیوں سے (جو اپنی نفری قوت اور تعداد کے لحاظ سے برادرانِ وطن سے کئی گنا بڑھی ہوئی ہے) تاریخ آزادئ ہند خاموش ہے۔ اس امر سے انکار نہیں کیا جاتا کہ مسلمانوں کے ایک مخصوص تعلیم یافتہ طبقہ کو چھوڑ کر جنھوں نے سامراج کی غلامی کو اپنے لیے ترقیوں اور مادی کامیابیوں کے لیے زینہ سمجھا پوری ملتِ اسلامیہ کیا عوام کیا خواص انگریزی حکومت کی ابتدا ہی سے مخالف اور ہر محاذ پر ان کے خلاف معرکہ آرا رہے ہزارہا مسلم خاندانوں نے راہِ حریت میں شہید ہو کر جان و مال، آل و اولاد، جاگیر و جائداد کو تباہ و برباد کر دیا۔

اب جبکہ ماضی کی تاریخ نے ورق الٹ دیا ہے ضروری ہے کہ ہم اپنے ملک کی صبحِ مستقبل کے لیے عہدِ ماضی کی روشنیوں سے فائدہ اٹھائیں۔

ملک و قوم کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ وہ اپنے آبا و اجداد اور اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف ہو اور اغیار کی تواریخ کو حرزِ جاں بناتے ہوئے اس کو فخر و امتیاز کا سرمایہ قرار دے۔

ریاست بھوپال ہندوستانی ریاستوں میں ایک نوخیز ریاست ہے جو اٹھارھویں صدی ۱۷۰۹ء کے آغاز میں صفحۂ تاریخ پر ابھری اور بیسویں صدی کے نصفِ اول ۱۹۴۹ء میں اپنے انفرادی وجود کو متحدہ ہند کے اجتماعی وجود میں ضم کر دیا اس ریاست نے انیسویں صدی کے آغاز میں علم و ادب کی ترقی کی طرف قدم بڑھایا اور بیسویں صدی میں مطلعِ ہند پر اخترِ تاباں بن کر چمکی اس دو ڈھائی صدی میں بڑے بڑے باکمال اہلِ علم و فضل ارباب شعر و ادب اس خطۂ پاک سے اٹھے اور اپنی علمی و ادبی روشنیوں

سے تاریخ بھوپال کو درخشاں بناتے رہے اسی طرح بے شمار ارباب نظم وسیاست یہاں پیدا ہوئے اور انھوں نے یہاں کے ملکی وسیاسی افق کو روشن کیا نمود و شہرت کے میدانوں کو پامال کیا اور ملک وملت کی راہ میں شہادت کی قربان گاہ پر پیش کیا لیکن خود کو اس طرح پردۂ گمنامی میں روپوش کیا کہ ان کے کاموں کا جائزہ لینا تو کیا کاموں کی فہرست مرتب کرنا دشوار ہو رہا ہے آج بھوپال کے اصلی معماروں سے فرزندگانِ بھوپال بیگانہ و نابلد ہیں کہ ان کے تذکار و یاد آوری کے لیے بیرونی حوالہ جات درکار ہو رہے ہیں ہم میں سے آج اکثر لوگ مولوی جمال الدین مدار المہام، مولوی نظام الدین، دیوان بجے رام، دیوان خوش وقت رائے، دیوان چھوٹے خاں اور نواب صدیق الحسن خاں کے نام سے بھی ناواقف اور ان کی تعمیری وعلمی وانتظامی اور سیاسی خدمات سے یکسر ناآشنا ہیں بھوپال کی علمی وادبی سرگرمیاں تاریخ ہند کے صفحات پر گاہے ماہے نظر آجاتی ہیں لیکن یہاں کی سیاسی کارروائیاں پردۂ عدم میں روپوش ہو کر لوحِ حافظہ سے بھی اتر چکی ہیں۔

خوش قسمتی سے ماضی قریب کے اندر ریاست بھوپال میں ایک ایسی بین الاقوامی شخصیت نے جنم لیا جس کی جان فروشانہ ملکی وملی قربانیاں آزادیٔ ہند کے لیے سیاسی خدمات تاریخ ہند کا سنہرا باب ہے لیکن اہلِ ملک کی محسن فراموشی وناقدری نے ان کی گرامی قدر یاد کو بھی صفحۂ دماغ سے محو کر دیا ہے۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی کی ہندوستان کی آزادی وحریت کے لیے یہ مسلسل سرگرمیاں اور بالآخر ملک وملت کی راہ میں جلاوطنی کے عالم میں وطن سے کوسوں دور (کیلو فورنیا) داعیٔ اجل کو لبیک کہنا ایسی عظیم الشان قربانی اور دلدوز کہانی ہے جس کی تاریخ میں بہت کم نظیر ومثال ملتی ہے۔ ان گم شدہ واقعات کو منظرِ عام پر لانے کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جا رہی تھی لیکن برطانوی

حکومت کی قہرمان پالیسی نے ان سیاسی کوائف وحالات کو قعرِ گمنامی میں ڈالنے پر مجبور کردیا تھا

راقم الحروف جبکہ تعلیمی دور سے گزر کر ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء میں مولانا عبیداللہ سندھی کی صحبت بابرکت میں حضرت شیخ الہند کی تحریک (ریشمی رومال) اور مولانا موصوف کے انقلابی کارناموں سے واقفیت حاصل کر رہا تھا اس وقت مولانا کی شخصیت اور ان کے حریت پرور کارناموں سے کان آشنا ہوئے کابل اور برلن کے سیاسی واقعات سے یک گونہ روشناسی ہوئی لیکن مولانا مرحوم کے عمومی حالات سیاسی کوائف وواقعات دائرۂ معلومات سے باہر رہے۔

ملک کے آزاد ہونے کے بعد سب سے پہلے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے مولانا برکت اللہ بھوپالی کے کارناموں کی عظمت کو محسوس فرمایا اور وزارت تعلیمات کی طرف سے شائع ہونے والی کتابوں میں ان کے سوانح کو شامل فرمایا اس سلسلہ میں قدیم بھوپال کے بابائے سیاست مولانا سعیداللہ خاں رزمی کے ذریعہ اس کی تدوین وترتیب کا پیغام راقم الحروف کو ملا پھر دوبارہ اس کی یاددہانی مولانا طرزی مشرقی سے کرائی گئی بہرحال اس حقیر ہیچ مداں نے اس فرض کی ادائگی کو اپنے لیے قابل افتخار اور اعزاز سمجھا اور اس کے ضروری نوٹ تیار کرلیے اور مولانا آزاد مرحوم کی ہدایات کا منتظر رہا۔
جب انجمن ترقی اردو ہند کے سالانہ اجلاس ۱۹۵۷ء میں دہلی حاضری ہوئی اور مولانا مرحوم سے ملاقات کے لیے سعی کی گئی لیکن ظاہر شاہ والی افغانستان کی میزبانی کے فرائض کی انجام دہی کی وجہ سے شرفِ ملاقات کا موقع دستیاب نہ ہوسکا مگر اس کتابچہ کے لیے خصوصی ہدایات دیئے جانے کی خوشخبری ملی جس سے دل کے اندر عرصۂ دراز کی خوابیدہ تمنائیں جاگ اٹھیں اور ناشگفتہ آرزوؤں کی کلیاں چٹکنے لگیں اور اس بات کی توقع ہوگئی کہ ایک دیرینہ خواب

شرمندۂ تعبیر ہو جائے گا مگر قضا و قدر کی جانب سے کچھ اور فیصلہ ہو چکا تھا انجمن مذکور کے عام اجلاس میں مولانا آزاد کی زیارت آخری زیارت اور اس خطیب وقت کی اردو کے لیے آخری تقریر تھی جس کے بعد حریّت و آزادی، علم و ادب کا یہ آفتاب عالم تاب غروب ہو گیا جس عظیم شخصیت نے نصف صدی تک اپنی علمی و ادبی و سیاسی شعاعوں سے ظلمت کدۂ ہند کو منور کر رکھا تھا جس کی رعد آسا خطابت اور زلزلہ افگن تحریر و انشا نے پورے ملک میں ایک غلغلہ برپا کر رکھا تھا اس حادثۂ ناگہانی سے راقم الحروف کے حوصلے افسردہ اور دلولے پژمردہ ہو گئے اور وہ ابتدائی نوٹ جوں کے توں پڑے رہے اس اثنا میں ہمارے مخلص دوست ایم عرفان مرحوم نے اس موضوع کو اپنایا اور اپنی عادت کے مطابق اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا ان کی یہ کتاب نقشِ اول کی حیثیت سے پہلی بار منظر عام پر آئی لیکن اس انقلابی سوانح کے بعض گوشہ سامنے آئے اور بہت سے تشنۂ تکمیل رہے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے بقول خود "دو بار پورے عرصۂ گیتی کا چکر لگایا اور دنیا کے بڑے بڑے مراکز میں رہ کر اپنے مشن کو جاری رکھا" اور ہزارہا صعوبتوں، دشواریوں کے باوجود ان سنگلاخ میدانوں کو طے کرتے رہے اور بالآخر اسی راہ میں جان دی۔

تاریخ ہند کے سلسلہ میں ایسا غیر معمولی کارنامہ ہے جو ہر آئینہ بار بار یاددہانی کا مستحق ہے۔

اب جبکہ ہم آزاد فضا حریت و جمہوریت کی تازہ آب و ہوا میں سانس لے رہے ہیں شمع آزادی کے اس پروانے کی زندگی اور اس سلسلہ میں ان کی جاں سوز مساعی پر پردہ پڑا رہنا سخت ناحق کوشی و ناسپاسی ہے اس لیے اس کتابچہ کو اہل ملک کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کی جا رہی ہے اس کتاب کی تالیف میں جن مرحوم بزرگوں سے استفادہ کا موقع ملا ان میں حضرت مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حسین احمد مدنی، علامہ محوی

صدیقی، محترم ملا رموزی، میجر عبد السلام بھوپالی وغیرہم ہیں لیکن خصوصیت سے رفیق وکرم فرما محب ومخلص جو بندہ سے مخلصانہ ارادت رکھتے ہیں وہ منشی رفیق رفیق احمد بھوپالی ہیں بھائی رفیق مولانا برکت اللہ کے ساتھ کابل، تاشقند اور ماسکو میں حق خدمت ورفاقت ادا کر چکے ہیں وہ مولانا مرحوم کے عمومی احوال اور سیاسی کارروائیوں کے ۱۹۲۰ء کی پہلی ہجرت میں شامل ہو کر مولانا مرحوم کی معیت میں قیمتی اوقات گزار چکے ہیں موصوف سے اس سلسلہ میں کافی مدد ملی ہے اب جبکہ "تاریخ بزرگان بھوپال" کی تدوین وترتیب کا کام اس حقیر کے ہاتھوں شرمندۂ تکمیل ہوا چاہتا ہے جس کے اندر ڈھائی سو سالہ بھوپال کی علمی و روحانی تاریخ کو محنت ومشقت ودیدہ ریزی سے مرتب کیا گیا ہے ریاست بھوپال کے وہ روحانی معمار جنھوں نے اپنی علمی وعملی خدمات وتعمیری مساعی سے ریاست کا نام علمی وروحانی افق پر روشن کیا اور جن کی پرخلوص کوششوں نے ریاست کے نام کو ہند وبیرونِ ہند میں چمکایا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگانِ دین اور اربابِ یقین کی اجمالی تاریخ کو اس کتاب کا مقدمہ بنایا جائے اور اختصار کے ساتھ اس پر بھی روشنی ڈال دی جائے کہ ریاست بھوپال کی تشکیل کس ماحول میں ہوئی اور اس کو اپنے قیام وبقا اور ارتقا کے سلسلہ میں کن کن مرحلوں سے گزرنا پڑا اس طرح "تاریخ بزرگانِ بھوپال" کے تفصیلی حالات کا ایک اجمالی خاکہ آنکھوں کے سامنے آجائے۔ سابقہ ریاست کی ان اہم فراموش کردہ شخصیات کو اس لیے منظر عام پر لایا جارہا ہے کہ ہماری نئی نسل اور نئی پود اپنے آباؤ اجداد کے احوال سے واقف ہو کر عمدہ سبق حاصل کر سکیں اور دورِ ماضی کے آئینہ میں اپنے عہد مستقبل کو سنوار سکیں۔

مشرق ومغرب کا تقابلی مطالعہ

ریاست بھوپال کی ابتدائی تشکیل کا زمانہ وہی ہے جبکہ ایک طرف مغلیہ سلطنت زوال پذیر ہورہی تھی اور دوسری طرف مغربی سامراج اپنی عیارانہ و مکّارانہ سازشوں کا جال پورے ایشیا میں بچھا رہا تھا اس لیے سترھویں صدی ایشیا و یورپ کی باہمی آویزش کے پرخطر مگر زبردست اہمیت کا حامل زمانہ رہا ہے۔ یورپ و ایشیا کی اس آویزش کے پیچھے صدیوں کے کون سے محرکات وعوامل کارفرما تھے۔ ضرورت ہے کہ ان کا تاریخی جائزہ لیا جائے تاکہ اس کے آئینہ میں اصل حقیقت کی جھلکیاں نگاہوں میں آسکیں۔

راقم الحروف کے سامنے تاریخ عالم کے مطالعہ سے صفحہ ذہن سے جو روشن نقطہ یا دلآویز نقش ابھرا ہے اس کو تمثیلی پیرایہ میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے کہ دنیا کے پانچوں برّاعظموں میں برّاعظم ایشیا کی حیثیت قلب یا دل کی ہے۔ تاریخی مطالعہ سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ یہ کہ دنیا کے پانچوں برّاعظموں کو ایک انسانی شکل تصور کیا جائے تو اس کا دماغ یورپ اور دل ایشیا اور باقی برّاعظم دھڑ اور ہاتھ پاؤں کی صورت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ انسانی دماغ افکار و خیالات کا عظیم مخزن ہے اور دل وجدانی اور اس کے خواطر و ارادت کا منبع سرچشمہ ہے۔ امریکہ و آسٹریلیا کی پرانی قومیں (جو ان برّاعظموں کے اصل باشندے ہیں)، ان کی حیثیت نامعلوم زمانہ سے انسانی ڈھانچہ میں دھڑ اور ہاتھ پاؤں سے زیادہ نہیں رہی۔ اس لیے یورپ (یونان و روما سے) افکار و خیالات نے پھیل کر فلسفہ و قانون کی شکل

اختیار کی۔ لیکن ایشیا کی سرزمین چونکہ روشن دل کی حیثیت سے صفحۂ عالم میں ابھری ہے اس لیے تمام مذاہب وملل اور سارے دھرموں کے سوتے یہیں سے پھوٹے اور پھر جملہ براعظموں میں اس کی لہریں پھیلیں اور آگے بڑھ کر ہر ملک میں اپنے معتقدین کے حلقے پیدا کیے۔ فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا کے اندر سامی قوموں نے جس خطۂ ایشیا کو اپنی سکونت گاہ بنایا وہ خطہ اپنے موسمی اعتدال، ماحول کی سرسبزی وشادابی حیات انسانی کے ساتھ سازگاری وخوشگواری اونچے نیچے پہاڑوں، سدا بہار جنگلوں اور لہلہاتی ہوئی زمینوں کی وجہ سے خدا کے برگزیدہ بندوں، نبیوں، رسولوں، رشیوں، منیوں کی دعوت کے مرکز بنے اس لیے یہ مقامات انسانیت کے روحانی نشو ونما اور ارتقا کے لیے بمنزلہ دل کے ہو گئے۔ اور نورانی واردات وتجربات، روحانی عقائد وخیالات کی شعاعیں یہیں سے پھوٹیں، اور پھر چار دانگ عالم میں اس کی کرنیں پھیل گئیں۔ اس لیے یہ خطہ مذاہبِ عالم کا گہوارہ بنا۔

لیکن براعظم یورپ اپنی غیر معمولی موسمی تغیریات، آسمانی وزمینی حوادث وآفات اور عظیم سمندروں کے درمیان گھرے ہونے کی وجہ سے انسان کے لیے سخت جانی اور طوفانی زندگی گزارنے کی پرخطر جولان گاہ بن گیا۔ اس لیے آریائی اقوام کو شخصی واجتماعی زندگی کے تحفظ کے لیے دشوار گزار مرحلوں اور خطرناک منزلوں سے گزرنا پڑا۔ انسانی دماغ نے اس راہ میں جو جدوجہد محنت وکوشش کی اس کے نقوش مغربی افکار وخیالات میں ثبت ہو گئے۔ اس لیے مغرب میں فلسفہ وسائنس نے جنم لیا اور اس نے انسان کی حیات مادی کی حقیقت پر زور دیا۔ اس لیے اس سرزمین میں حکماء، فلاسفہ اور مفکرین کی پیداوار زیادہ ہوئی۔ اور اس کے افکار وخیالات کی گونج سارے عالم میں سنائی دیے جانے لگی۔ رہی منگولین یا تورانی اقوام کا مستقر یا ٹھکانہ تو وہ ایسا علاقہ تھا کہ بلند وبالا کوہستانوں، پرخطر دشوار گزار میدانوں اور

چوڑے چکلے سبزہ زاروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس لیے ان کو سرو سامان حیات
مہیا کرنے کے لیے بہت زیادہ ہاتھ پاؤں مارنا پڑے اور اپنی زندگی کو قائم
و برقرار رکھنے اور قافلہ حیات کو آگے بڑھانے کے لیے دست و بازو کو حرکت
میں لانا پڑا اس لیے وہ اپنے مزاج کی درشتی و سختی اور ماحول کی سنگینی
کی بنا پر اطرافِ عالم میں دھاوے بولتے رہے عہد تاریخ کی صبح ہونے سے پہلے
ان کی یلغاروں اور ان کے حملوں سے سلسلہ شروع ہو کر اب تک جاری ہے
تاریخ کے نامعلوم دور سے جب دنیا کی قوموں میں حصول معاش کے لیے
آوارہ گردی کی صورت میں باہمی ربط وارتباط اور ایک دوسرے سے اختلاط
کا دروازہ کھلا تو بہ موروثی خصائص بکھرنے لگے اور منفرد مزاج کے بجائے مرکب
مزاج عقلی کا ظہور ہوا۔ دل اور دماغ اور اعضاء و جوارح کی اس جنگ عظیم میں الحرب
سجال کے مصداق کبھی دل کو فتحمندی اور کبھی دماغ کو کامیابی ہوتی اور کبھی وحشت و
درندگی کے ہاتھوں دل و دماغ دونوں کو شکست ہو جاتی۔

تاریخ انسانیت اُن خونیں اوراق روح فرسا و جاں گسل اور خوں ریز
واقعات سے رنگین ہے۔ حق طلبی و خدا پرستی، مخلوق خدا کے ساتھ رحمدلی و ہمدردی
مروت و شرافت اور شائستگی اور جملہ اخلاقی محاسن و کمالات جو انسانیت کے جوہر ہیں۔
یہی روحانیت و دین و مذہب کے اصل الاصول ہیں ماقبل تاریخ سے عصر حاضر تک
کے احوال و واقعات کے مطالعہ سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ان محاسن و
کمالات کا مرکز "ایشیا" رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں خود پرستی و خود غرضی، خود بینی
و خود سری، تفوق و برتری بیجا تسلط و غلبہ اور اقتدار پرستی ان خصوصی احساسات
و جذبات نے مغرب کی سرزمین میں بال و پر نکالے اور اس جارحانہ جذبات و احساسات
کی بنا پر اپنی جارحانہ حملوں کا مشرق کو نشانہ بنایا۔

مشرق و مغرب کی تاریخی کشمکش

مشرق و مغرب کی کشمکش کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنے خود مشرق و مغرب پرانے ہیں زمانۂ ماقبل تاریخ سکندرِ اعظم کے حملہ ۳۵۰ ق م کے واقعہ کو چھوڑ کر عہدِ ماضی کی تاریخ کے جھروکے سے جب ہم پچھلی صدیوں کی طرف جھانکتے اور نظر ڈالتے ہیں تو دو عظیم سلطنتیں برّاعظم ایشیا کے دو کونوں پر اپنے اقتدار و حکومت کا پرچم لہراتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ایک باز نطینی سلطنت جس کا مرکز ایلیا (بیت المقدس یا حمص)، ملک شام میں واقع تھا دوسری ایرانی شہنشاہیت جس کا پایۂ تخت مدائن ملک عراق میں دریائے دجلہ کے کنارے پر تھا یہ دونوں شہنشاہتیں اس وقت کی آدھی دنیا کو اپنی مضبوط و محکم بازؤں میں سمیٹے ہوئے اپنی رعایا و عوام کو اقتدار کے شکنجے میں کس کر ان کی محنتوں کے خونِ گرم سے آرام و راحت کے شبستانوں کو سجائے ہوئے عیش و عشرت کے جھولے میں جھول رہی تھیں۔ شہنشاہ اور اس کے مخصوص حواری امراء و رؤسا کے لیے یہ دنیا جنت عیش اور مصیبت زدہ عام لوگوں کاشتکاروں، مزدوروں اور ملازموں کے لیے مصیبتوں کی جہنم بنی ہوئی تھی کبھی کوئی عادل و انصاف پسند بادشاہ تختِ سلطنت پر بیٹھ جاتا تو عوام کو راحت و آرام کے ساتھ سانس لینے کا زریں موقع مل جاتا ورنہ اکثریت کی قسمت میں آلام و مصائب کے تلخ اور کڑوے پھلوں کے سوا اور کچھ نہ تھا ملک و حکومت کی اندرونی اصلاحات و ترقیات سے زیادہ ترحکمراں کی للچائی ہوئی نظریں بیرونی سلطنتوں پر پڑتی رہتی تھیں اور توسیع و ملک گیری کے لیے نت نئے

بہانے تراشے جاتے اور معرکہ آرائیوں کا میدان گرم رہتا تھا۔ چنانچہ روم و ایران کا ایک تاریخی معرکہ ۶۱۴ء میں پیش آیا جس کے اندر شہنشاہِ ایران کیخسرو ثانی (خسرو پرویز) نے ہرکلیوس (ہرقل) شہنشاہِ روم کو ایسی زبردست شکست دی کہ شام و مصر اور ایشیائے کوچک کے سارے علاقے بازنطینی حکومت کے ہاتھ سے نکل گئے اور قیصرِ روم (ہرقل) کو قسطنطنیہ (یورپ) میں پناہ گزیں ہونے پر مجبور ہونا پڑا لیکن قیصر نے ہمت نہ ہاری اور ان حوصلہ شکن حالات میں بھی مفتوحہ علاقوں کی واپسی کے لیے فوجی تیاریوں میں لگ گیا اور نو سال نہ ہونے پائے تھے کہ ۶۲۴ء میں اس نے ایرانیوں سے اپنا معاملہ چکالیا بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوکر از سرِ نو زمامِ اقتدار ہاتھ میں لے لی ایرانیوں اور رومیوں کے ان خوفناک اور خونی مظاہر اور فتح و کامرانی کے دل خوش کن و شاداب مناظر سے ابھی آنکھیں سیراب نہ ہونے پائی تھیں کہ یکایک ایک غیر معروف خشک چٹیل بیابان اور تپتے ہوئے ریگستان سے ایک غیر مہذب غیر متمدن اور پسماندہ قوم تاریخ کے افق پر نمودار ہوکر ایک حیرت ناک کرشمہ سے نگاہوں میں چکا چوند پیدا کر دیتی ہے کہ یہی دنیا کی دو عظیم سلطنتیں ایک صحرانشیں قوم سے ٹکراتی ہیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں اور غبارِ راہ بن کر اڑ جاتی ہیں ایرانی شہنشاہیت تو پردۂ تاریخ سے اس طرح غائب ہوئی کہ پھر کبھی افق پر نمودار نہ ہو سکی لیکن بازنطینی سلطنت نے اپنا مرکز ایشیا سے اٹھا کر (یورپ) قسطنطنیہ کی طرف منتقل کر دیا پھر یہ قسطنطنیہ صدیوں تک رومی شہنشاہیت کا مضبوط و مستحکم قلعہ بنا رہا۔

یہ پسماندہ قوم صحرائے عرب کے بکری چرانے والے تھے جنھوں نے ایک نئے مذہب کے فیض سے زندگی کا جوش و ولولہ لے کر گلہ بانی سے نکل کر جہانبانی کے میدان میں قدم رکھا اور ایک صدی نہ گزرنے پائی تھی کہ برّاعظم ایشیا و افریقہ کے وسیع علاقوں پر اپنی سلطنت کے بازوؤں کو پھیلا دیا اور تھوڑے ہی عرصہ

ہیں قوموں کی طرف سے غلط فہمیوں کے مطلع کے صاف ہونے کے بعد اپنی صداقت پسندی الوالعزمی و فراخ حوصلگی، فیاضی و رواداری، اور مخلوقِ خدا کی خدمت گزاری کی خوبیوں کو دیکھ کر ان قوموں نے ان کے لیے اپنی آغوشِ محبت کھول دی۔

خلافت راشدہ سنہ ۱۳ھ تا سنہ ۳۰ھ اور خلافت امویہ سنہ ۳۱ھ تا سنہ ۱۳۳ھ کے بعد جب خلافت عباسیہ عروس البلاد (بغداد) میں تختِ اقتدار پر جلوہ افروز ہوتی ہے تو اس کے جلو میں ایشیا کی بڑی بڑی قوموں کے قافلے علمی و فنی ترقیاں کرتے اور میدانِ مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں عربوں کے ساتھ ایرانی، ترک و مغل اور افریقہ کے باکمال افراد اس عظیم سلطنت کے دست و بازو بنے ہوئے ایک ایسی بین الاقوامی international بلکہ بین الانسانی و آفاقی universal مساوات انسانی کی بنیادوں پر تہذیب کی تعمیر و تشکیل میں سرگرمی و تندہی اور جاں فشانی کے ساتھ حصہ لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جہاں کوئی ذات پات نہیں چھوت چھات نہیں اس لیے کہ اسلامی معاشرہ مختلف قوموں اور مختلف طبقوں کے ساتھ اپنی حدود میں پوری پوری رواداری و فیاضی کی آمیزش سے معرضِ وجود میں آتا ہے اس لیے انسانیت کا قافلہ اسلام کے زیر سایہ ایک ہزار سال سنہ ۷۰۰ء تا ۱۷۰۰ء علمی و عملی ترقیات کے میدانوں میں راستہ کے نشیب و فراز سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ بازنطینی سلطنت کا مرکز ایلیا اور ایرانی شہنشاہیت کا پایۂ تخت مدائن دونوں مسلمانوں کے پاؤں تلے آگئے اور قیصریت و کسریت جو ملوکیت و شہنشاہیت کے عنوان تھے اسلامی تعلیمات کے انقلابی دھماکے سے یہ عظیم محل زمین پر ڈھ گئے اس لیے کہ اسلام خودسر و مغرور اور اقتدار پرست شہنشاہیت کو مٹانے کے لیے اور خدا کی بادشاہیت خلافت قائم کرنے کے لیے آیا تھا تھوڑا عرصہ (کچھ صدیاں) گزر جانے کے بعد سینٹ پال

کی بناوٹی عیسائیت اور اس کے جھوٹے مذہبی پیشواؤں، پوپوں و پادریوں نے یسوع مسیح (علیہ السلام) کی اخلاقی تعلیمات کے پرخچے اڑا دئے اور عیسائیت کو جارحانہ پیرایہ عطا کر کے صلیبی جنگوں کے ذریعہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ایک ایسا خونی دریا بہایا جس نے دجلہ و فرات کی روانی کو مات کر دیا اور ایک صدی سے زائد اہل مذہب اپنے مذہب کو بدنام کرتے میں مصروف رہے یہ صلیبی جنگیں ۳۵۵ھ تا ۴۶۲ھ خلافتِ اسلامیہ کے کمزور ہو جانے پر مشرق میں دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے لیے مغرب نے چھیڑی تھیں جن پر مذہب کا دبیز پردہ ڈال دیا گیا تھا اس تاریخی حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ دنیا میں سیاست نے اکثر مذہب کا چولہ بدل کر مذہب کے نام پر انسانوں کے خون کی ندیاں بہائی ہیں ہمارے زمانے میں مذہب کی جگہ جدید نظاموں (سوشلزم، کمیونزم، ڈیموکریسی) نے لے لی ہے یہ وہی فتنۂ کہن ہے جس نے نئے سانچے میں ڈھل کر انسانیت کو حیران و پریشان کر رکھا ہے بہر حال اس جارحانہ عیسائیت نے صلیبی جنگوں کے ذریعہ اس آفاقی تہذیب کو چیلنج کیا تھا اور پورا یورپ برسرِ اقتدار پاپائیت کے بھڑکانے پر اس جمے جمائے نقشہ کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن تمدنِ اسلامی اس دریائے خون میں نہا کر اور زیادہ قوی و مضبوط ہو کر نکل آیا۔ مشرق و مغرب کی اس مہیب و خوں ریز کشمکش میں مسلمانوں (سلطان صلاح الدین ایوبی اور ان کے ساتھیوں) کا کردار مسیحی تعلیمات کے مطابق معافی و فیاضی کا رہا مگر عیسائیوں نے پاپائیت کی جھوٹی قیادت کے زیر اثر ظالمانہ اور منتقمانہ رویہ اختیار کر کے شکست کھائی اور پھر اپنے پرانے مرکز قسطنطنیہ لوٹ کر اپنے اپنے ملکوں اور حکومتوں کی کمزوریوں کو دور کرنے اور تازہ زخموں کو مندمل کرنے میں لگ گئے لیکن جب ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے اپنی حکمت حربی و بحری اور بے مثال دلاوری سے یوروپ کے اس ناقابل تسخیر قلعہ (قسطنطنیہ) کو فتح کر لیا تو مغربی اقوام کے پاؤں کے نیچے سے زمین

نکل گئی قرونِ وسطیٰ کی صلیبی لڑائیوں کے بعد یہ پہلی عظیم شکست تھی جس کی ٹھوکر نے خوابیدہ یورپ کو جھنجھوڑ کر جگا دیا اور صدیوں کے نیند کے ماتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تاریخ اسلامی کے لیے عثمانی ترکوں کی اس عظیم فتح کا عجیب وغریب ماجرا اس وقت ظہور میں آیا جبکہ مسلمانوں کو ہسپانیۂ عظمیٰ (اندلس) کی سرزمین سے آٹھ سو سالہ حکومت کے بعد جلاوطن کر کے باہر پھینک دیا گیا تھا ایک طرف مغرب کے افق سے مسلمانوں کا آفتابِ اقبال غروب ہو رہا تھا تو دوسری طرف اسی کے ایک مطلع (قسطنطنیہ) سے فتح وکامرانی کا سنہری شعاعیں پھیلاتا ہوا سورج طلوع ہو رہا تھا بقول اقبال "کعبہ کو صنم خانے سے پاسباں مل گئے تھے"۔

ہسپانیۂ عظمیٰ کی سرزمین وہ ہے جہاں موروں (عربوں) نے اموی سلطنت کے عہد میں مغربی اقوام کے لیے علوم وفنون کے دروازے کھول دئے تھے۔ قرطبہ، غرناطہ اور اشبیلیہ کی عظیم الشان علمی درسگاہوں (یونیورسٹیوں) میں جدید وقدیم علوم کی گرم بازاری جاری تھی جہاں علامہ ابنِ رشد، ابن باجہ، ابنِ طفیل، ابوالہثیم اور ابوالقاسم زہراوی جیسے فلسفی وسائنسداں قدیم فلسفہ وحکمت کے ساتھ جدید علم (سائنس) کو اپنے مشاہدات وتجربات کے ذریعہ فروغ دینے کی ابتدائی کوششوں میں لگے ہوئے تھے چونکہ حکمتِ الٰہی (قرآن) نے ساری کائنات کو انسان کے لیے تابعدار وفرماں بردار ہوتے اور فکر ونظر اور عملی قوتوں سے اس کی تسخیر کرنے کی دعوت دی تھی قدیمی مشرکانہ نظریہ کو یکسر مسترد کر دیا تھا کہ ہر عظیم ومنفعت بخش مخلوق قابلِ تعظیم وعبادت ہے جس دن سے دنیا کی قدیمی تہذیبوں کا یہ شرکیہ فلسفہ تعلیماتِ انسانی کی بدولت دل ودماغ سے محو ہونا شروع ہوا سائنس کی بنیاد پڑ گئی اس لیے سائنس اسلامی تعلیمات کی دین ہے۔

سب سے پہلے سرزمین اندلس (ہسپانیۂ عظمیٰ) سے اس آفتاب علم (سائنس) کی شعاعیں نکل کر یورپ کی فضاؤں میں چمکیں شائقینِ علوم کے قافلے اس

سرزمین کی طرف رخ کرنے لگے چونکہ اسلام نے اپنے طلوع ہونے کے بعد علم پر کسی فرقہ یا طبقہ کی اجارہ داری کے قدیم تصور کو باطل ٹھہرادیا تھا اور اس کا اعلان کر دیا تھا کہ جس خدا کا دسترخوانِ نعمت ہر مومن و کافر کے لیے بچھا ہوا ہے اسی طرح علوم و فنون کا دروازہ ہر ایک انسان کے لیے کھلا ہوا ہے اس لیے کلیسائی نظام سے بیزار مغربی باشندے اسپین پہنچ کر علم و حکمت (فلسفہ) اور علم تجربی (سائنس) سے بہرہ اندوز ہوئے اور اس کی لہریں مغربی ممالک میں تیزی سے پھیلنے لگیں خود مسلمان سائنسداں، ترک خلفا کی ناقدری سے اسی طرح مغربی ممالک کی طرف منتقل ہوتے لگے جس طرح آج ہندوستان کے اعلیٰ درجہ کے سائنسداں اور ڈاکٹر امریکہ یا یورپ کا رخ کر رہے ہیں اس لیے کہ ترکی قوم شجاعت و بہادری میں اسلام کے لیے بازوئے شمشیر زن ضرور بنی لیکن عربوں کی طرح علوم و فنون کی سرپرستی میں بہت پیچھے رہی اسی تحریک علمی نے نشاۃ الثانیہ کا آغاز کیا جس کا اعتراف یورپ کے منصف مصنفین راجر بیکن، ڈریپئر، ڈاکٹر گسٹاؤ لیبان موسیو رنیاں وغیرہ نے کھلے بندوں کیا ہے البتہ مغربی تہذیب کی ستم ظریفی یہ ہے کہ جب مشرقی استاد بوڑھا ہوگیا تو مغرب کے نوخیز شاگرد نے استاد کو ٹھکانے لگا دیا اور وہی قصہ ہوگیا کہ جس شخص سے تیر چلانا سیکھا تھا سب سے پہلے اسی کو نشانہ بنایا گیا۔ انقلاباتِ عالم کی یہ داستاں ہمیشہ دہرائی جاتی رہی ہے اور دہرائی جاتی رہے گی۔ یہ امر یاد رہے کہ پہلی صلیبی لڑائیاں عیسائی مذہب کے غلط جوشِ جنون کا نتیجہ تھیں جس کے اندر یورپ کے جنونی انتقام کی انتہا پسندانہ کارفرمائیاں عمل میں آئیں البتہ مسلمانوں کا کردار اعتدال پسندانہ رہا لیکن قسطنطنیہ کے ہاتھ سے نکل جانے پر مغربی قوموں کو ہوش آیا پہلے مسلمانوں کا مقابلہ جوش سے کیا گیا تھا جس کے اندر مسلمانوں کا جوش غالب آیا کیونکہ وہ ایک جوشیلی قوم تھی جب جب انھوں نے مشرق سے ہوش کے ساتھ مقابلہ کی ٹھانی تو وہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں اترے اور ہمیں تسلیم کر لینا چاہیئے کہ جن علمی ترقیوں اور تنظیمی صلاحیتوں کے ساتھ وہ اس میدان میں اترے تھے ان کا مقابلہ مشرقی اقوام نہ کر سکیں

اور یقیناً جوش پر ہوش غالب آگیا بہر حال سترھویں صدی (۱۶۰۰ء) میں یورپ ایک طرف عربوں کی مدد سے علمی انکشافات اور عملی ترقیات کے میدان میں قدم رکھنے لگا تو دوسری طرف ترکوں کی قسطنطنیہ کی فتح، بحرِ روم کا قبضہ اور آبنائے باسفورس کے ذریعہ ناکہ بندی کر دینے سے یورپ کو بحری مہم جوئی کی طرف توجہ ہوئی جس کی پہل اسپین والوں نے کی، اس امر کا یاد دلانا ضروری ہے کہ مشہور اسلامی فاتح طارق نے سب سے پہلے یورپ کی جس سرزمین پر قدم رکھا وہ اسپین کی تھی جس کی یادگار، جبرالٹر آج بھی موجود ہے اس لیے عربوں کی پہلی حکومت یورپ میں یہیں قائم ہوئی اور انھوں نے آٹھ سو سال تک اس خطہ کو اپنے عصر آفریں علمی انکشافات اور منفعت بخش سائنسی ایجادات سے دنیا کی جنت بنا دیا قصر الحمرا، الزہرا اور جامع قرطبہ آج بھی تعمیر انسانی کے ہفت عجائب میں سے ہیں جب مسلمانوں کی دیرینہ بیماری (خانہ جنگی) نے ان کو ۱۶۰۰ء میں ملک بدر کیا تو اہلِ ہسپانیہ ان علوم و فنون کے وارث ہوئے چونکہ عربوں سے جہاز رانی کا پورا پورا سبق اہل ہسپانیہ نے حاصل کیا تھا اور ان عرب ملاحوں کے ساتھ سمندروں کے سفروں میں ملکوں ملکوں پھرے تھے اس بنا پر سب سے پہلے اسپین نے پھر اس سے ملحقہ علاقہ پرتگال نے بحری مہم جوئی کا آغاز کیا کولمبس جو نئی دنیا کا دریافت کرنے والا قرار دیا جاتا ہے وہ انہی عرب ملاحوں کا فیض یافتہ تھا اصل تاریخی حقیقت یہ ہے کہ کولمبس سے صدیوں پہلے عرب جہاز راں اس سرزمین کو پامال کر چکے تھے جیسے کہ ہم اپنی کتاب "شق القمر" میں لکھ چکے ہیں اسی طرح یہ امر بھی ثابت ہو چکا ہے کہ پرتگال کا مشہور بحری سیّاح واسکوڈی گاما، اسد البحر (دریائی شیر) ابن ماجد کی رہنمائی میں ۹ جولائی ۱۴۹۷ء میں افریقہ کا مکمل چکر لگاتا ہوا سب سے پہلے ہندوستانی ساحل گوا پر لنگر انداز ہوا تھا اس لیے پرتگیزی قوم پہلی قوم ہے جس نے ہندوستان کی دولت کی تجارت اور سیاست کے پردہ میں لوٹ مار شروع کی انھوں نے پورے یورپ میں ہندوستان کے لیے سونے کی چڑیا ہونے کو افسانوی شہرت دی اور پھر اس چڑیا کو شکار کرنے کے لیے یورپ کا

ہر ملک نئے اور پرانے اپنے اپنے جال لے کر ادھر دوڑ پڑا یورپ کی حریص وطماع اور لالچی قومیں منظم طریقہ پر جزائر شرق الہند اور ہندوستان جنت نشان کو "خوان یغما" یا مالِ غنیمت سمجھ کر اس پر قبضہ کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگیں جن کی بنا پر بحیرۂ عرب و بحرِ ہند مغربی اقوام کی رقابتوں کا اکھاڑہ بن گیا جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے اہلِ یورپ کے نزدیک قدیم زمانے سے نہایت منفعت بخش سلسلۂ تجارت مشرقی ایشیا کے زرخیز ممالک ہند اور مجمع الجزائر (حال انڈونیشیا و ملائشیا) کو سمجھا جاتا رہا ہے اٹھارہ سو سال تک بحری تجارت کا مرکز اور منڈی اسکندریہ رہی رومی شہنشاہوں نے اپنی بحری مہمات سے عرب جہاز رانوں کو بے دخل کرنے کے لیے عدن پر قبضہ جمانا چاہا لیکن چونکہ عرب سمندروں کے بادشاہ تھے اس لیے ان کے آگے کسی کی نہ چل سکی جب قافلۂ حیات ان درمیانی صدیوں کو طے کر کے سنرھویں (۱۶) صدی میں پہنچا تو دو امر مرکزی طور پر اس قافلہ کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف موڑنے کا سبب بنے (۱) پرتگیزی قوم کا ہند میں داخلہ (۲) سلطنت مغلیہ کا قیام۔ البقرق ۱۵۱۰ء میں گوا پر قابض ہوا اور بابر نے ۱۵۶۵ء میں پانی پت کے میدان کو سر کر کے مغل حکومت کی بنیاد رکھی۔ جب پرتگیزی قزاقوں نے بحیرۂ ہند کو لوٹ مار کا نشانہ بنایا تو اس وقت اکبر اعظم ملک کے مختلف صوبوں کو فتح کر کے اور اتحاد کی لڑی میں پرو کر متحدہ ہند کی داغ بیل ڈال رہا تھا۔ ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں جو ایک چھوٹا بر اعظم ہے اتنے دور دراز علاقوں پر قبضہ کر کے قابو پالینا بچوں کا کھیل نہیں اس لیے شہنشاہ کو خشکی کے جھگڑوں سے فرصت ہی نہیں مل سکی اور بحری طاقت کی طرف خیال تک نہیں گیا حالانکہ دنیا دار مولویوں نے بادشاہ کی خوشنودی کی خاطر حج کے نہ فرض ہونے کا فتویٰ سمندروں کے محفوظ نہ ہونے کی بنا پر دے دیا تھا جس کی وجہ وہی پرتگیزیوں کی سمندری لوٹ مار تھی لیکن اکبر نے اپنے ذوقِ تماشا بینی کے لیے پرتگیزیوں کو جگہ دے رکھی تھی اور ان کی بحری ریشہ دوانیوں سے غافل

و بے خبر رہا اکبر کا زمانہ انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کا زمانہ تھا یہ دونوں ہم عصر تھے اکبر کے چار جانشینوں (جہانگیر و شاہجہاں، اورنگ زیب و بہادر شاہ) نے ایک سو اکیاون (۱۵۱) سال تک حکومت کی۔

اورنگ زیب اور لوئی چاردہم دونوں کا ایک ہی زمانہ ہے ان دونوں نے تخت سلطنت پر اس وقت قدم رکھا جبکہ دونوں سلطنتیں نقطۂ عروج پر پہنچی ہوئی تھیں یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ مغل قوم کی جو شاخ قسطنطنیہ میں جاکر برسرِ اقتدار ہوئی جن کو ترک کہا جاتا ہے انھوں نے اپنی بحری طاقت کو اس قدر مضبوط بنایا کہ سنہ ۱۵۱۷ء میں ترکی بیڑے نے بحیرۂ روم میں پرتگالیوں کو شکست دے کر باہر نکال دیا لیکن ہندوستان کے مغل اس طرف سے بے پروا رہے سنہ ۱۵۷۸ء میں ملکۂ ایلزبتھ نے ہالینڈ کی آزادی کو تسلیم کرکے اسپین سے جنگ کی اور اس کو شکست دے کر مشرقی نوآبادیات کے لیے راستہ صاف کر دیا چنانچہ ہالینڈ کے جہاز سنہ ۱۵۶۷ء میں راس امید (افریقہ) کا چکر کاٹ کے ایشیائی سمندروں میں داخل ہوئے پھر سترھویں صدی ہالینڈ و انگلینڈ کی رسہ کشی میں گزری بالآخر ہالینڈ نے پرتگیزی مقبوضات (جزائرِ شرق الہند) پر قبضہ جما لیا جو اپنی سرسبزی و شادابی اور ساری دنیا میں مصالحہ کی پیداواری کے لحاظ سے حصولِ دولت و تجارت میں کلیدی حیثیت رکھتے تھے یہی بحری تجارت تھی جس نے جمہوریہ ہالینڈ کو غیر معمولی طاقت عطا کی اور یہی وہ عالمگیر کاروبار ہے جس پر انگلستان کی عظمت و شوکت کا عالی شان محل تعمیر ہوا سترھویں صدی کی ہالینڈ اور انگلینڈ کی رسہ کشی نے فرانس کو بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے لیے میدان میں لا کھڑا کر دیا سنہ ۱۶۵۴ء میں دونوں حکومتوں میں صلح ہو جانے کی وجہ سے انگلستان کی حالت سدھرنے لگی۔ شاہجہاں بادشاہ کے دور میں باہمی برادر کشی کی بنا پر کمپنی کا کاروبار جانکنی کی حالت تک پہنچ گیا ادھر اورنگ زیب کے دور سنہ ۱۶۶۰ء میں سیاسی و ملکی استحکام پیدا ہوا اور ادھر سنہ ۱۶۶۰ء میں انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تو اپنے

نشۂ قوت میں بدمست ہو کر کمپنی بہادر نے شہنشاہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا شہنشاہ نے فرمان جاری کر دیا کہ انگریزوں کو مدراس اور ساحلی علاقوں سے ڈھکیل دیا جائے تو کمپنی کے چھکے چھوٹ گئے ساری تجارتی کوٹھیاں ضبط کر لی گئیں جب ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی آنکھیں بند ہوئیں تو طوائف الملوکی نے سر اٹھایا اور اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یورپ کی نوآبادیات نے خود مختاری کی تیاری کر لی۔ سترھویں صدی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چولا بدلنے کا دور تھا جو تجارت سے آگے بڑھ کر سلطنت کی سرحد میں قدم رکھنے لگی اورنگ زیب جس نے پچاس سال تک نہایت مستعدی سے حکومت کی اور مغل سلطنت کے قصرِ عظمت کو زمین سے آسمان تک پہنچا دیا اس کے انتقال پر مغل شہنشاہیت کی جو دھاک دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی اٹھنا شروع ہوئی اور پچاس برس گزرنے نہ پائے تھے کہ مغلیہ حکومت ایک پرچھائیں بن کر رہ گئی دغاباز و بزدل اور حریص اقتدار پرستوں کے ہاتھ میں حکومت ایک کٹھ پتلی بن گئی۔ بہر حال اٹھارھویں ۱۹۰۰ صدی کے اختتام پر برطانوی سامراج اپنے رسوائے عالم ڈپلومیسی کے ماتحت ملک کے اندر سازشوں کا جال بچھا کر اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہندوستان کو ہتھیا لینے میں کامیاب ہو گیا جس میں فرانسیسی سامراج کی غلطیوں اور ہالینڈ کی بداقبالیوں کا بڑا دخل ہے۔ ہمارے نزدیک مشرقی اقوام اور عالمِ اسلام کے زوال کا نقطۂ آغاز وہ سانحہ ہے جب ایرانی و تورانی (شیعہ و سنی) آویزش کی بنا پر مشرق کے تجارتی قافلوں کا خشکی والا راستہ بند ہو گیا خشکی کی وہ تجارت جو عراق و عرب کو ہندوستان سے ملاتی تھی اس کا سلسلہ کٹ گیا یہی وہ قدیمی تجارتی خشکی کا راستہ ہے جو مشرق کی شاہراہِ عظیم سے جڑ جاتا تھا جہاں سے مشرقی مال اسکندریہ کے ذریعہ یورپ دساور کیا جاتا تھا۔ ایشیا کے جس زوال کا آغاز خشکی کے تجارت کے خاتمہ سے ہوا تھا مغربی قوموں نے سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک اپنی مسلسل کارروائیوں کے ذریعہ سمندروں پر قبضہ جما لیا اور عربوں کو

جب سمندروں سے باہر نکال پھینکا تو یہ زوال انتہا کو پہنچ گیا رہی سہی جو کسر باقی تھی وہ ۱۹۱۴ء میں ترکوں کے خلافت کے خاتمہ پر پوری ہوگئی اس لیے کہ ترکی خلافت اپنے ضعف و کمزوری کے باوجود ایشیائی ممالک کے لیے یورپ کے حملوں سے حفاظت و مدافعت کا فریضہ برابر انجام دیتی رہتی تھی اس لیے انیسویں صدی میں مغرب کا اقبال نقطۂ عروج پر پہنچ گیا جہاں سے اس کے زوال کا آغاز ہونا ہے جیسا کہ مشہور ہے "ہر کمالے را زوال"

تاریخ اسلامی ہند کے تین دور

تمہید!

ہمارا ملک ہندوستان جنت نشان عرب وہند کی قدیم تعلق کی بنا پر (پہلی صدی ہجری) سے چھٹی صدی ہجری اسلام کا رشتہ اس ملک سے بندھ گیا۔ عرب تاجروں اور مسلمان صوفیوں، درویشوں کی آمد و رفت ہوتی رہی۔ اور کئی مقامات پر مسلمانوں کی نوآبادیاں قائم ہوتی گئیں۔ محمد بن قاسم کے حملہ ۷۱۲ء / ۹۶ھ سے بہت پہلے ہمارے ملک میں مسلمانوں کے کئی مرکز قائم ہو چکے تھے۔ بلکہ عربوں نے اپنی دیانت و امانت ہمت و شجاعت کی بدولت جنوبی ہند کے متعدد راجاؤں کے یہاں عزت و احترام اور بلند مقام حاصل کر لیا تھا۔ گجرات، سندھ و دکن (مہاراشٹر و تامل ناڈو) میں ہندو راجاؤں کے ماتحت پرامن و خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور عرب تجار اور فقراء کے ہاتھوں اسلام ملک کے اندرونی علاقوں میں اپنے بازو پھیلاتا جا رہا تھا۔ اور ان ابتدائی مسلمانوں کی نیک کرداری کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کے دلوں میں اس کی طرف گوشۂ التفات پیدا ہو چکا تھا۔ چنانچہ اِن خوش معاملہ تاجروں اور خدمت گذار درویشوں نے محمد بن قاسم کی آمد سے پہلے ہی لوگوں کے دل جیت لیئے تھے۔ سب سے بڑھ کر پر لطف بات یہ ہے کہ دائرہ اسلام کی وسعت کا سلسلہ جنوبی ہند سے مزید پھیلاؤ اختیار کر رہا تھا۔ جہاں نہ محمد بن قاسم کی فوجیں پہونچ سکیں اور نہ کبھی غزنوی و غوری فوجوں کے قدم

اس سرزمین پر پڑ سکے۔

یہاں تک کہ شہاب الدین غوری کے حملہ ۱۱۷۵ء کے وقت ملک میں نہ صرف مسلمانوں کے بے حد و بے شمار نوآبادیوں کا سلسلہ تھا بلکہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی قائم ہو چکی تھیں۔ خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ جن کو ہندوستان میں اسلام کا پہلا داعی بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت کی تشریف آوری سے سوا سو سال پہلے ۱۰۴۴ء ملک کے وسطانی خطہ (مالوہ) میں جہاں اس دور میں پہونچنا مشکل تھا شاہ عبداللہ چنگال کے ہاتھ پر راجہ بھوج ثانی المعروف شاہ عبداللہ مسلمان ہو چکا تھا جس کی تفصیل ہم اپنی کتاب "ہندوستان اسلام کے سایہ میں" کر چکے ہیں۔ لوگوں کے لیے یا تاریخی واقعہ تعجب خیز ہوگا کہ۔

جب غوری نے ۱۱۹۲ء دہلی پر قبضہ کیا تو اس وقت ملک مالوہ کا بادشاہ بہادر شاہ نامی غوری سے مقابلہ کرنے کے لیے دہلی پہونچا اور غوری کی فوجوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ اس لیے ہمارے نزدیک زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت خواجہ صاحب کی تشریف آوری یا غوری کی فتح کے بعد ہندوستان مسلمانوں کا ایسا ہی مرکز بن گیا تھا۔ جیسا کہ بلخ و بخارا۔ یا اصفہان و شیراز زمانہ قدیم میں تھے۔

بہر حال تاریخ اسلامی ہند کا ابتدائی گوشہ خالی باب ہے۔ جو عہد نو کے مورخ کے انتظار میں چشم براہ ہے جو فرانگی سامراج کی پھیلائی ہوئی تاریخی غلط فہمیوں کے گرد و غبار کو اپنے نوک قلم سے صاف کر سکے جس نے تینوں ملکوں۔ ہند و پاک اور بنگلہ دیش کی فضاؤں کو مسموم کر رکھا ہے۔

ترک افغانی مسلم حکومت کا دور

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کے قائم شدہ نظام کے مطابق ہندوؤں کی طرح نو وارد مسلمان بھی مختلف ٹکڑیوں میں بکھرے ہوئے آج کل کی زبان میں وفاقی نظام (فیڈریشن) کے ماتحت رہتے چلے آرہے تھے۔ ان نو وارد مسلمانوں میں

اس ملک کے اندر اسلامی و دینی تعلق کے علاوہ ملکی اتحاد کا کوئی رشتہ موجود نہ تھا۔ مختلف راجوں مہاراجوں کی حکومتوں میں اپنی آزادانہ زندگی گذار رہے تھے ہندوستان کے باشندوں کی قدیمی فیاضی و رواداری کی روایات کی وجہ سے اس ملک میں مذہبی تعصب کا سایہ نہ پڑا تھا۔

جب غوری قطب الدین ایبک المتوفی ۱۲۱۰ء ایک اپنے ترکی غلام کو اپنا نائب مقرر کر کے غزنی ۱۱۹۲ء میں چلا گیا اور وہ غوری کے بعد مسند نشین حکومت ہوا تو ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے اورنگ آرائے سلطنت ہوا۔ وہ انصاف پسند بادشاہ تھا۔ ہندو، مسلم اُس کی نگاہِ عدل میں یکساں تھے اور اس کی سخاوت و فیاضی کا دریا ہر ایک کے لیے یکساں بہتا رہتا تھا۔ اس لیے سب اس کو لکھ داتا کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ قطب الدین ایبک نے اس ملک کو اپنا وطن بنا کر قطب مینار تعمیر کیا اور امراء و رؤسا کی عالیشان تعمیرات نے دہلی کو مستقل مستقر بنایا اب دارالسلطنت دہلی بھی بغداد، قرطبہ، دمشق، قاہرہ کی طرح ہندوستان میں ایک مرکز اسلام بن گیا۔ چونکہ مسلمان بادۂ توحید میں سرشار ہو کر آئے تھے اس لیے انہوں نے اپنے عقیدہ توحید کے مطابق ایک متحدہ ہند کے تصور کی داغ بیل ڈال دی۔

قطب الدین ایبک کے غلام و جانشین شمش الدین التمش نے زمین ہموار کی التمش پہلا بادشاہ ہے جس کو بغداد کے خلیفہ نے ہند کا بادشاہ مان لیا۔ اور اس نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ التمش کے دور میں علماء و فضلاء کا جمگھٹا ہو گیا تھا۔ اس کا دربار محمود غزنوی اور سلطان سنجر کے دربار کی یادوں کو تازہ کرتا تھا ان فاضلوں کاملوں کو جمع کرنے میں ہر سال ایک کروڑ روپیہ خرچ کرتا تھا۔ التمش کا دورِ حکومت ۱۲۱۱ء تا ۱۲۳۶ء رہا۔ اس وقت ملک جس اندرونی و بیرونی خطروں سے گھرا ہوا تھا اس نے اس طوفان سے نکال کر ملک کی کشتی کو ساحل ترقی پر لگایا۔ پھر سلطان ناصر الدین محمود جو التمش کا چھوٹا بیٹا تھا تخت نشین ہوا ۱۲۳۶ء اس کی نیکی و پرہیزگاری

کا یہ عالم تھا کہ خزانہ شاہی سے ایک حبّہ نہ لیتا تھا۔ اپنے ہاتھ سے وہ قرآن شریف لکھتا اور اس کے ہدیہ سے اخراجات پورا کرتا تھا۔ بیوی ملکۂ ہند اپنے ہاتھ سے کام کاج کرتی تھی۔

اس کے بعد غیاث الدین بلبن المتوفی ۶۶۶ھ جو اس عادات میں کے لحاظ سے مجموعہ اضداد تھا اس کے زمانہ میں ہزاروں علماء وفضلاء چنگیزیوں کی دست وبرد سے نکل کر ہندوستان میں جمع ہو گئے تھے۔ اس لیے اُس کے دربار کو بارگاہِ محمود وسنجر سے زیادہ درجہ دیا گیا۔ وہ عالموں وبزرگوں کی قدر دانی کرتا اور احکامِ خداوندی کو سنکر زار زار رو دیتا۔ اس نے پہلے وزیر بن کر پھر بادشاہ کی حیثیت سے چالیس سال تک اپنے تدبّر اور بہادری سے ملکی نظام مستحکم کرتے متحدہ ہند کی بنیادیں فراہم کیں بلبن کا دورِ حکومت ۱۲۶۶ء تا ۱۲۸۶ء رہا پھر اس کے بعد جلال الدین خلجی برسرِ اقتدار آیا جو نہایت نیک نفس اور خدا ترس بادشاہ تھا۔ مذہب پسندی رواداری اور خدا ترسی میں پہلے بادشاہوں سے کم نہ تھا جس وقت وہ شہید ہوا۔ روزے سے تھا اور زبان پر کلمۂ شہادت جاری تھا۔ جلال الدین خلجی کے داماد اور بھتیجہ علاء الدین خلجی نے اپنی فتوحات کے غرور میں بوڑھے چچا کو قتل کر کے حکومت کو قبضا لیا۔ ابتداً اس کی انانیت پسندی نے نیا مذہب جاری کرنے پر اُس کو اکسایا لیکن بہت جلد ٹھوکر کھا کر سنبھل گیا۔ اور ۱۲۹۶ء ۶۹۶ھ میں مسندِ اقتدار پر بیٹھا۔ سلطان علاء الدین خلجی جو سکندرِ عہد تھا (اپنے زمانے کا سکندر) یہ وہ پہلا شہنشاہ ہے جس نے اپنے مشہور سپہ سالار کے ذریعہ جنوبی ہند کو فتح کر کے مرکزِ دہلی کے تابع بنایا۔ اور شمال وجنوب کو مسلکِ اتحاد میں پرو کر صدیوں سے بچھڑے ہوئے علاقوں کو ایک کر دیا۔ پھر محمد شاہ تغلق نے جو عاقل ودیوانہ کہلایا۔ یہی وہ پہلا بادشاہ ہے۔ جس نے ہندوستان کی پرانی راجدھانی دہلی کو چھوڑ کر جنوبی ہند کے مقام دیوگیر (دولت آباد) کُل ہند راجدھانی بنا کر ملکی اتحاد کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھایا اور صدیوں کی اس اجنبیت اور غیریت کی دیوار کو ڈھا کر شمال وجنوب کے آنے جانے والوں کے لیے بند راستے کھول دئے۔ پھر مسلمان فاتحوں کی بدولت متحدہ ہندوستان (ہند سلطنت)

کا مستقل نصب العین بن گیا۔ جس کو بعد میں مغل شہنشاہیت نے درجہ تکمیل تک پہونچا دیا۔ اکبرؔ و عالمگیرؔ کے عہد میں پچھلے مسلمان بادشاہوں کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گیا۔ اس لیے مسلمان بادشاہ ہمارے نزدیک اپنے عقیدہ توحید کی بنا کر متحدہ ہند کے بانی مبانی اور داعی ہیں۔ بہرحال اِن ترک افغانی بادشاہوں نے جن کے اندر خاندان علامان خلجی و تغلق اور لودھی سب شامل ہیں۔ ہندوستان کی مسلم حکومت کو بغدادؔ و خوارزمؔ، غزنیؔ و غور کے زیر اقتدار رکھنے کے بجائے ایک آزاد و مختار سلطنت بنا دیا۔ اس مسلم دورِ حکومت میں مرکزی خلافت سے ذہنی رشتہ ضرور قائم رہا۔ مشہور عالم سیاح علامہ ابن بطوطہؔ اسلامی سفیر بن کر آیا اور پھر عہدہ شیخ الاسلامی پر ایک عرصہ تک دہلی میں قیام کیا۔ اِن معروضات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اس ملک میں سکونت و اقامت صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔ لیکن اس ملک کو مستقل و خود مختار حکومت بنانے کا سہرا اِن افغانی بادشاہوں کے سر ہے۔

ترک افغانی حکومت کو ملک کی عظیم خدمت:۔

اِس مسلم افغان حکومت کا سب سے بڑا عطیہ ہمارے ملک کو ملکی اتحاد شمالی و جنوبی ہند کے درمیان صدیوں پرانے رابطوں کی تجدید ہے۔ دوسرا تحفہ قابل قدر یہ ہے کہ ان بادشاہوں نے ہمارے ملک کو بیرونی حملوں سے محفوظ کر کے ملک کو سرسبزی و شادابی اور ترقی کی شاہراہ پر لا کر کھڑا کر دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب افغان مسلمان بادشاہوں نے دارالسلطنت کو متحدہ ہند کا مرکز بنایا تو یہ دور (بارھویں صدی عیسوی) ساری دنیا خصوصاً ایشیائی مسلم ممالک کے نہایت خطرناک دور سے گذر رہی تھی منگولین قوم جو اپنے پہاڑی دردں اور کوہستانی خطوں میں صدیوں سے محبوس بیٹھی ہوئی تھی یکایک ایک عظیم بند کی طرح پھٹ پڑنے کی طرح اپنے علاقے سے ابل پڑی۔ اور یاجوج ماجوج بن کر ٹوٹ پڑی اونچے اونچے پہاڑوں سے ایشیا و یورپ کے نشیبی علاقوں کی طرف ٹوٹ پڑی تھی۔ منگولین قوم قہر الہٰی کا سیلاب بن کر پھیل گئی۔

جو اس کی زد میں آیا تہس نہس ہوگیا۔ قیامت سے پہلے قیامت قائم ہوگئی۔ عروس البلاد بغداد جو صدیوں سے مسلم تہذیب و تمدن کا گنجینہ دار اور اُس وقت کی تمام اقوام و ملل کے علوم و فنون کا آئینہ بردار اور جملہ قوموں اور مذہبوں کے آزادانہ افکار و خیالات کا گہوارہ رہا تھا۔ خلیفہ اسلام جہاں بیٹھ کر آدھی دنیا پر دادِ حکمرانی لیتا تھا۔ جس کے شاندار و رنگا رنگ شاہی محلات اور امراء کی عالیشان عمارات خوبصورت خوشنما، بلند و بالا میناروں والی مساجد۔ جگمگاتے بازار و روشن شاہراہیں۔ وسط شہر میں دریائے دجلہ کی سبک و خراماں لہریں، نہروں کا جال پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا گویا کہ وہ شہر اس وقت دنیا کی بہشت تھا۔ اہالیان بغداد کی عیش پرستی و باہمی خانہ جنگی نے اِن کو ایسا روز بد دکھایا کہ لاکھوں انسانوں کی آبادی کو خون کے دریا میں سے گذرنا پڑا ہلاکو کی فوجوں کی ہلاکت سامانی کا عالم یہ ہوا کہ انسانوں کے خون سے دجلہ کا پانی چالیس دن تک سرخ خون بنا رہا۔ اور جب وہاں کے قیمتی کتب خانوں جلاکر دجلہ میں ڈالا گیا تو مدتوں پانی سیاہی کا کام دیتا رہا۔ شہر مہینوں آگ کے شعلوں میں جلتا رہا۔ غرض صدیوں کا جمع کیا ہوا علمی ذخیرہ اور تہذیبی اثاثہ اور تمدنی ورثہ جل جلا کر خاک ہوگیا جیسا شیخ سعدی نے بڑا دل سوز مرثیہ کہا ہے

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمین ۔ بر زوال ملک مستعصم امیر المومنین

نہ صرف عروس البلاء کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی ملک خوارزم شاہی جلاکر خاکستر کر دیا گیا۔ اصفہان برباد نیشاپور تباہ۔ بلخ و بخارا مسمار اور مشہد مقدس کو جلا دیا گیا۔

تاریخ کے اوراق کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس صدی میں ایک طرف منگول از ین خیل کے یلغار۔ دیانا سے انڈونیشیا تک اور سائبیریا سے مغربی ایشیا کے ساحلی علاقہ تک اور دوسری طرف دہلی سلطنت کوہ ہندوکش سے رامیشورم تک کے لیے بڑھ رہے تھے۔ لیکن دہلی کی مرکزی سلطنت کا کُل ہند فولادی نظام اس قدر مضبوط و طاقتور تھا کہ منگولیوں کی ساری فوجی طاقت اس کے قلعہ سے

سر ٹکرا ٹکرا کر رہ گئی سلطان شمس الدین التمش ۱۲۲۰ء سے محمد تغلق کی تخت نشینی
۱۳۲۵ء تک پورے سو سال تک روئے زمین کی بڑی سلطنت کی حیثیت سے قائم
رہی اور ایک تہذیبی و معاشرتی رشتہ میں پورے ملک کو پرو کر متحدہ ہند کی
داغ بیل ڈالی۔

چنگیزی حملہ کی ہولناکی کی روداد یہ ہے کہ چنگیز خاں ۱۲۲۰ء میں سمرقند و بخارا کو
تباہ و برباد کر کے قبۃ الاسلام بلخ کی طرف رک گیا اور اگلے سال بارہ سو مسجدوں دو سو
حماموں والے شہر کو ایسا ویران کیا کہ کوئی چراغ جلانے والا نہ رہا۔ اس وقت سلطان
التمش نے ۱۲۳۵ء میں اس بلائے بے درماں کو بالا بالا ٹال دیا خوارزم شاہی سپہ سالار
جلال الدین کی مدد کر کے ہندوستان کی سرحد کو ان خونخواروں مغلوں سے بچا لیا۔ سلطان
التمش کے بعد ناصر الدین محمود جو شاہی میں فقیری کرتا تھا اس کے جاہ و جلال کا شہرہ
سن کر جو دربار دہلی کے شان و شوکت دیکھ کر مغلوں کا سفیر مبہوت و حیرت زدہ ہو کر رہ گیا چنانچہ
مغلوں کی پھر ہمت نہ ہو سکی کہ دہلی کی طرف رخ کر سکیں۔ جب سلطان غیاث الدین
نے اپنے آقا ناصر الدین محمود کی سلطنت کی باگ دوڑ سنبھالی تو مرکزی سلطنت کی
بنیادوں کو اس قدر مضبوط و مستحکم کر دیا کہ نہ داخلی فتنے ہی اس کو ہلا سکے اور نہ خارجی
و بیرونی حملوں نے اس کو متزلزل کیا۔ سلطان بلبن کے آخری عہد حکومت میں ہلاکو کے
پوتے ارغوان خاں حاکم ایران نے امیر تیمور کو انتقام لینے کے لیے بتیس ہزار کا جرار
لشکر ملتان بھیجا۔ بلبن کا بیٹا سلطان محمد خاں المعروف بہ خان شہید کو ان کے مقابلے
کے لیئے بھیجا گیا۔ میدان جنگ میں شاہی افواج نے مغلوں کو پسپا کر ہی دیا تھا۔ لیکن
بحکم قضا تیر ستم کا شکار ہو گیا۔ بلبن اس غم کو برداشت نہ کر سکا اور ۱۲۸۶ء میں اس پر
خاندان غلامان کا خاتمہ ہو گیا اور جلال الدین خلجی مسند اقتدار پر بیٹھا خلجی خاندان
تیس سال حکمراں رہا، جلال الدین خلجی کے جلوس کے اگلے سال ہی ۱۲۹۷ء میں ایک لاکھ
منگولیوں اور چینیوں کا ایک زبردست لشکر دریائے جہلم پار کر کے پایۂ تخت کی طرف
سیلاب کی طرح بڑھا۔ جس کو ظفر خاں اور الغ خاں نے شکست دے کر بھگا دیا۔

جلال الدین خلجی کے بعد علاء الدین خلجی اپنے خسر جلال الدین خلجی کو ٹھکانے لگا کر برسر اقتدار ہوا تو منگولی سردار قتلغ خواجہ کی سرکردگی میں دو لاکھ کے لشکر نے دہلی پر دھاوا بول دیا اور کیلی میں مورچہ جمایا۔ تو خود شاہ میدان جنگ میں کود پڑا اور شہر کو بربادی سے بچانے کے لیے شہر پناہ سے باہر جنگ کرنے کا فیصلہ کیا کہ اگر خدانخواستہ بادشاہ کو شکست ہو جائے تو شہریوں کے جان مال کا نقصان نہ اٹھانا پڑے۔ کوتوال شہر کو کنجیاں حوالہ کر دیں کہ وہ ہار کی صورت میں غنیم کو دیدیں ہفتوں فوجیں آمنے سامنے کھڑی رہیں۔ اور بادشاہ نے اپنی حربی حکمت عملی سے جنگ کو طول دیا۔ یہ پالیسی ایسی کامیاب ہوئی تو حملہ آور خود پسپا ہو کر راتوں رات بھاگ نکلے (جامع تاریخ ہند از سکینہ ص ۳۴) اس واقعہ سے جہاں اُس کی مردانگی و کمال تدبیر پر روشنی پڑتی ہے۔ وہیں انسان دوستی بھی آشکار ہوتی ہے۔ اُس کے عہد حکومت میں منگولیوں، تاتاریوں اور چینیوں نے پانچ سے زیادہ خوفناک حملے کئے لیکن شہنشاہ نے سب کو پسپا کر کے لوگوں کے دلوں سے منگولیوں کی طرف سے پیدا شدہ دہشت کو دور کر دیا۔ اور اس طرح ناقابل شکست عزم و قوت سے ہندوستان کی سالمیت و یکجہتی اور یہاں کی تہذیبوں کی رنگارنگی کو ہر طرح محفوظ کر دیا۔ منگولیوں کے اس حملہ اور غارت گردی سے بہت سے مرکزی شہر تو ایسے برباد ہوئے کہ دوبارہ پھر نہ آباد ہو سکے بغداد کی تباہی ایسی آئی کہ پھر ویسی رونق آج تک واپس نہ آسکی۔ شہروں کے علاوہ دیہات کی بستیاں ایسی اجڑیں کہ دوبارہ نہ بسائی جا سکیں بہر حال ان ترک افغان بادشاہوں کی ملک سے وفاداری اور بہادری سے منگولوں سے سخت مقابلہ آرائی کے نتیجہ میں عالم اسلام میں صرف ہندوستان ان طوفانی بلاؤں سے بچا رہا۔ علاء الدین خلجی نے اس خارجی فتنہ کی سرکوبی کے بعد داخلی انتظام، زمین کی لگان بندی، تنخواہوں اور اجرتوں میں درجہ بندی، ضروریات زندگی کی اشیاء پر کنٹرول نے ملک کو ترقی و خوشحالی سے مالا مال کر دیا۔ شہنشاہ کو جہانگیری کے ساتھ جہانبانی کا اعلیٰ سلیقہ حاصل تھا۔ اور واقعی سکندر ثانی کہے جانا کا مستحق ہے۔ یہی وہ بادشاہ ہے جس نے متحدہ ہند

کے تصور کے خاکے میں عملی رنگ بھرا اور ملک کو اندرونی و بیرونی فتنوں سے محفوظ کر دیا۔ شہنشاہ علاء الدین کا دورِ حکومت بیس سال ہے۔ جس کے اندر اس نے تاریخ ہند کا کے صفحہ پر ایسے نقوش ثبت کئے جو انمٹ ہیں۔ یہ تاریخی لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ وہ تمام بادشاہ جنھوں نے اپنی حکمتِ عملی، بہادری و دلاوری اور صلاحیت انتظامی سے تاریخ میں نام پیدا کیا۔ جیسے شمس الدین التمش، ناصر الدین محمود سلطان غیاث الدین بلبن اور خود علاء الدین ہیں ان سب کو اپنے سیاسی اقتدار کے لیے بیس سال ضرور ملے ہیں۔ بہرحال تاریخ ایشیا و یورپ کا خطرناک زمانہ ہمارے ملک کی علمی و عملی، سیاسی و اقتصادی اور معاشرتی ترقیات کا سنہری زمانہ چونکہ مغلوں، تاتاریوں، چینیوں کے اس تابڑ توڑ حملوں اور خونخوار حملوں اور خوں ریز دھاؤں سے پورا عالم اسلام زیر و زبر ہو رہا تھا۔ مغلوں کے ہاتھوں وہ لٹے پٹے قافلے جو خانماں و برباد ہوکر گوشہ عافیت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جن کے اندر بڑے بڑے علماء، و فضلاء اور مشائخ و صوفیاء تھے۔ انہوں نے ہمارے ملک میں پناہ لی۔ اور اس ملک نے اپنی پرانی میزبانی کی روایات کے مطابق اُن کی پذیرائی کی۔ چنانچہ ہر علم و فن کے ممتاز عالم و فاضل اور کامل انسانوں کی آمد سے ہمارا ملک علوم و فنون کا نشیمن بن گیا۔ عروس البلاد بغداد کی وہ علمی مرکزیت جو قاہرہ، بخارا اور اصفہان و شیراز کو حاصل ہوئی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں دار السلطنت دہلی کی طرف منتقل ہو گئی اور دہلی رشک بغداد و شیراز ہو گیا۔ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء نے اپنے عصر کو خیر الاعصار (بہترین و سنہری زمانہ) فرمایا ہے۔ اس دور کے علماء، مشائخ کے روزگار شخصیتیں تھیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔

چنانچہ بغداد اور قاہرہ اصفہان، شیراز، بلخ و بخارا کی طرح ہندوستان کی سرزمین عرفان آگیں بھی ایک اسلامی مرکز بن گئی۔ شہرہ آفاق شاعر امیر خسرو دہلوی نے شاعرانہ انداز میں تمام اسلامی ممالک کے شہروں پر دہلی کو فضیلت کا ترانہ گایا ہے۔ ؎

خوشا ہندوستان و رونقِ دیں ٭ شریعت راکمال عزو تمکین
زعلم باعمل دہلی بخارا ٭ زشاہاں گشتہ اسلام آشکارا

وہ فرماتے ہیں کہ دہلی عدن کی جنت ہے، اپنی خصوصیات کے اعتبار سے وہ باغِ ارم ہے اس کا قلعہ اس قدر بلند و بالا ہے کہ آسمان نیچا اور اس کی حصار اونچی ہے۔ اس کا ہر گھر بہشت ہے۔ اس شہر کی جامع مسجد فیض الٰہی کی جامع ہے۔ قطب مینار کے لئے کہتے ہیں کہ اس مینار کو دیکھ کر چاند نے اپنی ٹوپی اتار پھینکی ہے۔ حوض شمسی کا پانی اگر حضرت خضر پی لیتے تو آبِ حیات کے چشمہ کو بھول جاتے۔ خوشگوار بادِ نسیم سے یہاں گلشن و گلزار میں سال بھر بہار خیمہ ڈالے رہتی ہے۔ یہاں کی سرزمین پھولوں کی وجہ سے سونے چاندی سے بھری معلوم ہوتی ہے۔ یہاں جنت کی ہریالی ہے۔ اس شہر کے لوگ فرشتہ سیرت ہیں۔ اور اہل جنت کی طرح خوش دل اور خوش خو ہیں۔ ؎

حضرت دہلی کنف دین و داد ٭ جنت عدن است کہ آباد باد
گر شود قصد ایں بوستاں ٭ یکہ شود طائفِ ہندوستاں
گرچہ برنسبتِ فردوس جہاں ٭ باہم آمیزی خوں نداں سنت جہاں
لیک بہ ندامت لعمیش وگر ٭ کانش دروں بدمداز جنت بشمر
زاں سبب خاص بر اصحاب یقیں ٭ ہند رواں گفت کہ خلا است بریں
غلط کردم گر از دانش الم دم ٭ نہ لفظ ہندی ست اور پارسی کم

مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ جس نے سارے عالمِ اسلام کا سفر کیا تھا۔ دہلی کو سب سے بڑا شہر بتایا ہے۔ (سفر نامہ پر س ص ۴۶ ھ ۱) خلجی خاندان کے بعد جب خاندان تغلق تخت دہلی پر بیٹھا تو دہلی کی مرکزیت مزید مضبوط مستحکم ہوئی اور فیروز شاہ تغلق نے ملک کو اندرونی و بیرونی خطروں سے محفوظ کر کے تعمیری منصوبہ پورے ملک میں نافذ کیا۔ عالیشان عمارت، شاندار مدارس، آرام دہ سرائیں اور وسیع و فراخ شاہراہوں کا جال پورے ملک میں بچھا دیا۔ پھر لودھی خاندان میں سکندر لودھی کا عہد علم و ہنر کا دور تھا۔ جس کی شہادت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اخبارالاخیار میں

دی ہے۔

اس افغانی مسلم دورِ حکومت میں یہاں کی حکومتوں کا مرکزی خلافت سے دنیوی و دینی رشتہ زور دار طور پر قائم رہا۔ چنانچہ تغلق کے دور میں ابن بطوطہ اسلامی سفیر بن کر آیا اور شیخ الاسلام کے جلیل القدر عہدہ پر اسی خیر الانصار دہلی میں رہا۔ آخری افغان بادشاہ شیر شاہ سوری کو کل پانچ سال حکومت کرنے کے ملے اُس نے پنجسالہ منصوبہ میں کُل ہندوستان کو سندھ سے بنگال تک اور دہلی سے دکن تک شاہراہ اعظم کے ذریعہ جوڑ دیا۔ علاء الدین خلجی کی طرح اگر اس کو بیس سال کا موقع ملتا تو وہ ہندوستان کو ایشیا کا سب سے بڑا ملک بنا دیتا اس کا دورِ حکومت ۱۵۴۰ء سے ۱۵۴۵ء رہا۔

بہر حال سلطنت مغلیہ کے بانی شہنشاہِ بابر ۱۵۲۶ء نے سکندر لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دی تو تاریخ ہند کا دوسرا اوراق اُلٹا۔ قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ اسلام کا معجزہ ہے۔ وہی منگول جو عالمِ اسلام کے لیے قیامتِ صغریٰ بن کر ٹوٹے تھے۔ دو صدی گذرنے نہ پائی کہ وہ وحشی و خونخوار قوم حلقہ بگوش اسلام ہو کر تھوڑے عرصہ میں ایسے مہذب ہوئے کہ یورپ میں ترکوں اور ہندوستان میں مغلوں کے نام سے زبردست تہذیب و ترقی کے نقوش صفحۂ گیتی پر مرتسم کر دئے بقولِ اقبالؒ

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

"حکومت مغلیہ کا ہندوستان"

خاندان مغلیہ کے بانی ظہیر الدین بابر (۱۵۲۶ء) اپنی مہم جوئی، جواں ہمتی، جفا کشی و تیغ آزمائی اور مستقل مزاجی کی موروثی خصوصیات کے ساتھ اس نے جس علمی و ادبی ماحول میں آنکھیں کھولیں اور جن عالموں و فاضلوں کے زیر سایہ پرورش پائی اُس کے حوصلے و ہمّت نے اپنے باپ کی چھوٹی سی ریاست فرغانہ پر ہی محدود رہنے سے انکار کر دیا اُس نے اولاً کابل و پنجاب اور پورے ہندوستان کو زیر تصرف لانے کا خواب

دیکھنا شروع کر دیا آخر لڑتے بھڑتے دشمنوں سے ٹکر لیتے ہوئے پانی پت کے میدان کی فتح یابی نے اُس کو آسمان تاریخ کا درخشندہ ستارہ بنا دیا ایک طرف میدان پانی پت میں سکندر لودھی ایک لاکھ کا جرار لشکر اور دوسری طرف بابر کے ساتھ صرف بارہ ہزار مگر کار آزمودہ جاں باز فوج میدان میں اتری بابر کی حکمت حربی دبے مثال دلاوری نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ۱۵۲۶ء میں کر دیا۔ اور اُس نے حکومتِ مغلیہ کی بنیاد سرزمین ہند میں رکھدی میدان رزم کے اس شہسوار نے بزم کے میدان میں بھی اپنی علم نوازی و ادب پروری سے لوگوں کے دلوں میں سکّہ بٹھایا چونکہ وہ فنون لطیفہ کا شیدائی تھا ہمارے نزدیک بابر کا وصیّت نامہ حکومت مغلیہ کا اصل سنگِ بنیاد ہے جس پر اکبرؔ نے مغل شہنشاہیت کی فلک بوس عمارت تعمیر کر کے گریٹ مغل کا لقب پایا۔ چونکہ بابرؔ کے بیٹے نصیر الدین ہمایوں کو شیر شاہ سوریؔ کے ہاتھوں شکست ہو جانے اور دوبارہ فتح حاصل کرنے کے بعد چھ ماہ سے زائد حکومت کرنے کا موقع نہیں ملا اور ذوقِ نجوم شناسی کی تکمیل میں مبتلا رہا۔ ہمایوں کا دورِ حکومت ۱۵۳۰ء تا ۱۵۵۶ء رہا۔ البتہ اکبرؔ اعظم کو جس کا دورِ حکومت ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء رہا۔ سلطنت کی توسیع و استحکام میں کافی موقع ملا۔ اس لیے اس نے بھی اپنے دادا کی طرح رزم، بزم دونوں میدانوں میں فتوحات کا جھنڈا لہرا دیا۔ شہنشاہ بابرؔ کا وصیت نامہ یہ ہے۔

"اے جانِ پدر! سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے۔ خدا نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی ہے اس لیے تمہیں لازم ہے کہ تمام مذہبی تعصبات سے دل کو دھو ڈالو۔ عدل و انصاف میں ہر مذہب و ملّت کے طور طریقوں کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر ہندوستانیوں کے دلوں کو نہیں جیت سکتے اس ملک کی رعایا مراحم خسروانہ الطاف شاہانہ کی مرہونِ منت ہے۔ جو قوم و ملّت حکومت کی فرمانبردار اس کے مندر و مسجد برباد نہ کیے جائیں۔ عدل و انصاف ایسا کرو کہ رعایا بادشاہ سے خوش رہے ظلم و ستم کی بجائے لطف و کرم کی تلوار سے اسلام نے ترقی پائی ہے۔ شیعہ و سنّی جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا۔ جس طرح انسان کے جسم میں

چار عناصر مل جل کر کام کر رہے ہیں اُسی طرح مختلف رعایا کو ملا جلا رکھو۔ اور اتحادِ عمل پیدا کرو تا کہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ رہے۔ سرگذشت امیر تیمور کو جو اتحاد و اتفاق کا مالک تھا۔ ہر وقت پیش نظر رکھو۔ تا کہ نظم و نسق کے معاملہ میں پورا پورا تجربہ ہو (علماء حق ص ۱۳) بابر و ہمایوں کی فتح و شکست کے مرحلوں سے گذرنے کے بنا پر اپنی پالیسی کے نافذ کرنے کا پورا پورا موقع نہ مل سکا لیکن جب جلال الدین اکبر (۱۵۵۶ء) تخت نشین ہوا تو اس نے اپنے طویل دورِ حکومت میں اپنے دادا کی وصیت کو عملی جامہ پہنایا۔ اس نے ایک طرف اسلامی خلافت کی سرپرستی سے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ اور دوسری طرف صفوی خاندان کی ہمایوں کی امداد سے جو ایرانی بالادستی قائم ہو گئی تھی اس تعلق کو بھی ختم کر دیا۔ اور ہندوستانی حکومت کا مستقل خود مختاری کا جھنڈا لہرا دیا۔ بیرم خاں کا قتل اسی پالیسی کا شاخسانہ ہے، جس طرح ایشیا کو چک و یورپ میں ترکوں نے سلطنت عثمانیہ کو ایک بڑی طاقت کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اسی طرح اکبر اعظم نے ہندوستان کو ایشیا کی عظیم طاقت بنا دیا۔ اور متحدہ ہند کا جو خواب علاؤالدین خلجی نے دو سو سال پہلے دیکھا تھا اس کی تعبیر حاصل کر لی۔ اکبر نے ہندوستان کو ایک مستقل و خود مختار وحدت (یونٹ) کی حیثیت دے کر اس پالیسی کی ہندوستانیت یا آج کل کی زبان میں لامذہبیت پر رکھی حب الوطنی ایک انسانی قدر ہے اکبر کے خوشامدی مشیروں نے اس کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور اس کے ہاتھوں ایسے دین کی بنیاد رکھدی جس کا مرکز خود اکبر کی ذات تھی۔ اِس لیے اللہ اکبر اس دین کا خصوصی شعار رہا۔ جو اس کی انانیت کو تسکین بخش سکتا تھا۔ لیکن ہندوستان جو ہمیشہ مختلف مذاہب کا گہوارہ رہا ہے اکبر کا دین الٰہی اُن کے سچے پرستاروں کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا تھا۔ ابوالفضل اور فیضی جو ذہانت و خطابت اور چالاکی و ہوشیاری کے پتلے تھے انہوں نے بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ اسلام ہزار سال کو پہونچکر نعوذ باللہ اپنا مقصد معدوم کر چکا ہے۔ اب ہزار سال بعد صاحب قراں (خود اکبر) کا دور ہے اس لیے سارے مذاہب کا خلاصہ دین الٰہی

کو بنایا۔ جس کے اندر نہ اسلام کی کوئی حیثیت ہی رہ جاتی تھی اور نہ ہندو دھرم ہی باقی رہنا تھا۔ اس لیے اٹھارہ آدمیوں کے سوا کسی نے حامی نہیں بھری۔ نہ کسی مسلمان نے اس کو قبول کیا اور نہ کسی سچے ہندو نے اس کو مانا۔ وہ تو غنیمت ہوا یہ ہوا کہ اکبر نے اپنی نرم طبعی اور حکومتی سیاست کی وجہ سے زیادہ سختی اختیار نہیں کی ورنہ اسی وقت ملک کا شیرازہ بکھر جاتا ہمارا ملک روز اول سے مختلف مذہبوں، مختلف تہذیبوں اور مختلف قوموں کا ہمیشہ سے رنگا رنگ گلدستہ رہا ہے لیکن اس کثرت میں روحِ وحدت بھی ہمیشہ جلوہ گر رہی ہے۔ اس زبردست حقیقت کو ہمارے مورخوں نے پہلے دن سے ہی محسوس کر لیا ہے چنانچہ تیسری صدی کے مشہور جغرافیہ نگار مورخ مسعودی لکھتا ہے: "ہندوستان ایک وسیع و عریض رقبہ ہے اس کے اندر بڑے بڑے میدان۔ دریا اور پہاڑ ہیں۔ وہ ایک طرف خراسان (افغانستان) سے ملا ہوا ہے تو دوسری طرف تبت و چین کے ملکوں کے درمیان پہاڑوں کی حد فاصل ہے ان ملکوں کے درمیان لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کی زبانیں جدا جدا اور افکار و عقائد الگ الگ ہیں۔

علامہ صنعی لکھتا ہے "اہل ہند بلند افکار و خیالات اور بہترین احکام کے مالک رہتے ہیں حساب و ہندسہ طب و نجوم اور دوسرے طبعی و الٰہی علوم میں انھوں نے تحقیقات کیں ہندوستان کے کواکب کی تنظیم اور ان کی گردشوں کے بارے میں ان کے مخصوص خیالات ہیں۔"

یہ پرانے مورخین کے خیالات تھے۔ انیسویں ۱۹ صدی کے مورخ شیخ قاسم اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ "ہندستان ایک قوم نہیں ہے بلکہ یہ مجموعہ ہے مختلف قوموں کا تخیل، زبان، دین اور اپنی عادات کی بنا پر ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں" حقیقتاً ہمارا ہندوستان سدا بہار گلستان ہے۔ جو رنگا رنگ پھولوں اور پھلوں کی وجہ سے اپنی بہار ایک عالم کو دکھاتا رہا ہے اس گلستان کے ایک قطعہ میں گل و لالہ کے نقشے میں جو دامن نگاہ کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں تو دوسرے قطعہ میں نسرین و نسترن

کے نقشے ہیں جو بے حد دلفریب و نظر افروز ہیں۔ ایک طرف موتیا و بیلا اپنی خوشبو سے شام جہاں کو معطر کر رہے ہے تو دوسری طرف چمپا اپنی شمیم انگیزیوں سے روح کو مست بنا رہا ہے، رنگ و بو سے معمور اس چمن کی رنگینی و بہار آفرینی ہی اس کی رنگا رنگی میں مضمر ہے۔ اگر اس رنگا رنگ گلشن میں سے گل ولالہ، چمبیلی و جوہی رنگ کے تختوں کو اکھاڑ کر صرف ایک ہی رنگ کے تختے رہنے دئے جائیں تو چمنستان ہند اپنی بہار کھو بیٹھے گا۔

ہے رنگِ لالہ گل و نسرین جدا جدا ۔ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

بہر حال اکبرؔ کی دانشمندی یہ رہی کہ اس نے اس مذہب کو حکومت کی طاقت سے جاری نہیں کیا۔ اس کی رعایا پروری، انصاف پسندی، اور عظیم الشان فتوحات نے متحدہ ہند کے خواب کو واقعیت کی صورت دے دی۔

مسلم دورِ حکومت میں دینی تحریکات

اس سے پہلے کے مغل شہنشاہیت کے عہد زریں میں جو دینی تحریکات کشورِ ہند میں برپا ہوئیں ان کی تفصیلات پیش کی جائیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تاریخ کے اُتار چڑھاؤ اور ان اسباب و محرکات پر تمہیدی روشنی ڈالی جائے تاکہ جن حالات میں یہ تحریکات پیدا ہوئیں اور جس ماحول میں آگے بڑھیں وہ واقعات ناظرین کی نگاہوں کے سامنے آجائیں۔

اقوام عالم کا تاریخی مدوجزر

حیات انسانی کی طرح تاریخ انسانی بھی سمندر کی طرح ہے جس کی ظاہری سطح خوشنما د ہموار دل چسپ دل فریب نظر آتی ہے لیکن اس سطح کے نیچے متلاطم موجیں اور طوفانی لہریں پوشیدہ رہتی ہیں بقول عرفیؔ ؎

روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

چنانچہ جب کبھی سمندر کے نیچے کی سطح سے تلاطم انگیز موجیں اٹھتی اور طوفان خیز لہریں بکھرتی ہیں تو ہر طرف اُتھل پتھل پیدا ہو جاتی ہے کبھی سمندر کا ایک کنارہ موجوں کی تلاطم سے بلند ہو جاتا اور کبھی وہی کنارہ پست ہو جاتا ہے دنیا میں قوموں کی ترقی و تنزل کا یہی حال ہے کبھی ایک قوم ترقیوں کی چوٹیوں کو چھونے لگتی ہے اور پھر وہی قوم

تنزل کی پستیوں میں اتر جاتی ہے یہ کش مکش انقلاب کا دائمی عمل ہے اور پوری تاریخ عالم قوموں کے اسی اتار چڑھاؤ کا دوسرا نام ہے جیسا کہ لکھا جا چکا کہ تاریخ عالم کے ابتدائی دور میں ایشیا علم و ہنر کی مشرق تہذیب و تمدن کا مطلع و منبع تھا ضروریات زندگی کی ہر ایجاد صنعتِ بشری کا ہر کارنامہ اسی سرزمین سے طلوع ہوا چونکہ یہی خطہ انسانی آبادی کا پہلا مسکن یا پہلا ٹھکانا تھا لیکن جب دوآبہ دجلہ و فرات سے انسانی قافلوں نے مختلف علاقوں کا رخ کیا تو ہر علاقے کے مقامی ماحول اور موسمی احوال، کی بناء پر ضروریات زندگی کی گوناگونی اور ایجادات کی بوقلمونی نے رنگا رنگی پیدا کر دی اور ہر خطہ میں انسانی آبادی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اپنی حفاظت و مدافعت کے لیے نت نئے سروسامان اور ہتھیار ایجاد کرنے لگی پہلے ماحول سے مقابلہ پیرائی فطرت سے معرکہ آرائی ہوتی رہی لیکن تھوڑی ہی مدّت بعد خود انسانوں میں پیکار باہمی ایک دوسرے سے لڑائی کا میدان گرم ہو گیا ہر طاقت ور کمزور کو پیچھے ڈھکیلنے اور ہر کمزور گروہ بندی کر کے اپنی طاقت بڑھانے لگا پہلے علاقوں اور خطوں میں مقابلہ آرائی کا معاملہ تھا آگے چل کر ملکوں ملکوں میں جنگ و جدال قتل و قتال کی گرم بازاری شروع ہو گئی غالباً ابتداءً، زر اور زن کے لیے لڑائی تھی جیسا کہ قصّہ ہابیل و قابیل سے آشکارا ہوتا ہے لیکن آگے بڑھ کر زمین کے جھگڑوں نے اپنے پاؤں پھیلا دیئے وہ مادرِ گیتی (زمین) جو آدم کے بیٹوں کو اپنے آغوش و عاطفت میں لیے بیٹھی تھی ان بیٹوں نے اس کی پشت کو معرکہ کارزار یا جنگ و جدل کا اکھاڑا بنا دیا۔ آسمانی فرشتوں نے اس زمینی مخلوق کے جس اندیشہ کا اظہار کیا تھا وہ امر واقعہ بن گیا۔

مشرق و مغرب یا یورپ و ایشیاء کی جس باہمی آویزش اور معرکہ آرائیوں سے تاریخ بھری ہوئی ہے وہ اسی حقیقت کی غمگین داستان ہے یہ داستان صرف مشرق و مغرب ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں دہرائی گئی ہے ان طویل جنگوں کا بڑا حصّہ اقتدار پرستی اغراض پرستی اور خود پرستی کے ہاتھوں عمل میں آیا چونکہ اس نیک و بد کی دنیا میں نیک نفس انسانوں کے ساتھ شریر و بدفطرت لوگوں کی کمی

نہیں رہی جو اخلاق کریمانہ سے متاثر ہونے کے۔ بجائے طاقت ہی آگے جھکتے اور تلوار ہی کی زبان کو مانتے ہیں ان شرپسند عناصر اور فتنہ پرور افراد کی سرکوبی کے لیے تلوار کو نیام سے کبھی کبھی باہر لانا پڑتا ہے تاکہ ہر شخص کو آزادی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے اور خدا کی زمین میں خدا کا نام بلند ہو مادی اغراض سے جو جنگ پاک ہو اس کو اسلام نے مقدس جہاد سے موسوم کیا ہے اس کے تقدس کو قائم رکھنا اور پست اغراض سے پاک رکھنا یہ اہل مذاہب کا کام ہے ورنہ یہ جہاد ایک فتنہ فساد بن جائے گا بہرحال اس عالم خیر و شر میں جہاں فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ وہیں شیطان صفت مخلوق بھی ہے اس لیے شیطانی لشکر رحمانی لشکر روز ازل سے دونوں ساتھ ساتھ چلے آرہے ہیں اسلام نے چھٹی صدی ۶ئ میں جب پردۂ عالم پر قدم رکھا تو اس وقت دنیا کی ساری ہی قومیں طاقت و قوت کو معیار صداقت مانتی تھیں اسلام نے روز اول سے اس کا اعلان کیا کہ "حق" طاقت ہے "طاقت" حق نہیں ہے کلمہ توحید میں اسی حقیقت کا اقرار ہے اس اعلانِ حق سے باطل کے ایوان میں زلزلہ آگیا اور تہلکہ برپا ہوگیا سب سے پہلے تو خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم وطن وہم قوم اہل مکّہ آپ کے خلاف تلوار لے کر اٹھ کھڑے ہوئے پیغمبرؐ صلعم نے تشدد کا جواب عدم تشدد سے دیا تیرہ ۱۳ سالہ مکّی زندگی نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم یسوع مسیح کی طرح عدم تشدد کے راستہ پر چلتے رہے لیکن مکّہ والے تلوار اور تشدد کے زور پر اسلام کو آگے بڑھنے سے روکتے رہے تب پیغمبرؐ نے راہ ہجرت میں قدم رکھا لیکن پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے صحابہ کرام کو بے بال و پر بے بال وزر بے یار و مددگار اور بے وطن کر دینے پر بھی یہ طاقت کے پجاری مکہ والے چین سے نہ بیٹھے اور مدینے پر مسلسل یلغاریں کیں اس وقت قرآن نے مسلمانوں کی مظلومیت کی بنا پر جہاد و دفاع کی اجازت دی حکمت قرآنی نے جملہ مذہب کی آزادی اور ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کے لیے مقابلہ کرنے کا حکم دیا ترجمہ قرآنی اگر لوگوں میں ایک دوسرے سے مدافعت و مقابلہ نہ کیا جاتا تو یہود و نصاریٰ کی

عبادت گاہیں توڑ دی جائیں وہ مسجدیں جس میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے توڑ پھوڑ کر ویران کر دی جائیں (سورۃ الحج) عربوں سے نمٹنے کے بعد جب اسلام عجم میں پہونچا تو ایران و روما کی مہذب و تمدن حکومتوں نے بھی اسلام کو زور و طاقت سے دبانا اور تشدد سے ملیامیٹ کرنا چاہا جس کے لیے اسلام کو جوابی کارروائی کرنا پڑی لیکن متعصب و بد باطن مصنف آج تک یہی اعلان کرتے چلے آئے ہیں کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا بہرحال حق و باطل یا مغرب و مشرق کی کش مکش زمانہ قدیم سے ہے جس کے اندر اسلام سرخرو ہو کر نکلا چنانچہ پانچویں صدی ۱۱۰۰ء سے لے کر پندرھویں صدی ۱۶۰۰ء تک اسلامی تہذیب و تمدن کی معنوی پائیدار اقدار اور ظاہری نقش و نگار کی چمک دمک نے سب قوموں کی نگاہوں کو خیرہ کر رکھا تھا اگرچہ درمیان میں تاتاری فتنوں یا ہلاکو چنگیزی حملوں نے عالم اسلام کو زیر و زبر کر دیا لیکن اسلامی تہذیب نے عروس البلاد بغداد کے بعد قاہرہ (مصر)، بلخ و بخارا اور پھر لاہور و دہلی کو اپنا مرکز بنا لیا۔

ہندوستان ایک اسلامی مرکز

جیسے کہ پہلے لکھا جا چکا کہ جب قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش دہلی کے تخت پر بیٹھے تو انھوں نے خود مختاری کا علم بلند کیا اور دہلی (یعنی ہندوستان) اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکز کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا۔

ترک افغانی دور

اس دور کا آغاز چونکہ سرخیل صوفیہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی دعوت روحانی سے ہوا تھا خاندان غلامان کے بادشاہ اور بعد کے حکمراں شہنشاہ اور مسلمان عوام صوفیائے کرام کے حلقۂ اثر میں تھے اس لیے کوئی خاص اصلاحی تحریک نہیں پیدا ہوئی۔ اور روحانیت کے نورانی اثرات کی وجہ سے ملک کے تمام باشندے باہم شیر و شکر ہو کر رہتے رہے اگرچہ اس دور میں بھی اقتدار پرستی کی رسہ کشی برابر جاری رہی اور

حکومت وسلطنت کی ہوس نے باپ بیٹے چچا بھتیجے اور آقا و غلام کے درمیان مقابلہ آرائی یا ایک دوسرے سے ٹکراؤ کی صورتیں پیدا کیں۔

لیکن عام معاشرے کے نشو ونما اور ارتقاء نے صوفیاء کی تعلیمات کی بدولت ہمواری و استواری رہی بادشاہوں کی تبدیلیوں سے مسلم معاشرے میں کوئی ایسی زبردست تبدیلی رونما نہیں ہوئی کہ جس سے سماج میں عمومی بگاڑ پیدا ہوتا اسکی خاص وجہ یہی تھی کہ ان مادی بادشاہوں کے پہلو بہ پہلو روحانی بادشاہوں کا سکّہ چلتا رہا سلطان التمش، ناصر الدین محمود، جلال الدین خلجی، علاء الدین خلجی اور غیاث الدین بلبن کی حکومت کے ساتھ حضرت قطب الدین بختیار کاکی۔ بابا فرید الدین شکر گنج، خواجہ نظام الدین اولیاء حضرت علاء الدین علی احمد صابر جیسے نفوس قدسیہ کے روحانی اثرات عوام و خواص پر جلوہ فرما رہے۔

مشائخ چشت کی فتوحات

چوں کہ مشائخ چشت کی روحانی سلطنت عوام کے دلوں پر قائم تھی اور وہی ملک کے اصل فاتح تھے اس لیے کیا ہندو کیا مسلمان ان چشتی صوفیوں اور روحانی بزرگوں سے ان کی حق شناسی انسانیت دوستی کی بناء پر ہر ایک ان سے سچی محبت وانسیت رکھتا تھا ان چشتی مشائخ نے شروع ہی سے اپنے آپ کو عوام سے جوڑے رکھا اور حکومت کے دامن سے خود کو وابستہ نہ کیا بلکہ بسا اوقات مادی بادشاہت وروحانیت نے باہمی (جیسا کہ حضرت محبوب الٰہی اور خلجی بادشاہوں کے درمیان) بہ کش مکش رہی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اپنے دور کے سکندر علاء الدین خلجی کی دلی خواہش کے مطابق اس کا دائرہ اقتدار تبت و چین تک نہ پہونچ سکا مگر سلطان الاولیاء حضرت نظام الدین کی خانقاہ خانفو (چین) میں بھی قائم ہو گئی بہرحال عوام کی اکثریت ان بزرگوں کی درویشانہ عملی زندگی سے (جو پیغمبر اسلام اور صحابہ کرام کی زندگیوں کا نمونہ تھیں) اثر پذیر ہوتی اور ان کے نقوش قدم

سے روشنی حاصل کرتی تھی اس لیے اس دور میں کھلے بندوں فسق و فجور و بے حیائی کا، عمومی طور پر عام معاشرے میں عمل دخل نہ تھا لیکن جب تیموری ۱۳۹۸ء حملے نے مرکزی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا تو دارالسلطنت دہلی بھی ان با اثر روحانی بزرگوں سے خالی ہو گئی اور یہ مشائخ بھی مرکز کے ٹوٹ جانے کی بناء پر جو آسمانِ روحانیت کے چاند ستارے تھے مختلف علاقوں میں پھیل کر اپنی عرفانی روشنیوں کو ان خطوں میں بکھیرنے لگے قریب تھا کہ متحدہ ہند کا وہ خواب وہ پچھلے مسلمان بادشاہوں نے دیکھا تھا ادھورا رہ جائے اور ہندوستان کی تاریخ ماضی کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بکھر جائے کہ مغل برسرِ اقتدار آگئے ان سے پہلے شیر شاہ سوری نے حکومت کی بنیادوں پر پورے ملک کو ایک مرکز کے ماتحت منظم کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی مغلوں کو برسرِ اقتدار آنے کے بعد ان کا ان روحانی بزرگوں سے وہ رشتۂ عقیدت و عظمت باقی نہ رہا جو ترک افغان بادشاہوں کا ان کے ساتھ تھا۔

مغلوں کا دورِ حکومت

ظہیر الدین بابر جو مغل شہنشاہیت کا بانی ہے اور اس کا جانشین نصیر الدین ہمایوں یہ دونوں روحانیت سے زیادہ فنونِ لطیفہ کے عاشق و شیدا تھے ان کو حکومت چلانے کے لیے علماء و فقہاء کی ضرورت پڑی اور ان کے دور میں خشک جامد فقہاء کا زور تو ضرور بڑھا لیکن بزرگوں سے روحانی تعلق کمزور پڑ گیا۔ بدقسمتی سے جب شہنشاہ اکبر تختِ سلطنت پر بیٹھا تو حکومت میں ان ہی علماء کا زیادہ ہاتھ رہا۔ جو حُبِّ جاہ و حُبِّ مال کے جال میں گرفتار تھے اس لیے علمائے حق کے مقابلہ میں (جو دربار داری سے نفور تھے) علمائے سوء کا پلّہ بھاری ہو گیا اسلئے وہی اکبر بادشاہ جو اپنے بچپن میں مسجد کی جاروب کشی کو باعثِ سعادت سمجھتا تھا تختِ اقتدار پر فائز ہونے کے کچھ عرصہ بعد ان جاہ پرست علماء کی مجادلہ آرائی کو دیکھ کر اسلام سے بدگمان ہوتا چلا گیا اس کریلے پر نیم چڑھا یہ ہوا کہ ابوالفضل و فیضی جیسے ہوشیار و

وچالاک جو ذہانت کے پتلے اور عقل و دانش کے پیکر اور ان علمائے سوء کے تیغ ستم کے زخم خوردہ تھے انھوں نے اکبر جیسے امی و ناخواندہ بادشاہ کو اپنی ہوشمندی سے بوتل میں اتار لیا سب سے پہلے تو ان ہی علمائے وقت سے بادشاہ کے لیے منصب امامت و اجتہاد کے محضرنامے پر دستخط کراکے آزاد خیالی و بے راہ روی کے لیے ہتھیار مہیا کر دئے اور پھر دین الٰہی کے پردے میں ان جاہ پرست مولویوں سے ابوالفضلؔ فیضی نے ایسا زبردست انتقام لیا کہ ان علمائے ظاہری کی ظاہری عظمت خاک میں مل گئی۔

اکبر نے اپنی ملکی پالیسی میں ہندوستانیت کو ترجیح دے کر راجپوتوں کو آگے بڑھایا اور شاہی محل ان مہارانیوں کے عقائد و خیالات کا رنگ محل بن گیا چونکہ الناس علےٰ دین ملوکھم کے ماتحت عوام بادشاہوں کے طور طریق کے پیرو اور برسراقتدار لوگوں کی رسم و ریت کے اندھے مقلد ہوتے ہیں اس لیے ایک طرف بادشاہ کی تقلید میں مسلم معاشرے کے اندر فکر و خیال کی آوارگی اور عمل کی بے قیدی و بے راہ روی عام طور سے پھیلنے لگی اور دوسری طرف جھوٹے پیروں اور نقلی اور جعلی درویشوں نے وحدت الوجود کے نازک مسئلہ کی آڑ میں وہ کھیل کھیلے کہ مذہب چوں چوں کا مربہ اور عوام کی نفسیاتی خواہشات کا کھلونا بن کے رہ گیا۔ دین الٰہی کے پردے میں اباحیت پسندوں اور نفسانی خواہشات کے پجاریوں نے عوام میں یہ شوشہ چھوڑا کہ اسلام اپنی ہزار سالہ دعوت کو پورا کر چکا اب اکبری دور ہے جب تک تقلیدی دین کے دائرے سے باہر نکل کر عقلی و تحقیقی دین کو نہ اختیار کیا جائے "رازِ حقیقت نہیں کھلتا" ان خوشنما الفاظ کے پردے میں عوام کو ورغلانے بہکانے کا پورا پورا سامان چھپا ہوا ہے اس پرفریب و پرمکر شیطانی خیالات کی اصل حقیقت سے آگاہ کرنے اور اس پھیلی ہوئی گمراہی سے عوام کو نکالنے کے لیے حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کی پہلی دعوت تجدید برپا ہوئی جب کہ حکومتی سطح پر دین الٰہی کے فتنے نے اصل دین کو باطل عقائد و

افکار کے خلط ملط اور وسیع المشربی درواداری کے پردے نے دین کے اصل جوہر (توحید) کو ملحدانہ خیالات سے گڈمڈ کرنا چاہا، دوسری دعوت دینی کا تعلق حکومت مغلیہ کے دور زوال سے تھا جب کہ مرکزی حکومت کی کمزوری نے طوائف الملوکی پیدا کر کے منہ زور طاقتوں کو بے لگام کر کے ہندوستانی معاشرے کو خطرے کے کنارے پر لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

قدرت کا تجدیدی نظام

قدرت کا یہ تجدیدی و انقلابی نظام سارے عالم میں کارفرما ہے چمنستانِ عالم میں جب باد خزاں کے تھپیڑے ہر نخل و شجر کا رنگارنگ لباس اتار کر ان کو عریاں اور ننگا کر دیتے ہیں پت جھڑ کی تیز ہوائیں چمن کے گوشہ گوشہ میں خاک دھول اڑاتی ہیں تو فطرت نئی انگڑائی لے کر موسم بہار کا پیغام دیتی اور گلستاں کے ہر شاخ شجر کو عروسی لباس پہناتی اور گلشن کی ہر کیاری کو رنگین پھولوں کے گہنے سے آراستہ کر دیتی ہے اسی لیے کارخانۂ قدرت میں جہاں خزاں ہے وہیں بہار، جہاں انحطاط وزوال ہے وہیں عروج و کمال ہے چنانچہ قوموں کی زندگی میں انحطاط و زوال کے پہلو میں سے عروج و اقبال کو برآمد کرنا اسی قدرت کا عجیب و غریب کرشمہ ہے دین فطرت کے بہتے ہوئے دریا میں جو ازل سے ابد تک رواں دواں ہے جب ماحول کی آلودگیاں اور مقامی غیر شرعی رسمیں شریعت کے چشمۂ صافی کو گدلا کر دیتی ہیں تو قدرت ایسے مجدد مصلح و رہنما شخصیتوں کو پردہ عالم پر ظاہر کرتا ہے جو دین و شرع کو ہر طرح کی مقامی و بیرونی گندگیوں سے صاف کر دیتے اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر کے رکھ دیتے ہیں ہر ایک صدی پچھلے صدی سے مختلف حالات لے کر صفحۂ گیتی پر نمودار ہوتی اور وقت کے نئے تقاضے لے کر آتی ہے ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک قدر آور شخصیتوں کو قدرت پیدا کرتی ہے جو اپنے بہار آفریں انفاس سے مرجھائے ہوئے چمن میں نئی شگفتگی و تازگی و خزاں

رسیدہ گلشن کو حیات انگیز ہواؤں کے جھونکوں سے نئی زندگی عطا کرتے ہیں۔

حضرت مجددؒ کی اصلاحی دعوت

اسلام کے ہزار سال گذر جانے پر حضرت مجدد الف ثانی نے اپنی دعوت تجدید کو اصلاحی رنگ میں ظاہر فرمایا جس کو حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ایک مکتوب گرامی میں اس طرح ادا فرمایا ہے "اسلام پر ایک ہزار برس گذرنے کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے اس دور میں بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مثلاً قلب و روح اور ان کے سر کے احوال اجمالی صورت میں ظاہر ہوتے اور بعض اعتبارات سے پہلے فیوض مفصل طور پر رونما ہوتے مثلاً اس دور میں تجربت اور انانیت کبریٰ کے مسائل پہلے دوروں کے مقابل بڑی تفصیل سے بیان کئے جاتے ہیں اس دور کے ارباص شیخ مجدد ہیں اس دور کے بہت سے مخصوص معارف کو حضرت شیخ نے رمز و ایماء کی زبان میں ادا کیا وہ اس دور کے قطب ارشاد ہیں اور ان کے مبارک ہاتھوں سے بہت سی گمراہیاں کافور اور بہت سی بدعتیں دور ہوئیں فقیر شیخ مجدد کے بہت سے معارف کا جو موصوف نے اس دور کے فاتح کی حیثیت سے فرما چکے ہیں مصدق بنا (مکتوب بحوالہ تحریک ۱۰۸)

حضرت مجددؒ کا تجدیدی کارنامہ

حضرت مجدد قدس سرہ نے ایک طرف اسلام (توحید) کی سچی دعوت کو بیعت ارشاد کے ذریعہ عام کیا اور جو کچھ غلط عقائد و خیالات، باطل رسوم و روایات ہندوستان کے ماحولی اثرات سے مسلم معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر چکے تھے ان سب کو کاٹ چھانٹ کر دین کی اصل حقیقت کو نکھارا ان کے دور میں متصوفین نے وحدت الوجود کی غلط تعبیر سے عوام کو گمراہی میں مبتلا کر رکھا تھا اس کو وحدت الشہود کے روشن صاف شفاف نظریے سے واضح فرمایا وحدت الوجود کا خلاصہ ہمہ اوست (سب کچھ وہی ہے) اور وحدت الشہود کا نظریہ ہمہ از اوست (سب کچھ خدا کی طرف سے ہے) اور دوسری طرف

مجدّد صاحب نے اپنے مریدوں اہل علم اور ارباب حکومت کے مخصوص لوگوں کو مکتوبات شریفہ سے اصلاح کا نیا باب کھولا حکومت مغلیہ کے ارباب حل و عقد جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ان کو اپنے مکاتیب کے ذریعہ مخاطب بنایا جو حضرت کے مرید و معتقد تھے وہ آپ کے ارشاد و ہدایت سے اثر لیتے حکومت کے ذمہ داروں کے اندر اصلاحی لہر کے دلوں میں اتر جانے کی وجہ سے آہستہ آہستہ نظام حکومت میں درستگی پیدا ہوتی چلی گئی۔ اور کچھ مدت گذرنے نہ پائی تھی کہ نظام سلطنت کی کایا پلٹ ہوگئی کیونکہ جو دستور جو قوانین و احکام بالا ہی بالا صادر کئے جائیں اور ان کی پشت پر حکومت کی قوتِ عاملہ نہ ہو وہ کاغذی بن کے رہ جاتے ہیں اس لیے ہر سچے مذہب یا حقیقی دین میں ہر اصلاح کا سرچشمہ اندرون یا باطن سے شروع ہوتا ہے، مجدّد صاحب کی اس اصلاح باطنی نے اسلامی معاشرے کو صحیح راہ پر لگا دیا حضرت مجدد صاحب کے یہ مکتوبات گرامی جہاں ان کی مخلوق خدا کے ساتھ سچی دل سوزی اور انسانی ہمدردی کے جذبات کی آئینہ دار ہیں وہیں اپنے جاندار اور تازہ و شگفتہ اسلوب اور دل آویز طرز ادا کے اعتبار سے انشاء پردازی کے اعلیٰ نمونے ہیں۔ جو ایک درد مند دل سے نکلے ہیں اور خلوص و محبت کی چنگاریاں ان کے بین السطور میں چمکتی نظر آتی ہیں۔

حضرت مجدّدؒ کی آزمائش

حضرت مجدد صاحب کی یہ اصلاحی خدمات جو ہند و سندھ سے آگے بڑھ کر بلخ و بخارا تک پہونچ گئیں اور سلسلہ مجددیہ بیرونی ملکوں تک پھیل گیا اس خداداد مقبولیت نے کچھ خوشامدی درباریوں کے دلوں میں حسد کی آگ کو بھڑکا دیا اور انھوں نے حضرت کے خلاف بادشاہ کے کان بھر دیئے جس کی بناء پر شہنشاہ جہانگیر نے آپ کو دربار میں طلب فرمایا اور دربار کے رسوم و کورنش بجا نہ لانے پر خفا ہو کر اس مرد حقانی کو قلعہ گوالیار میں نظر بند کر دیا لیکن قلعہ گوالیار میں حضرت کے فیض صحبت سے اخلاقی مجرموں اور عام قیدیوں میں جو روحانی انقلاب برپا ہوا جہانگیر اس کو سن کر آپ کی ولایت کا

قائل ہو گیا جس کے جانشین شاہ جہاں اور عالمگیر جیسے ولی صفت اور متقی اور پرہیز گار بادشاہ ہوئے بہر حال مسلم معاشرے میں جو داخلی فتنہ گھس آیا تھا آپ کی دعوت تجدید سے اس کا قلع قمع ہو گیا اور مسلم سوسائٹی کی جو گاڑی پٹری سے اتر گئی تھی اس تجدیدی کارنامے نے اس کو لائن سے لگا دیا حضرت مجدد خدا کی طرف سے اس دعوت تجدید کے لیے نامزد کئے گئے تھے جیساکہ ایک مکتوب میں اس کی طرف اشارہ ہے ”مجھے ایک عظیم کارخانہ سپرد کیا گیا ہے صرف پیری مُریدی کے لیے مقرر نہیں کیا گیا میری تخلیق کا مقصد محض تکمیل وارشاد نہیں بلکہ اور معاملہ مقصود اور دوسرا کارخانہ مطلوب ہے“ (مکتوب نمبر ۶ دفتر دوم) اس مکتوب گرامی سے ہمارے موضوع پر بخوبی روشنی پڑتی ہے چونکہ حضرت مجدد صاحب کی دعوتِ حق نے اگرچہ فرنگی سامراج کا عمل دخل ہمارے ملک میں نہ ہو سکا تھا اسلئے کہ حضرت مجدد صاحبؒ کی ولادت ۹۷۱ھ ۱۵۶۵ء ہے۔

جب کہ اکبر اعظم کا دور تھا اور حضرت کے تجدیدی کارنامے کا تعلق عہد جہانگیری سے ہے لیکن اس سے پہلے ۱۴۹۸ء میں پرتگیزی سفیر واسکوڈی گاما مشہور عرب کپتان دریائی شیر ابن ماجد کی رہنمائی میں کالی کٹ کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہو چکا تھا اس وقت دہلی کے تخت پر لودھی خاندان کا آخری اور کمزور بادشاہ ابراہیم لودھی بیٹھا ہوا تھا واسکوڈی گاما کی آمد کا مقصد وہی سامراجی اغراض ہندوستانیوں کی قتل و غارت گری نسل کشی اور یہاں کی دولت کی لوٹ مار تھا جو ہسپانوی سامراج کے ہاتھوں امریکہ میں سرخ ہندوستانی د ریڈ انڈین نسل کے خاتمہ کی صورت میں نمودار ہوا۔ چوں کہ امریکہ کے اصل باشندے دَور وحشت سے گذر رہے تھے اس لیے اس کی نسل کشی میں ہسپانوی سامراج کامیاب ہوا اور امریکہ پر یورپ بلاشرکت غیر قابض ہو گیا مگر چوں کہ ہندوستان ایک ترقی یافتہ مہذب ملک تھا اس لیے یہاں پر استحصال یا ناجائز قبضے کے لیے فرنگی سامراج کو بہت زیادہ پاپڑ بیلنے پڑے۔

فرنگی سامراج کا داخلہ ہند میں

سب سے پہلے پرتگالیوں نے بحرِ ہند اور بحیرِ عرب کے سمندری امن کو غارت کیا
ان سمندری قزاقوں نے سمندر میں لوٹ مار مچا دی جس کی بناء پر اکبر کے درباری علماء
نے فریضۂ حج کے ساقط ہونے کا اعلان کر دیا تھا ایسے ماحول میں ایک سچے صوفی صافی پاک
باطن درویش کی زبان قلم سے ایک جملہ نکلا جو فرنگیوں کی طرف سے نفرت کا آئینہ دار ہے
مجدد صاحبؒ لکھتے ہیں " معرفتِ خدائے عز وجل بر آنکس حرام است کہ خود را از کافر
فرنگ بہتر داند ،، (مکتوب ۲۱۶) خدا کی سچی معرفت ہر اس شخص پر حرام ہے جو اپنے آپ کو فرنگی کافر
سے بہتر سمجھتا ہو گویا اس روشن ضمیر عارف کامل نے جس کا سینہ خدا اور اس کی مخلوق
کی محبت کا گنجینہ تھا فرنگی سامراج کی بد باطنی اور ظلم غارت گری کو اپنی مشام روحانیت
سے سونگھ لیا جب کہ تاریخ کا مغل اعظم (اکبر) ان لٹیروں کی چالاکی و مکاری سے متاثر ہو کر
عیسائی مذہب کی سچائی سننے کے لیے دربار میں ان کو اپنے برابر بیٹھا رہا تھا افسوس کہ
اس اکبرِ اعظم کی دور اندیشی نے نہ بحرِ ہند کی حفاظت کے لیے سمندری بیڑے کی ضرورت
محسوس کی اور نہ ان فرنگیوں کے مستقبل کے خطرناک عزائم ہی کو بھانپ سکا لیکن ایک
عارف باللہ نے آنے والی تباہی کو اپنے دیدۂ باطن سے دیکھ لیا حضرت کے اس فقرے نے
اس نفرت کی ترجمانی کر دی جس کی پرچھائیں اُن کے آئینۂ قلب پر پڑ رہی تھی فرنگی
سامراج سے نفرت کا یہی وہ بیج ہے جو مجدد صاحب کے جانشیں علمائے حق کی دلوں کی
سرزمین میں اُگا اور اس نے تن آور درخت بن کر فرنگیوں کے خلاف ایک محاذ قائم کرایا
بقول مولانا محمد میاں " یہی وہ نفرت ہے جو علماء کی میراث میں آئی ،، (تحریک شیخ الہند)
حضرت مجدد کے عہد میں یہ داخلی فتنہ ایک محدود معاشرے (مسلم) میں در آیا تھا جو آپکی
اصلاحی تحریک سے دب گیا لیکن شاہ ولی اللہ تک پہونچتے پہونچتے اس داخلی فتنہ سے زیادہ
خارجی فتنہ نے سر نکالا جو پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا اس
لیے ولی اللٰہی دعوت انقلاب کی گھن گرج کے ساتھ بروئے کار آئی جس نے زبردست

وسعت اور پھیلاؤ اختیار کیا اور جس کا تسلسل آج تک نہ ٹوٹا آج بھی پورے ملک بلکہ پوری انسانیت کو اس دعوت کی ضرورت ہے جیسے کہ اس وقت بھی بہرحال حضرت مجدد صاحبؒ نے جس اصلاحی دعوت کو جاری فرمایا تھا دعوت ولی اللہی نے اسکو انقلابی تحریک کا روپ دیا۔

دعوت ولی اللہی کا ظہور

حکیم الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی انقلابی تحریک کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے پس منظر کو روشنی میں لایا جائے اس بین الاقوامی اور عالمی تحریک کا تعارف اس لیے بھی ضروری ہے کہ ایک بین الاقوامی اور بین الانسانی تحریک جو ہمارے ملک کے دل (دلی) سے اٹھی اور شمال سے جنوب تک بلکہ بیرون ہند تک جس کی لہریں پھیلیں اور اس کے لیے ملک اور ملت کے جاں نثاروں نے عظیم سے عظیم قربانیاں دیں فرنگی سامراج کے خلاف علم جہاد بلند کرکے اسلام کے جاں نثاروں نے اپنے پاکیزہ خون سے سرزمین ہند کو لالہ زار بنایا جو اگر اپنوں کی غداری اور فرنگی سامراج کی مکاری و عیاری سے دوچار نہ ہوتی تو ایشیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا سامراجی مورخوں نے اپنے سامراجی اغراض فاسدہ کے ماتحت اس ولی اللہی دعوت کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا اور ان مجاہدوں کو مذہبی دیوانوں کا خطاب دیکر زبان لعن طعن دراز کیا ان سے تو شکوہ فضول ہے لیکن ہمارے قومی و ہندوستانی مورخوں سے بجا شکایت ہے کہ انھوں نے اس اہم عظیم تحریک صفحات تاریخ میں جگہ نہ دی۔

(۲) ولی اللہی دعوت کا تفصیلی تعارف اس موقع پر پیش کرنا ہمارے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کہ ریاست بھوپال آغاز کار سے اس دعوت سے وابستہ رہی۔

شاہ صاحب کی دعوت کے ظہور کا زمانہ ٹھیک وہی زمانہ تھا کہ جب کہ ریاست ہندوستان کے وسطانی خطہ (سنٹرل انڈیا) میں ایک طاقت بن کر ابھر رہی تھی بانی ریاست سردار دوست محمد خاں اور ان کے جانشین نواب یار محمد خاں

جو فقیر دوست اور علماء نواز رئیس تھے اپنی ہم قوم پٹھانوں کے ساتھ عالموں کی ایک جماعت کی سرپرستی میں ریاست کے دائرے کو وسیع کر رہے تھے سردار صاحب نے ابتداءً بیرسیہ کی متاجری کو حاصل کیا تھا جس کی منظوری برائے نام ہی سہی مرکز سے دی جاتی تھی اس لیے کہ سب کی نظر مرکز پر لگی رہتی تھی چنانچہ ولی اللہی تحریک کے پہلے امام شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو ہندوستان کے دارالحرب قرار دینے کی پاداش میں برطانوی سامراج کی ریشہ دوانی سے طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنایا گیا تو اس وقت چھوٹے خاں دیوان ریاست نے شاہ صاحبؒ کو بھوپال تشریف لانے کی معہ بارہ ہزار جاگیر کے دعوت دی تھی اگرچہ شاہ صاحبؒ کے قدم اس سرزمین میں نہ پڑ سکے لیکن ان کے مخصوص شاگردوں کے نقوش قدم سے یہ خطہ منوّر ہوا پھر کوئی ایسا دور نہ رہا کہ ریاست ولی اللہی دعوت کے علمبرداروں سے خالی رہی شاہ صاحبؒ کی یہ دینی و تعلیمی و اصلاحی دعوت وسط ہند کے اس علاقے میں خوب پھولی پھلی اور پھیلی دوسرے علاقوں کی طرح یہاں غیر شرعی رسوم و روایات اور بدعات اور خرافات کو کسی دور میں فروغ حاصل نہ ہو سکا اس لیے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے آخری شاگرد قطب زمانہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی اپنے مریدوں سے فرماتے تھے کہ ،، بھوپال کو اپنی دعائے خیر میں نہ بھولو،، بھوپال میں شاہ صاحبؒ کے کن کن شاگردوں نے ریاست کو اپنی علمی و عملی سرگرمیوں کا مرکز بنایا ان کا اجمالی تذکرہ آگے آرہا ہے۔

ہمارے نزدیک ولی اللہی دعوت کو تفصیلی انداز میں پیش کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس وقت مشرق و مغرب کی کش مکش یا مادیت و روحانیت کی معرکہ آرائی نقطۂ عروج پر پہونچ چکی ہے جیسا کہ گذر چکا کہ یوروپ کی اقوام پچھلی کئی صدیوں سے یونانی و رومی تہذیبوں کے دم توڑ دینے کے بعد ادبار و تنزل کی پستیوں میں گر کر وحشت و بربریت کی زندگی گزارتی رہی تھیں اور ایشیائی قومیں ترقی کے مدارج طے کرتی رہیں چھٹی صدی ۵۰۰ھ سے پندرھویں ۱۴۰۰ھ تک اسلام اپنی ہمہ جہتی دعوت و نظام کے ساتھ ایشیا افریقہ اور خود یوروپ تک اپنی قیادت کا جھنڈا لہراتا رہا۔ لیکن

سولھویں صدی میں جب صفحۂ ایام نے اپنا ورق الٹا تو قدرت کے قانون انقلاب کُلَّ یَوْمٍ ھُوَفِی شَأْنٍ کے ماتحت مغرب نے ترقی کی طرف قدم بڑھایا کیوں کہ خدا ہر دور میں نئی آن بان اور نئی شان کے ساتھ اپنی قدرت کو نمودار فرماتا ہے اور وہ خدا جو جہانوں کا پروردگار اور سارے جگ کا پالنہار ہے ہر قوم کو ترقی کا موقع دیتا ہے غرض یہ صدی مغرب کے عروج و اقبال اور مشرق کے انحطاط و زوال کو اپنے دامن میں لے کر آئی جب کہ یورپ نے جھوٹی عیسائیت کا لبادہ اتار پھینکا اور علم و عمل کے میدان میں ایسی اڑان بھری کہ وہی یوروپ جو کئی صدیوں سے اندھیریوں میں بھٹکتا ہوا گوشہ گمنامی میں پڑا ہوا تھا سترہویں اور اٹھارھویں صدی میں پہونچ کر عالمی قیادت کی سطح پر ابھر آیا اور اس نے ایشیا اور افریقہ میں اپنی قوت و عظمت کے جھنڈے گاڑ دیئے دنیا کی پچھلی ترقی یافتہ قوموں نے مغرب کے سائنسی و ترقیاتی کارناموں کے آگے گردن جھکا دی مغرب کی یہ ساری ترقی عیسائیت سے پیچھا چھڑانے سے عمل میں آئی اس لیے روحانیت کے برخلاف مادیت (میٹریزم Materlism) کا نظریہ بروئے کار لایا گیا جسکی بنیاد خدائی ہستی کے انکار پر رکھی گئی اس آسمانی رابطہ کے توڑ دینے سے انسانی زندگی میں خلاء پیدا ہوا اس خلاء کو زمینی (قومیت، وطنیت) کے رشتہ سے پُر کیا گیا جس کی پرانی جڑیں یونان کی قدیمی جمہوریوں (ایتھنز و اسپارٹا میں ملتی تھیں) میں موجود تھیں کچھ عرصہ میں مغرب میں وطنیت و قومیت نے روحانیت کے خانہ کو پر کر دیا قومیت و وطنیت کا یہ پودا یوروپ کی سرزمین میں اگا اس پودے کو آب و ہوا اور پوری غذا مادیت کے فلسفہ سے ملی جو روحانیت کے خلاء کی وجہ سے بہت جلد پنپ کر اپنے مضبوط تنے پر کھڑا ہو گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں برگ و بار لے آیا سب سے پہلے اس کی تلخ اور کڑوے پھل مغربی قوموں کو باہمی قومی جنگوں کی شکل میں چکھنا پڑا اس جارحانہ وطنیت نے فرانس و برطانیہ ہالینڈ و اسپین کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر دیا پھر اس نے جوع الارضی اور نوآبادیاتی پالیسی کی وجہ سے ایشیا و افریقہ کے خطوں پر دندان حرص و آز کو تیز کیا اور اپنے سامراجی مقاصد کے ماتحت ایشیا کی قوموں کو غلامی

کے شکنجے میں کس لیا اور ان علاقوں کو خام مال کی منڈیاں بنا کر یہاں کے باشندوں کا خون چوس چوس کر مغربی سامراج تنومند و قوی ہیکل اور طاقت ور بن گیا۔

یہ قومیت و وطنیت مغرب سے دساور ہو کر جب مشرق میں آئی تو اس نے ابتداءً حریت و آزادی کی ایک لہر ایشیائی قوموں میں دوڑا دی شروع شروع میں احیاء پرستی کی تحریکوں سے یہاں کے باشندوں میں جوش و خروش اور زور پیدا ہوا لیکن جنگ و جدل کا جو آتش فشاں اس کے پیٹ میں چھپا پڑا تھا وہ ان قوموں کے آزاد ہوتے سے پھٹ پڑا یہ نسلی و لسانی فتنے۔ جغرافیائی فسادات سب اسی کے شاخسانے ہیں فرنگی سامراج کی پالیسی کی وجہ سے اس کا لاوا پہلے سے مشرقی قوم میں پکتا رہا تھا بہر حال سولھویں صدی سے جس مادیت اور اس کے فلسفہ نے روحانی قدروں پر تابڑ توڑ حملہ کر کے اس کو دبایا اور مادیت کو ابھارا تھا اب وہ مادیت بیسویں صدی تک پہونچتے پہونچتے غیر مادیت (انرجی) کی فضا میں تحلیل و تبدیل ہو چکی ہے ـــــ انیسویں صدی میں سائنس حیات و کائنات کے جملہ گوشوں پر اپنا آخری فیصلہ کرنے کا مدعی بن کر میدان میں اترا تھا۔ بیسویں صدی میں اس نے اپنے مقام کو پہچان لیا ہے اور اپنے موضوع کو مشاہدات و تجربات تک محدود کر لیا ہے روحانیت کے نفی و اثبات پر حکم لگانا اب اس کے موضوع تحقیق سے باہر ہے۔

ہماری بیسویں صدی مادیت کے کمال کی آخری چوٹی ہے۔ جہاں سے اس کا زوال کے گڈھے میں گرنا یقینی ہے اس مادیت نے قومیت و وطنیت کے نظریئے کو ایک مستقل مذہب کی حیثیت دے دی مشرق حب الوطنی کا فطری جذبہ ہمیشہ سے رہا لیکن اس نے مذہب کی شکل اختیار نہیں کی ہمارے نزدیک قومیت کا نظریہ ایشیا کی سرزمین کی آب و ہوا کو راس نہ آیا اور وہ مذہب یا روحانیت کا بدل نہ ہو سکا کیوں کہ مشرقی اقوام کے مزاج میں روحانیت کی جڑیں گہری ہیں لیکن مغرب میں نیشلزم نے مذہب کی جگہ لے لی یوروپ کا یہ نیشلزم مادیت ہی کی پیداوار ہے جس نے یونان کے جمہوری نظام کے نمونے پر جمہوریت اور پیرانی

شہنشاہیت کے چربہ پر آمریت (ڈکٹیٹر شپ) کو جنم دیا یہ دونوں مادی نظام اس
صدی میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو کر جامۂ انسانیت کو تار تار کر رہے ہیں
دونوں نظاموں کے دعویداروں کے ہاتھوں میں ایٹمی طاقت کے آجانے کی وجہ سے
اس امر کا بجا طور پر اندیشہ کیا جارہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مخالفت کی جھنجلاہٹ
میں نادان بچوں کی طرح بالک ہٹ اور پھر راج ہٹ کے نتیجے میں ان مہلک ہتھیاروں
کو استعمال کر کے کہیں پوری انسانی تہذیب و تمدن کو خاکستر نہ کر دیں اس وقت کی
بڑی طاقتوں کی چھچھوری حرکتوں اور اوچھی پالیسیوں سے ثابت ہو رہا ہے کہ مادیت کے
دن پورے ہو چکے اس کے خیموں کے لدنے کا وقت قریب آچکا وہ انسانی زندگی کے
پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے بجائے آپس میں پنجہ آزما ہے جس قدرت کے قانون
نے چار صدیوں تک مغرب کو ساری دنیا کی سرداری بخشی تھی اب گیند ڈھلک کر
مشرق کی طرف آرہی ہے قدرت مادیت کے اندھیاریوں میں سے انسانیت کے نجات
کے لیے غیب کے اُفق سے روحانیت کے سورج کو طلوع کرنے کے حالات پیدا کر رہی ہے
مادیت کی کالی رات کے شکم سے روحانیت کی سحر ہویدا ہونے والی ہے چونکہ جو انسان
روحانی دولت (علم یقین) سے محروم ہو کر اور اپنے دل کو خوف خداوندی سے خالی
کر کے وحشت و حیوانیت کی طرف پلٹ رہا ہے اس کا مالک اس اشرف المخلوقات کو
اندھیرے میں نہ چھوڑے گا مادیت کے ضمیر میں سے ردعمل کے طور پر
روحانیت جلوہ گر ہو کر رہے گی اخلاقی قدروں کی گمشدگی سے انسان کا انسان سے
جو اعتماد اٹھتا جا رہا ہے وہ دوبارہ بحال ہوگا مشرق دوبارہ مغرب کو روشنی دکھائے
گا ہمارے نزدیک حکمت ولی اللہی میں انسانیت کی نجات کا راستہ اور اسکے مشکلات
کا حل موجود ہے اس لیے یہاں تفصیلی تعارف کرایا جارہا ہے لیکن اس سے پہلے
اس دعوت کے پس منظر کو پیش کرنا ضروری ہے۔

دعوتِ ولی اللّٰہی کا پس منظر

شاہ صاحبؒ کی اس تحریک کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب کہ برطانوی سامراج کھل کر میدان میں آچکا تھا اور اس نے پورے ایشیاء پر اپنی مکاری و عیاری کے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے تھے شاہ صاحبؒ جیسے ہمدرد انسانیت مفکر اور دور بیں دقیقہ رس مدبر کی نگاہ میں ایشیاء کی مستقبل کی تباہی کا نقشہ صاف نظر آرہا تھا۔

چونکہ فرنگی سامراج کا خارجی فتنہ بین الاقوامی انداز میں ایشیاء کے اندر ریشہ دوانیاں جاری کئے ہوئے تھا اس لیے اس کے توڑ کے لیے بھی ایک آفاقی (یونیورسل) اور بین الاقوامی (انٹرنیشنل) دعوت کی ضرورت تھی جس کا پس منظر یہ ہے ——

سترہویں صدی کے آخری دور میں مغل شہنشاہیت نقطۂ عروج پر پہونچ چکی تھی اور ہمارے ملک کے تہذیبی ارتقاء کا عمل درجہ کمال تک پہونچ چکا تھا عالم اسلام کے پرانے مرکز دمشقؔ و قاہرہ و بغدادؔ، اصفہان، بلخؔ و بخارا منگولیوں کے حملوں سے تباہ و برباد ہو چکے تھے دار الخلافت قسطنطنیہ کو چھوڑ کر یہ تمام مرکز زوال کا شکار ہو چکے تھے البتہ ہندوستان کا دار السلطنت دہلی اپنے عالیشان محلات سر سبز و ثمر دار باغات کے اعتبار سے پُر رونق خوب صورت و خوشنما و اصحاب فضل و کمال، ارباب علم و ہنر کا گہوارہ بنا ہوا تھا ہماری تاریخی و تحقیقی نگاہ میں اس وقت ہندوستان جنت نشان دنیا کی تین تہذیبوں کا سنگم بن گیا تھا ہندوستان کی قدیم آریائی تہذیب کی زمین پر اسلام کے ابتدائی عہد میں مسلمان عربوں نے اسلامی و قدیم سامی تہذیب کی بنیادوں کو اٹھایا جو اپنی فطری سادگی و رواداری اور ہر قسم کی تہذیبی خوبیوں کو اپنے اندر سمو لینے کی زبردست صلاحیت میں ممتاز تھی عربوں کی اس سامی و اسلامی تہذیب کے نقوش قائم ہونے کے بعد ترک افغان مسلم حکمرانوں نے ان بنیادوں پر اپنی تہذیب کی عالی شان عمارت قائم کی افغان آرٹ اپنے استحکام و پختگی اور مضبوطی میں شہرہ آفاق ہے آخر میں

جب مغل آئے تو وہ بھی اپنی تہذیب ساتھ لائے ہندوستان پہونچ کر انھوں نے ایک گنگا جمنی تحریک سے ہمارے ملک کو سنوارا اور نکھارا اور لطافت و نفاست کے حسین و جمیل نقوش اس سرزمین میں ثبت کئے یہ مغل آرٹ و کلچرل بہت جاندار و پائیدار ثابت ہوا اس لیے سترھویں صدی ہندوستان کی تہذیبی ارتقاء کی صدی ہے اکبر و جہانگیر، شاہ جہاں و عالم گیر کا زمانہ ہندوستان کا سنہری دور ہے۔ تینوں تہذیبوں کا یہ ارتقاء اس صدی کے آخر تک درجہ کمال تک پہونچ کر مائل بہ زوال ہوگیا چونکہ قانون قدرت کے مطابق ہر کمال کے لیے زوال لازمی ہے اکبر اعظم نے اپنی سلطنت کو ہندوستانیت کی بنیادوں پر اُٹھایا جہانگیر و شاہجہاں نے اس کے عالی شان محل کو مضبوط در و دیوار اور حسین و خوشنما گنبد و مینار سے سجایا اور اورنگزیب عالمگیر نے کنیا کماری سے افغانستان تک اس کو وسعت دیکر اور ایشیا کی عظیم سلطنت بنا کر شمال سے جنوب تک سب کو ایک کر دیا گویا متحدہ ہند کا جو خواب علاءالدین خلجی نے دیکھا تھا عالمگیر کے ہاتھوں اس کی تعبیر نکل آئی فرنگی سامراج نے دور اکبری کے اندر ہندوستان میں پہلا قدم رکھا اور اپنی شعبدہ بازیوں سے شہنشاہ کو اپنے جال میں پھانسنا چاہا لیکن جنوبی ہند کے کچھ ساحلی مقامات کے علاوہ ان کے قدم اور کہیں جم نہ سکے البتہ سر طامس رو سفیر انگلستان نے جہانگیر کے دربار میں تین سال رہ کر اعتماد پیدا کیا اور فرنگی ڈپلومیسی سے جہانگیر کے دل میں جگہ بنا کر سورت احمد نگر اور آگرہ میں کارخانے کھولنے کی اجازت حاصل کر لی پھر مشرقی ساحلوں پر تجارتی حقوق منوا کر ہگلی میں تجارتی دفتر کھول لیا شاہ جہاں کے دور میں سلطان شجاع کی مہربانی بنگال میں مال درآمد و برآمد کرنے کا فرمان حاصل کیا انگریز ڈاکٹر باٹن نے شاہ جہاں کے تقرب سے مزید تجارتی رعایتیں حاصل کر کے برطانوی سامراج کے داخلہ کا راستہ کھول دیا۔

اورنگ زیب نے تخت نشیں ہو کر اپنی باپ دادا کی رعایتوں کو برقرار رکھا لیکن اب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنے کل پُرزے نکالنا اور پاؤں پھیلانا شروع کر دیا تھا۔

اور اس شہنشاہ کے خلاف جس کو پچاس سالہ دورِ حکومت میں ایک جگہ بیٹھنا کبھی نہیں سیکھا اور جو متحدہ ہند کی تشکیل کے لیے جنوبی ہند کی شیعی ریاستوں سے مڈبھیڑ کرتا رہا اور جب تک مرکز کو مستحکم نہ بنا لیا اور پورے ملک کو متحد نہ کر لیا چین سے نہ بیٹھا اس عظیم مدبر و منتظم شہنشاہ کو کمپنی بہادر نے تین سال بعد ہی آنکھیں دکھانا شروع کر دیں چوں کہ انگلستان میں ہندوستانی دولت کی زبردست لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں ۱۶۸۳ء صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا اس لیے اس غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں انگریز گورنر بمبئی نے لکھا وہ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی تجارت کا انتظام تلوار لے کر اپنے ہاتھوں سے کریں (تاریخ ہند ص ۱۶۵) اس خود سرانہ سامراج پالیسی کے مطابق کمپنی نے ۱۶۸۶ء میں بمبئی و سورت وغیرہ سلطانی جہازوں کو گھیر کر (جو حاجیوں کو لے کر جدّہ جا رہے تھے) لوٹ لیا کمپنی بہادر اس کو بھول بیٹھی کہ دہلی کے تخت پر اورنگزیب جیسا منتظم و انصاف پسند بادشاہ بیٹھا ہوا ہے شہنشاہ نے اس مجرمانہ کارروائی پر کمپنی کو نہ صرف سخت سزا دی بلکہ غیر مشروط معافی نامہ شہنشاہ کے پیش کرنے کو کہا گیا۔ کمپنی کو اورنگزیب کے فرمان کے ماتحت نہ صرف جہاز چھوڑنا پڑے بلکہ نقصانات کا تاوان ڈیڑھ لاکھ روپیہ مزید ادا کرنا پڑا۔ آئندہ کے لیے ایسے اقدام سے معافی دیدی گئی تمام ضبط شدہ کوٹھیاں واپس کر دی گئیں اس ایک جھٹکے سے کمپنی کے ہوش و حواس ٹھکانے آگئے۔

برطانوی مورخوں نے اورنگزیب کے خلاف جو دل کے پھپولے پھوڑے ہیں اور اس مدبر اور منتظم و نیک نفس بادشاہ کو کٹر سُنّی حنفی کہہ کر دل کا بخار نکالا ہے اسی انتقامی ذہنیت کا شاخسانہ ہے ایسی ہی دکن کی شیعی حکومت کو ختم کر کے مرکز کے ماتحت لانے کی کارروائی پر شیعی مورخ بھی عالمگیر سے چراغ پا ہیں حالانکہ اس کے دادا اکبر و جہانگیر کو بھی شمالی ہند کی فتوحات کے بعد موقع ملتا تو وہ بھی یہ کارنمایاں انجام دیتے۔

ایرانی و تورانی آویزش

اس موقع پر ایک تاریخ کے طالب علم ہونے کے ناطے سے بادل خواستہ ایک ناگوار فرض انجام دینا پڑ رہا ہے جس نے تاریخ اسلام کو داغدار بنا دیا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک عظیم داخلی فتنہ عبداللہ بن سبا یہودی کا اٹھایا ہوا ہے جس نے اہل بیت کرام کی محبت کے پردے میں شیعیت کا چہرہ اختیار کیا اس سدابہار اندرونی فتنہ نے ملت کو جس قدر نقصان پہونچایا ہے سقوط بغداد کا سانحہ ہو یا سقوط دہلی کا حادثہ ہر جگہ اس کا ہاتھ نظر آئے گا حکومت مغلیہ کی تعمیر میں بھی تخریب کی صورت پنہاں تھی جب ہمایوں بادشاہ نے شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد صفوی ایرانی حکومت سے فتح ہند کے لیے امداد مانگی تو مشروط امداد دی گئی جس کے اندر وزیر اعظم کا شیعہ ہونا منوایا گیا بیرم خاں نمایندہ بن کر آیا لیکن اکبر اعظم نے اپنی حکمت عملی سے اس معاہدہ کو ختم کر دیا جہانگیر کے عہد میں ملکہ نور جہاں کے اقتدار میں آنے کی وجہ سے یہ سویا ہوا فتنہ پھر جاگ اٹھا اورنگزیب کی دور بین نگاہ نے ہندوستان کے مستقبل کو اس فتنہ سے پاک کرنے کا عزم کیا اس وقت شیعی سرگرمیوں کا مرکز گولکنڈہ تھا جس کا آخری بادشاہ ابوالحسن ناناشاہ ۱۰۹۸ھ میں گرفتار ہو کر قلعہ دولت آباد میں قید کر دیا گیا یہ امر محتاج بیاں نہیں کہ تاناشاہ کا لفظ کان میں پڑتے ہی مطلق العنانی اور عیش پرستی کا تصور ذہن میں آجاتا ہے اور ابوالحسن واقعتاً اس کا صحیح مصداق تھا چنانچہ غلام حسن شیعی مورخ نے عالمگیر کو اس سلسلہ میں طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ہے حالانکہ خود اس کی عبادت کا بین السطور اورنگ زیب کی عملی کارروائی کی صحت کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ عبارت یہ ہے "گولکنڈہ کے قلعہ کی مضبوطی سرزمین حیدرآباد کی خوبی اور اس کی آب و ہوا کی لطافت و خوشگواری کو کون کہاں تک بیان کرے وہاں کا بادشاہ لہو و لعب عیش و طرب میں اوروں سے زیادہ منہمک ہو گیا اس کی وجہ سے فسق و فجور کا

عام رواج ہوا عالم گیر بظاہر اپنے آپ کو اہل صلاح اور تارک دنیا کی شکل ظاہر کرتا تھا۔
حیدرآباد کو دارالجہاد قرار دیا وہاں کے باشندے تہہ تیغ کئے گئے اور شہر کو تباہ و برباد
کر دیا اصل میں عالم گیر کا مقصد ابوالحسن کے شہرۂ آفاق خزانوں کو ہتھیانا علمائے شیعہ
کا ختم کرنا اور عام مومنین کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنانا تھا (سیر المتاخرین)

ان مورخین کی برہمی کی وجہ پانچ شیعی حکومتوں کو فتح کر کے جنوبی ہند کو
مستقل طور سے شمال سے جوڑ دینے کا گناہ ہے جو عالم گیر سے سرزد ہوا وہ پانچ حکومتیں
یہ تھیں۔ (۱) سلطنت بہمنیہ بانی حسن گنگوہ بہمنی دارالحکومت گلبرگہ (۲) عادل شاہی
دارالحکومت بیجاپور (۳) قطب شاہی دارالحکومت گولکنڈہ (۴) برید شاہی دارالسلطنت
بیدر (۵) عماد شاہی دارالسلطنت ایلچپور (۶) وجے نگر کی ہندو حکومت فرنگی مؤرخوں
کی تقلید میں ہمارے ملکی مؤرخوں نے بھی اورنگ زیب کی مضبوط شخصیت اور اس کے
کردار پر گرد و غبار اڑایا ہے مورخ اسلام علامہ شبلیؒ نے فرمایا۔ ؎

تمہیں لے دیکے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالم گیر ہندوکش تھا ظالم تھا ستم گر تھا

اورنگزیب کی اصلی شخصیت

ہمارا قلم اس متحدہ ہند کے نقشہ میں عملی رنگ بھرنے والے اولوالعزم و بہادر
پاک باز درویش منش شہنشاہ کی اصلی و حقیقی شخصیت کی رونمائی کے لیے
مجبور ہے۔ جس کی شخصیت سے عام مؤرخوں کو خدا واسطے کا بیر رہا اور جنھوں نے
اس کی کردار کشی کر کے اصلی چہرے کو مسخ کر کے دکھایا ہے اور برطانوی سامراجی
مورخوں کے اڑائے ہوئے گرد و غبار نے اس عظیم کارناموں کو دبانے کی سعی کی
ہے درحقیقت اورنگزیب متحدہ ہند کا عظیم بادشاہ اعلیٰ درجہ کا فعال و منتظم
شہنشاہ تھا جس کے ناقابل شکست عزم و حوصلہ و غیر معمولی انتظامی صلاحیت نے
باپ بیٹے کی رو رعایت نہ کی اس لیے ملکی بغاوتوں کے فرو کرنے میں اس کی سخت گیری

کی زد میں باپ بھائیوں کی طرح کہیں کہیں برادران وطن بھی اس سختی کا شکار ہوئے خود اس کا حقیقی بیٹا ولی عہد بہادر شاہ اوّل عمر بھر کا پٹتا رہا لیکن جو کچھ ہوا مسلکی انتظامی مصالح کا تقاضہ تھا اکبر کے ساتھ اس کے بھائیوں نے اور شاہ جہاں نے اپنے باپ جہاں گیر کے ساتھ کیا کیا ہر تاریخ داں جانتا ہے لیکن مجرم فقط اورنگزیب ہی کو ٹھہرایا گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اورنگزیب نے اپنی ملکی و اقتصادی پالیسی اور سچی مذہبیت کے پیش نظر مغل شہنشاہیت کی پچھلی فضول خرچیوں کو بیکلخت ختم کر دیا اکبر اعظم کے زمانے کی بہت سی تعیش پسندانہ روایتوں اور خرافاتی فضول رسموں کو برسر اقتدار ہو کر بیک جنبش قدم مٹا دیا دربار شاہی میں شاعروں قصیدہ خوانوں کا ایک مستقل محکمہ تھا جس کے اندر ملک الشعراء کا بھی اہم عہدہ تھا ان کا کل کام بادشاہ کی بے جا تعریف و توصیف اور مبالغہ آمیز و خوشامد پرستانہ خیالات کے اظہار کے سوا کچھ نہ تھا ایسے ہی ارباب نشاط (رقص و سرود) کی مستقل فوج تھی جن کی حکومت مستقل پرستی کرتی تھی بادشاہ کی دیکھا دیکھی امراء رؤساء کی ڈیوڑیوں میں شراب و کباب طاؤس و رباب کی رنگین محفلیں پورے ملک کو عیش و عشرت اور غفلت کا گہوارہ بنائے ہوئے تھیں اورنگزیب نے ان فنونِ لطیفہ کو جواب فنونِ کثیفہ بن گئے تھے یک لخت ختم کر دیا۔

لیکن کیا اورنگزیب واقعتاً نرا مولوی فنون لطیفہ کے ذوق سے کورا، یا علم و ادب سے نابلد تھا اورنگزیب کی حقیقی سیرت اور اصلی صوانح عمری اس کی نفی کرتی ہے وہ ایک اعلیٰ درجہ کا نثر نگار (رقعات عالمگیری کا مصنف) بہترین قسم کا سخن سنج اور سخن فہم شاعر تھا جیسا کہ چندیری پانڈے نے اپنی کتاب "مغل بادشاہوں کی ہندی" میں لکھا ہے کہ ہندی سیکھنا ہر مغل بادشاہ کے لیے ضروری تھا چنانچہ برطانوی سامراج مورخین کی تاریخ پڑھنے والوں کے لیے یہ امر بحر حیرت میں ڈبو دینے والا ہوگا کہ اورنگزیب بھی کوی تھا اور وہ بھی ہندی کا کوی اس کی ایک رنگین کوینا

اپنی چہیتی بیوی اودے پوری بیگم کے لیے ہندی ادب میں موجود ہے اور جیسا کہ گُھلر صاحب نے تحقیقی طور پر ثابت کیا ہے کہ اورنگزیب ہندی شعراء کی بڑی عزت کرتا تھا ایک کوی جس کا نام برند تھا اس کو بادشاہ دس روپئے روزانہ دیتا تھا ایک ہندی کا شاعر دربار میں ہمیشہ عہدہ دار رہا جسے کوی رائے اور کوی راج کے خطاب سے نوازا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی اور برج بھاشا کے شاعروں نے اورنگزیب کی بہت تعریف کی ہے اور نگزیب ہندی کا زبر دست حمایتی تھا اس لیے ہندی کے فروغ و ترقی دینے کی برابر کوشش کرتا رہا اور نگزیب امیر خسرو کی ہندی کو یتا کا عاشق تھا خسرو کی "انمل اور کہہ مکرنیاں"، اسے ازبر تھیں۔ اپنی چہیتی بیگم اودے پوری کے ساتھ وہ اکثر خسرو کی بجھارتیں (پہیلیاں) حل کیا کرتا تھا (امیر خسرو اور مشترکہ کلچر ص ۸)

بہر حال اورنگزیب کا بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے خزانہ شاہی پر جو ناجائز بوجھ بڑھ رہا تھا اس کو کیوں ختم کیا۔ بھلا جو شخص اپنے ہاتھ سے قرآن لکھ کر اور ٹوپی بُن کر اپنا گزارہ کرتا ہو وہ شاہی خزانہ سے ایک پائی کا بھی روادار نہ ہو اور وہ متقی پرہیزگار بادشاہ جس نے مرتے وقت اپنا ترکہ کل سترہ روپے چار آنے چھوڑا ہو جو اس کے ہاتھ کی محنت کمائی تھیں وہ حکومت کی ان فضول خرچیوں کو کیونکر گوارہ کر سکتا تھا لیکن جہاں خرچ کی واقعی ضرورت ہوتی وہاں اس کا دست کرم کشادہ رہتا تھا جیساکہ ہندی شاعری کے سرپرستی کے سلسلے میں گزرا اور نگزیب کا اپنی ہندو رعایا کے ساتھ کیا معاملہ تھا اس کے لیے شمالی و جنوبی ہند کے مندروں، مٹھوں اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کے لیے معافیات اور جاگیرات کی اسناد کو دیکھا جائے تو اس سے اس کی بے تعصبی کا پتا چلتا ہے اکبر اعظم جیسے ہندوستانیت کو فروغ دینے والے بادشاہ سے اس کا عشر و عشیر (دسواں حصہ) بھی نہ ہو سکا چلتے چلتے چھترپتی شیواجی مہاراج کے قصے کو دیکھ لیا جائے شیواجی ابتداء سے بادشاہ کا باغی نہ تھا بلکہ

بلکہ دربار شاہی میں ایک وفادار سردار کی طرح ہفت ہزاری منصب کی دل میں توقع باندھ کر حاضر ہوا تھا دربار میں عزت کے ساتھ اس کو بٹھایا گیا لیکن شہنشاہ (اورنگزیب) نے ایک دم ہفت ہزاری دینا مصلحت ملکی کی بناء پر مناسب نہیں سمجھا سہ ہزاری منصب عطا کیا جس پر شیواجی روٹھ کر چلے گئے اور شہنشاہ سے چھپتے چھپتے پھرے سامنے آنے کی کبھی ہمت نہ ہوئی اس ناراضگی پر شیواجی مہاراج کو ہیرو بنا کر پیش کرنا کہاں تک مناسب ہے خود فیصلہ کر لیا جائے"۔

بہرحال اورنگزیب ہندوستان کو افغانستان سے لے کر کنیا کماری تک ایک کر کے اور متحدہ ہند کے خاکے میں عملی رنگ بھر کر اپنے خدا سے ۱۷۰۷ء میں جا ملا اور ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک کا بوجھ جو ایک چھوٹا برِاعظم ہے دکمزور اور ناخلف جانشینوں کے کمزور کاندھوں پر آ پڑا) جو اس کو اٹھا نہ سکے۔

برطانوی سامراج کی ریشہ دوانیاں

اٹھارہویں صدی ۱۸۰۰ء کا ابھی آغاز ہی ہوا تھا کہ محسوس ہونے لگا کہ وہ تمام سرکش طاقتیں (مرہٹہ، سکھ، جاٹ، اور مسلمان باغی سردار) جن کو اورنگزیب نے رعب داب کی بوتلوں میں بند کر لیا تھا اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس ڈانٹ کو توڑ تاڑ کے باہر نکل آئے اور ملک کی اتحاد اور سالمیت کو پارہ پارہ کرنے کیلئے پورے ملک میں دندنانے لگے اس افراتفری اور طوائف الملوکی سے برطانوی سامراج جو مشرقی ساحل (کلکتہ) میں دوربین لگائے ہوئے ملکی حالات کا جائزہ لے رہا اور دھیرے دھیرے اپنے قدم آگے بڑھا رہا اس کو اپنی سامراجی پالیسی کو بروئے کار لانے کے لیے بنا بنایا میدان مل گیا برطانوی سامراج کی ظلم و غارتگری اور توسیع پسندانہ پالیسی کی مذمت کرتے ہوئے ہم کو اس حقیقت کا بھی اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ہماری اندرونی خرابیاں اور باہمی خانہ جنگیاں ملک کی سیاسی و تہذیبی ملیت کی پہلے سے پرخچے اڑا رہی تھیں پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں

برطانوی سامراج سے ہندوستان کی شکست جو اپنوں کی غدّاری سے ہوئی تھی وہ ملکی حکمرانوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھیں لیکن اس پر بھی سب خواب غفلت میں مدہوش رہے سامراج کی اس ٹھوکر نے ان نیبند کے ماتوں کو نہ جگایا ان میں سے کسی نے بھی ہوا کے رُخ کو نہ پہچانا مرکز میں ایرانی و تورانی کش مکش بدستور رہی نادر شاہ اور ابدالی کے حملوں نے سلطنت مغلیہ کے مضبوط قلعوں کی بنیادوں کو ہلا دیا پھر مرہٹہ گردی جاٹ گردی نے اس کے در و دیوار میں شگاف ڈال کر بیرونی طاقت کے لیے راستہ کھول دیا یا تو مرکزی حکومت کی مضبوطی کا یہ حال تھا کہ ڈیڑھ سو سال (۱۵۲۶ء تا ۱۷۰۷ء) چار عظیم حکمرانوں کو پروان چڑھایا۔ جب اس کے اندر ضعف و کمزوری در آئی تو پچاس سال ۱۸۰۹ء تا ۱۸۵۷ء کے اندر دس حکمراں یکے بعد دیگرے تخت سلطنت پر اٹھائے اور بٹھائے گئے بادشاہ گر امراء کے ہاتھ میں اکبر و عالمگیر کے وارث کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء کے بعد جب ۱۷۶۴ء بکسر کے اندر برطانوی سامراج اور ہندوستانیوں کے درمیان جنگ ہوئی تو اس نے ملکی قسمت کا فیصلہ کر دیا کیوں کہ اس مہم میں بنگال کے میر قاسم اودھ کے شجاع الدولہ نے شاہ عالم ثانی کے ساتھ شامل ہو کر متحدہ طور پر مقابلہ کیا تھا اس شکست نے انگریز کی عسکری برتری کو ثابت کر دیا اور شکست کے نتیجہ میں شاہِ عالم ثانی انگریزوں کے قبضہ میں آگیا اور ایک معاہدے کے ماتحت تمام قلم رو کی نظامت کمپنی کے ہاتھ آگئی بادشاہ کی حکومت دہلی کی چہار دیواری تک محصور ہو گئی اگرچہ ضابطہ میں کمپنی باجگزار بن گئی لیکن عملاً یہ قرار پایا جس کی ڈونڈ پیٹی ڈ خلق خدا کی ، ملک بادشاہ کا ، اور حکم انگریز بہادر کا ، یہی وہ زمانہ ہے جب کہ دہلی کے ایک علمی گھرانے سے ایک ہمدرد خلق درویش صوفی

خدا پرست عالم نے اپنی انقلابی تحریک کا آغاز کیا یہ تھے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ دھلوی۔ ؎

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

خدا پرست عالم نے اپنی انقلابی تحریک کا آغاز کیا یہ تھے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ
زباں پہ بار خدایا کس کا نام آیا۔ کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیئے

شاہ ولی اللہؒ کا تعارف

ہمارا ملک ہندوستان مغلیہ سلطنت کے نقطہ عروج پر پہونچ جانے کے بعد جب انحطاط و زوال کی طرف مائل ہو رہا تھا اور ملکی سیاست ایک نئے انقلاب سے دوچار ہونے والی تھی اس وقت دہلی کے ایک علمی و روحانی خاندان میں چار شوال ۱۱۱۴ھ مطابق ۱۰ فروری ۱۷۰۳ء میں شاہ ولی اللہ جلوہ افروز ہوئے ان کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم دہلوی ایک مردِ درویش اور بلند پایہ عالم و فاضل بزرگ تھے جب شاہ صاحب پیدا ہوئے اس وقت عالمگیر اعظم کا آفتاب اقبال دکن کی وادیوں میں اپنی آخری سنہری شعاعیں بکھیر رہا تھا لیکن جب ان کی ہوش و شعور کی آنکھیں کھلیں تو وہ سورج غروب ہو چکا تھا مگر سورج ڈوب جانے کے بعد بھی کچھ مدت تک شفق کے پردے میں اپنی گلنار و نارنگی روشنیوں سے افق کو روشن رکھتا ہے اسی لیے عالمگیر کے ولی عہد و جانشیں بہادر شاہ اول کے پنج سالہ دورِ حکومت میں نظام سلطنت اسی طرح قائم و برقرار رہا لیکن بہادر شاہ کے بعد مغل شہنشاہیت کو رات کی اندھیریوں نے گھیر لیا اور فروخ سیر بادشاہ یا محمد شاہ رنگیلے کو تھوڑی سی مدت کے علاوہ کسی بادشاہ کو بھی اپنے اختیارات نافذ کرنے کا موقع نہ مل سکا شاہ صاحبؒ عالمگیرؒ کے انتقال ۱۷۰۹ء کے چار پانچ سال پہلے پیدا ہوئے اور شاہ عالم ثانی کے عہد ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء میں انتقال فرمایا جس طرح امیر خسرو دہلوی نے اپنی مختصر زندگی میں سات بادشاہوں کا عروج و زوال نظرِ حقیقت نگر سے دیکھا اس دور کے معاشرے کے احوال کی ترجمانی شاعری

کی زبان میں کی اسی طرح شاہ صاحب نے اپنے دور انحطاط میں شاہجہاں کے تخت طاؤس پردس حکمرانوں کو عبرت بین نگاہوں سے چڑھتے اور اترتے دیکھا جن میں صرف چار بادشاہ اپنی موت سے مرے ورنہ کسی کو تخت سے تختہ پر لٹکایا گیا کسی کو جیل خانہ میں موت کے گھاٹ اتارا گیا اور کسی کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر جیتے جی اندھا کر دیا گیا وہ بادشاہ یہ ہیں بہادر شاہ اول، معزالدین شاہ، جہاندار شاہ، فروخ سیر، رفیع الدرجات رفیع الدولہ، محمد شاہ (رنگیلے) احمد شاہ عالمگیر ثانی شاہ عالم ثانی۔ ان بادشاہوں کے عبرت ناک حالات شاہ صاحب کی آنکھوں کے سامنے گذرے تاریخ ہند کا یہ دور ہولناک اور بھیانک دور تھا سادات بارہ کا نظام حکومت پر غلبہ و تسلط، فروخ سیر بادشاہ کا ان کے ہاتھوں بے دردانہ قتل، مرہٹوں کا دہلی میں فاتحانہ داخلہ ۱۷۳۶ء نادر شاہ کی تین دن تک دہلی میں خونریزی ۱۷۳۷ء احمد شاہ ابدالی کی پانی پت کی معرکہ آرائی ۱۷۴۷ء سورج مل جاٹ کی لوٹ مار اور غارتگری ۱۷۵۲ء ایرانی تورانی آویزش اور پھر فرنگی سامراج کا بہار و بنگال میں غاصبانہ عمل دخل ۱۷۵۷ء یہ سارے واقعات کے دھارے ہندوستانی سیاست میں ان کے سامنے سے گذرتے رہے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم علوم معقول و منقول کے ماہر و فاضل تھے ایک طرف فتاویٰ عالمگیری کے ترتیب دینے والے بورڈ کے اہم رکن تھے دوسری طرف مشہور معقول علامہ میر زاہد کے براہِ راست شاگرد تھے شاہ صاحبؒ کی عبقریت وذہانت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے پندرہ ہویں سال نہ صرف جملہ عقلی و نقلی علوم کی تکمیل فرمائی بلکہ تکمیل باطنی نقشبندی طریقہ پر کراکے والد ماجد نے علماء، فضلاء، کی موجودگی میں مسند درس پر بٹھادیا اور سب نے ان کے کمال علم و فن پر مہر تصدیق ثبت کی اس کے بعد بارہ برس تک ان علوم و فنون کے درس کا ہنگامہ برپا کیا اور ہر علم پر غور وفکر جاری رکھا (القول الجلی ص ۳۶)

شاہ صاحبؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں اپنے زمانے کی تحقیق علمی کے سلسلے میں تین چیزوں کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے۔ (۱) برہان جس کا ایک شعبہ حکمت عملی ہے

جس کے ذریعہ قرآنِ حکیم کے نئے معجزہ کا نیا باب کھولا ہے (۲) وجدان یا اشراق وکشف ان کے زمانے میں باکمال صوفیار جیسے مرزا مظہر جانِ جاناں وغیرہ کا عوام وخواص پر زبردست اثر تھا (۳) اسلامی تعلیمات کے اصل ماخذ قرآن وسنت ہمارے ملک میں جامد وخشک فقہار کے نظامِ حکومت میں غلبہ کی وجہ سے اس کی طرف سے بے توجہی ہوگئی تھی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے پہلے سلسلہ حدیث کو جاری کیا پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے قرآن وسنت کی اشاعت کو اس طرح عام فرمایا کہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے فضائیں گونج اٹھیں یہی آپ کا تجدیدی کارنامہ ہے شاہ صاحبؒ ۱۱۴۳ھ حجاز مقدس تشریف لے گئے اور دو سال قیام کر کے حدیث کی سند لے کر آئے انہوں نے مکہ مکرمہ میں بیٹھ کر ایشیا، وافریقہ اور دیگر ممالک کے حاجیوں سے ان ممالک کے ہر طرح کے احوال معلوم کیے ترکی خلافت (جو یورپ ایشیا، کی عظیم سلطنت تھی) اس کا بھی جائزہ لیا چنانچہ لکھتے ہیں احوال ہند بر ما مخفی نیست بلادِ عرب نیز دیدیم و احوال مردم ولایت از ثقات ایں جا شنیدیم یعنی ہندوستان کے حالات ہم پر اس لیے مخفی نہیں ہے کہ وہ فقیر کا وطن ہے اور عرب ممالک بھی ہم نے دیکھا ہے اور دوسرے ملکوں (یورپ وغیرہ کے احوال معتبر لوگوں سے سُنے ان احوال وکوائف کا غور وفکر سے مطالعہ کرنے کے بعد ان کی فکر ملک پیما) اور ذہنِ رسا نے ایک صحیح فیصلہ کیا وہ ایک حکیم وفیلسوف، ایک روشن ضمیر صوفی اور ہمدرد خلق مردان خدا میں تھے جن کو قدرت نے روزِ ازل سے ایک دردمند دل ایک حقیقت آشنا نگاہ عطا فرمائی تھی انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ معاشرہ وسلطنت کی جملہ خرابیوں کی جڑ بنیاد وہ نظام ملوکیت ہے جو اپنی افادیت کے دن ختم کر چکا ہے فیوض الحرمین میں اپنا طویل خواب ۱۱۴۴ھ کا تحریر کیا ہے سالونی ماذا حکم اللہ فی ھٰذہٖ الساعۃ قلتُ فک کل نظام قالوا الی متٰی قلتُ الی تروني فسکنتُ (رسالہ محمودیہ بحوالہ تحریک ص ۴۳)

کارکنان قضا وقدر نے مجھ سے پوچھا کہ اس وقت خدا کا کیا فیصلہ ہے تو میں نے جواب دیا کہ موجودہ ہر نظام کا خاتمہ شاہ صاحبؒ نے حج سے واپس ہو کر پانچویں

سال ترجمہ قرآن بنام فتح الرحمٰن کیا جس پر پیشہ ور مولویوں نے ان کے خلاف ایک محاذ بنایا اور گیارہ سال بعد قرآنی تعلیمات کو انقلابی پروگرام کے ساتھ شروع کیا بارہ برس بعد اپنی دعوت کا آغاز فرمایا جس کے اصل الاصول دو قرار دیئے۔ (۱) قرآن کی حکمت عملی کی تعلیم (۲) حیات اجتماعی یا معاشرات انسانی میں اقتصادی توازن مساوات کا قیام کیونکہ ہندوستان بلکہ پورا ایشیا اس وقت جس خطرناک بیماری میں مبتلا تھا اس کے لیے یہی نسخہ شفا درکار تھا اس لیے اس ماحول کی پردہ کشائی ضروری ہے جس کے اندر ولی اللٰہی دعوت برپا ہوئی۔

ولی اللٰہی دعوت کا ماحول

حضرت شاہ صاحبؒ نے جب ہوش لیا اس وقت مغل شہنشاہیت کا عالی شان محل اپنے بظاہر بلند و بالا بنیادوں، مضبوط پختہ دیواروں کے ساتھ اپنی خستگی اور اندر ہی اندر کمزوری کی وجہ سے زمین پر آ رہا تھا جس فوجی و جاگیردارانہ نظام کی دیواروں پر شہنشاہیت کی تعمیر ہوئی تھی وہ پرانی بوسیدہ ہو کر گرا چاہتی تھیں مرکز کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے ہر طاقت ور امیر و جاگیردار اور فوجی سپہ سالار اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجد بنانے میں لگا ہوا تھا اس داخلی کمزوری کو بھانپ کر کمپنی بہادر کے کارندوں نے ۱۶۹۸ء میں بنگال کے تین مقامات پر زمینداری کے حقوق حاصل کر کے کالی گھاٹ کو سامراج کی توسیع کے لیے ایک مضبوط فوجی مرکز بنا کر پورے ملک کو اپنے جال میں جکڑنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا یہی کالی گھاٹ بعد میں کلکتہ کے نام سے برطانوی شہنشاہیت کا پہلا قلعہ و راجدھانی بنا حضرت شاہ صاحبؒ کی عقابی نظر یا ان کی چشم باطن نے اس امر کو دیکھ لیا کہ مغل شہنشاہیت دم توڑ چکی ہے احمد شاہ ابدالی کے حملے ۱۷۶۱ء کے ذریعہ جو طاقت کا انجکشن دیا تھا اور مرکزی مضبوطی کا جو نقشہ تجویز کیا تھا وہ فائدہ مند ثابت نہ ہوا گویا جاگیردارانہ نظام آج کل کی زبان میں سرمایہ دارانہ نظام کے لیے جگہ خالی کر رہا تھا جو شہنشاہیت پچھلے دور میں غریب

ومتوسط طبقہ کے لوگوں کے آنسو پونچھتی رہتی تھی اس کی تمام دولت آہستہ آہستہ کھسکتی ہوتی چند افراد (سرمایہ داروں) کی مٹھی میں سمٹتی جارہی ہے بدیشی سامراج اپنے جدید سرمایہ دارانہ نظام کے بل بوتے پر اپنے مرکز (کلکتہ) سے آگے پاؤں پھیلاتا ہوا پورے ملک کو اپنے پاؤں تلے کچلنے کے لیے اور اس پر یکہ وتنہا قبضہ جمانے کے لیے آگے بڑھ رہا ہے۔ بنگال کے زمینداروں نے بدیشی سامراجوں کی پشت پناہی مل جانے کی وجہ سے وہاں کے مزدوروں اور نیچے درجے کے کاشتکاروں کو سرمایہ داری کے شکنجے میں کسنے کا عمل شروع کردیا تھا جس کا مقابلہ کرنے کے لیے مولویوں کی فرائضی تحریک نے زور باندھا اور الارض للہ کا قرآنی نعرہ بلند کیا کہ تمام زمین خدا کی ملکیت ہے۔ اگرچہ ابھی تک صنعتی نظام کے زیادہ پھیلاؤ نہ ہونے کی وجہ سے طبقاتی کشمکش معاشی میدانوں میں نہ ظاہر ہوئی تھی لیکن بہرحال ایسٹ انڈیا کمپنی نے کارخانوں کی بنیاد رکھدی تھی گویا صنعتی دور کے دہلیز پر ہندوستان نے قدم رکھدیا تھا شاہ صاحبؒ کی فراست ایمانی نے اس پیدا ہونے والی طبقاتی کشمکش کو باطنی نگاہ سے دیکھ لیا جو آگے چل کر مشرق کی روحانی قدروں پر حملہ آور ہونے والی اور پوری انسانیت کو طبقاتی جنگ کی ابدی جہنم میں ڈھکیلنے والی تھی مغرب کا لایا ہوا یہ خوفناک فتنہ (جو صنعتی دور کی پیداوار تھا) یورپ میں جابر وظالم شہنشاہیت کے مقابلے میں وہاں کے مظلوم وستم رسیدہ غریب مخلوق اور عوام میں پھیل چکا تھا سینٹ پال کی جھوٹی عیسائیت نے علم وتحقیق کے شیدائیوں سائنسدانوں کو اپنے مظالم کا نشانہ بنا رکھا تھا اور ظالم شہنشاہیت کی اس جھوٹے مذہب نے پوری پوری پشت پناہی کی تھی مغرب کے اس صنعتی انقلاب نے اس کے جواب میں مذہب وروحانیت کو حیات انسانی کی رہنمائی کے خلاف ایک دائمی جنگ کی بنیاد ڈالدی اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ نے اس خوفناک فتنہ کے سرچشمہ پر اُبلنے سے پہلے اس پر بند باندھنا چاہا تاکہ انسانی زندگی جنگ وجدال تباہی وبربادی کے سیلاب میں بہہ نہ جائے اور انسانیت اپنے جوہر نورانی (ایمان ویقین) سے محروم نہ ہو جائے شاہ صاحبؒ

نے دین کے مادی روحانی اخلاقی و معاشی پہلوؤں کو قرآن و سنت کی روشنی میں اس طرح پیش کیا کہ وہ انسانی زندگی کی جسمانی روحانی ظاہری و باطنی ضرورتوں کی تکمیل کر سکے۔

چونکہ یورپ کے کلیسائی نظام نے وہاں کے غریب، مفلس، مظلوم عوام کے لیے ایک قاتل اور سفاک نظام کے ساتھ تعاون کا کردار کیا تھا ایک طرف عوام کو مذہب کے نام پر یسوع مسیح کے صلیب پر چڑھ جانے کو سب کے گناہوں کے لیے کفارہ بن جانے کا باطل عقیدہ دلوں میں بٹھایا اور اس باطل عقیدہ سے نجات کی افیون پلائی تھی دوسری طرف ظالم بادشاہوں جابر زمینداروں کے ظلم و ستم میں ان کے ہاتھوں کو مضبوط کیا تھا اس لیے نہ صرف عیسائیت بلکہ نفس مذہب کے خلاف نفرت کے جذبات عوام کے دلوں میں سلگ اٹھے اس مذہبی نفرت و عداوت کی بھٹی میں تپ کر جس فلسفہ نے جنم لیا اس نے مذہب ہی کو اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا۔

انیسویں صدی کی مادیت

انیسویں صدی مادیت کو لے کر آئی اس نے زندگی کو عمل و ردعمل کی جدلیاتی منطق کے روپ میں پیش کیا جس نے اس عالم کو ایک مستقل رزم گاہ یا میدان جنگ بنا کر رکھ دیا ڈارون کا فلسفہ ارتقا عقلی و تجرباتی حقیقت یا فلسفہ و سائنس کی حقیقت رسی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے نظریے سے زیادہ اسی جذباتی و نفسیاتی ردعمل کا شاخسانہ ہے اس لیے یہ فلسفہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا مؤید بن کر نمودار ہوا جس کے نتیجے میں رسوائے عالم مصنف میکیاولی نے اپنی کتاب کے اندر سیاست میں اخلاقی اصولوں کو بالائے طاق رکھ دینے کی تعلیم دے کر بے ایمانی کو فروغ دیا اور انسانیت پر سے اعتماد و اعتبار کو ختم کر دیا اس فلسفہ نے آغاز ہی سے کمزور اقوام کا استحصال نو آبادیاتی نظام، غریبوں کے حقوق پر ناجائز تسلط خصوصیت سے ایشیائی ممالک کی پسماندگی سے ناجائز فائدہ اٹھانے اور جنگ زرگری برپا کرنے کو اپنا نصب العین بنایا جس کی وجہ سے دو بار انسانیت جہنم کی بھٹی میں جھونکی جا چکی ہے پہلی جنگ

نظیم ۱۹۱۴ء اور جنگِ عالمگیر ۱۹۳۷ء کی بربادیوں و ہلاکت سامانیوں کی داستانیں ذہنوں میں اب بھی تازہ ہیں اور اب بھی ایشیائی ملکوں کی آزادی کے بعد مغربی سامراج نے اپنے اقتصادی و معاشی جال کو دراز کر کے ترقی پذیر اقوام کو نت نئے حملوں اور فتنوں کا شکار بنا رکھا ہے اس مادی فلسفہ کے حامی جملہ مشرقی ممالک کے ہتھیاروں کے بیوپاری بن کر عالمی امن کو برباد کر کے انسانیت کی رفاہیت اور خوشحالی کو تباہ کرنے کے درپے ہیں حالانکہ تخلیقی ارتقاء کا تصور مشرق میں معرفت آفریں اور حیات بخش رہا ہے نظریہ ارتقاء کا آغاز مشرق ہی سے ہوا ہے عرب کے مشہور مورخ و جغرافی علامہ مسعودی نے تخلیق کائنات کے سلسلہ کو تدریجی بنایا ہے کہ کائنات میں پہلے جمادات پھر نباتات اس کے بعد حیوانات کا ظہور رہا اور آخر میں اشرف المخلوقات یعنی انسان خلیفۃ الرحمٰن بن کر جلوہ گر ہوا (مروج الذہب)

علامہ ابن مسکویہ نے اپنی کتاب الفوز الاصغر میں اس تخلیقی ارتقاء کو دلائل سے ثابت کیا ہے مولانا روم نے بھی اپنی مثنوی میں اور دیگر حکمائے اسلام نے بھی اس طرف اشارے کئے ہیں لیکن یہ تخلیقی ارتقاء خدا کی شانِ ربوبیت کے جلوؤں کا انعکاس اور اس کے ایمان آفریں رنگارنگ مظاہر کی تفسیر و توضیح ہے جس سے معرفت کے روحانیت کے چمکارے دمکتے ہوئے نظر آتے ہیں چونکہ کتاب حکمت (قرآن حکیم) خدا یا خالق کائنات کا جو تعارف کرایا ہے وہ رب العالمین کی صفت عالیہ کا ہے جس سے خود تخلیق کائنات میں تدریجی ارتقاء کا سراغ ملتا ہے کیونکہ ربوبیت کی حقیقت ہی مخلوقات یا اشیاء کو درجہ بدرجہ ادنیٰ مرحلوں سے اعلیٰ منزل تکمیل تک پہونچانے کا نام ہے جس سے ہمارا یہ عالم ایک عرصہ رزم گاہ کے بجائے قدرت خداوندی عظمت آفریں جلوہ گاہ ثابت ہوتی ہے ڈارون نے جب تخلیق کائنات کی توجیہہ کرنا چاہی تو وہ دور مذہب دشمنی اور دین سے بیزاری کا دور تھا اس لیے اس نے تخلیق کائنات یعنی مخلوقات کو خالق کے بغیر اور مصنوعات کو صانع کے بغیر سمجھنا چاہا تو وہی صورت پیش آئی جو مقفل صندوق کو چابی کے

بغیر یا غلط کنجی سے کھولنے کی یا کسی الجھی ہوئی گتھی کو سرا ہاتھ میں لائے بغیر سلجھانے کی کوشش کے نتیجے میں ہوتی ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ قفل یا تالا کھلنے کے بجائے ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتے گا اور وہ گتھی الجھی کی الجھی رہے گی اس لیے ڈارون نے حقیقت ارتقار کو مذہب دشمنی کے سانچے میں جب ڈالا تو ایک اندھے لولے لنگڑے مادے کو سب کچھ ماننا پڑا۔ حقیقت الحقائق یا علۃ العلل (خدا) سے منھ موڑ کر جب اصل حقیقت کو معلوم کرنا چاہا تو وہی سائنس جو ہر جگہ مشاہدہ و تجربہ پر یقین رکھتا تھا اور عقلی قیاسات کو ایک ذہنی ڈھکوسلا ٹھہراتا تھا اس مسئلہ میں بے سر و پا واہی تباہی قیاس آرائیوں کی دلدل میں پھنس کر رہ گیا۔

ڈارون کے بعد لیمارک جیسے سائنسدانوں کے گروہ نے ڈارون کے قیاسی نظریہ کو تجربیاتی دلائل سے مسترد کر دیا بہر حال اس باطل و بے بنیاد نظریے پر جو سوالات پیدا ہوتے ہیں وہ آج بھی قائم و برقرار ہیں۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ یہ کائنات بخت و اتفاق سے علت و معلول کے فطری قانون کے خلاف کیونکر ظہور میں آئی۔

(۲) دوسرے یہ کہ ایک بے جان مادے میں زندگی کیوں پیدا ہوئی ؟

(۳) پھر زندگی نے از خود تنوع و رنگا رنگی کیونکر اختیار کی ؟

(۴) پھر لاشعوری کائنات میں شعور خصوصاً شعور انسانی کی تخلیق کیونکر ہوئی۔

(۵) پھر یہ ارتقار انسان تک پہونچ کر کیوں رک گیا۔

اس قسم کے بیشمار سوالات ہیں مادیت کو روحانیت کا سہارا ہے تعبیر نہ حل کر سکی ہے اور نہ اس عقدہ مشکل کو حل کیا جا سکتا ہے کیونکہ انیسویں صدی کی مادیت کا بلند و بالا اور خوشنما محل بیسویں صدی کے سائنسی تجربات و تحقیقات ہاتھوں ڈھا چکا ہے بلکہ خود سائنس جدید نے مادیت سے چھلانگ لگا کر غیر مادیت انرجی - توانائی و قوت اور روحانیت کے چوراہے پر لاکر کھڑا کر دیا ہے پرانے یونانی فلسفہ کے جزلا یتجزیٰ کا تصور ہباءً امنثورا یا پادر ہوا ہو کر رہ گیا۔

آئن اسٹائن کے نظریہ اضافت نے زمان و مکان کے تصور کو بدل کر رکھدیا ہے انیسویں صدی کی جس باطل فرسودہ مادیت پر ہیگل اور نٹشے کا فلسفہ قوت اور مارکس کا نظریہ معشیت کا محل تیار کیا گیا تھا اس کی بنیادیں ہی اکھڑ چکی ہیں جن بنیادوں پر معاشی نظریات (کمیونزم سوشلزم) اٹھایا گیا تھا وہ سب زیر زمین ہو چکے مگر سانپ کے نکل جانے کے بعد بھی اس کی لکیر کو اب بھی پیٹا جا رہا ہے اور وہی طاقت و قوت کا فلسفہ انسانیت کو طبقات میں تقسیم کر کے ایک دائمی جنگ کی طرف لے جا رہا ہے اب تک تمام دماغوں پر یہی فلسفہ چھایا ہوا ہے بہر حال اس بر خود غلط نظریہ نے ہمارے دنیا کو تنازع للبقاء کا میدانِ کارزار یا طاقت ور و کمزور انسانوں کا ایک اکھاڑا بنا دیا ہے جس کے بطن سے مغربی سامراج نے جنم لیا اور ایشیا، افریقہ امریکہ آسٹریلیا کے سادہ لوح سیدھے سچے مگر کمزور مخلوق کو اپنے ناجائز اقتدار کا نشانہ بنا کر دنیا کو جہنم بنا دیا ہے۔

قانون ایثار و قربانی

اس باطل و فرسودہ مادی فلسفہ نے قوت و طاقت کو فطرت کا قدرتی قانون قرار دے کر ہماری دنیا کو تنازع للبقاء کا جہنم بنا ڈالا اس فلسفہ نے صرف طاقت ور ہی کو دنیا میں جینے کا حق دیا ہے یہ خدا ناشناسی کے نتیجے میں پیدا کردہ غلط نظریہ ہے اس بر خود غلط نظریہ کے مطابق فطرت ظالم و سفاک اور خونخوار مکردہ چہرے کے ساتھ ہماری آنکھوں میں نمایاں ہوتی ہے حالانکہ چند جزوی واقعات و حالات اور ہنگامی حوادثات کے سواجب فطرت کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک دلکش و دل رُبا موہنی صورت میں ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے زبان معرفت میں اس کو یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ خدا کی شانِ جلالی کا ظہور اس پردہ کائنات پر گاہے ماہے ہوا کرتا ہے لیکن اس عالم کے زیادہ تر واقعات خدا کی شانِ جمالی کے مظہر ہیں چنانچہ ہم مشاہداتی یا سائنسی نقطہ نظر سے فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ زمین سے لیکر

آسمان تک نظام کائنات میں تنازع للبقار کے بجائے ایثار و قربانی کا قانون جلوہ فرما ہے اجرام علوی یعنی سارے آسمانی سیارے اور ستارے اپنے انوار تجلیات کو اس خاکدان ارضی یعنی ہماری زمین پہ بغیر کسی فائدہ حاصل کرنے کے ایثار و قربانی کے ماتحت اپنی روشنیاں پھیلا رہے اور رات دن اپنی شعاعوں سے اس دنیا کو جگمگا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہماری زمین میں زندگی کی سرد و جنگ وگرم تیز شعاعیں پھیل رہی ہیں اگر سورج چاند اور ستاروں کی یہ شعاعیں اور کرنیں ہماری زمین کو درخشاں نہ کرتیں تو اور دوسرے کروں کی طرح زمین بھی زندگی کی جلوہ فروزیوں سے خالی ہوتی فقط خاک کا تودہ یا مختلف دھاتوں کا ایک ڈھیر ہوتی کرۂ آسمانی کی ایثار و قربانی سے یا جلوۂ خدمت گذاری سے یہ ظلمت کدۂ عالم روشن اور جمادات و نباتات حیوانات پردۂ تخلیق پر جلوہ گر ہوتے چنانچہ جمادات کو دیکھیے تو وہ اپنی گود پھیلائے ہوتے نباتات کی نشو و نما کے لیے ایثار و قربانی سے کام لے رہے ہیں اور اپنے افراد کو فنا کر کے بقا کا سامان کر رہے ہیں پھر نباتات حیوانات کے لیے چارہ دانہ اگا کر زندگی کا سامان بہم پہنچا رہے ہیں اور حیوانات بلکہ کل کائنات اس اشرف المخلوقات کے لیے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس لیے جو کچھ کہا گیا ہے کہ قدرت کے نظام میں طاقت ور کمزور کو دبا رہا یا قوی ضعیف کو اپنے پاؤں تلے کچل رہا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ پوری کائنات ایثار و قربانی کی سنہری زنجیر میں بندھی ہوئی ترقی کی طرف اقدام کر رہی اور درجہ بدرجہ مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھتی جا رہی ہے خلاصہ یہ کہ اس بزم کائنات میں ہر ادنیٰ نچلی مخلوق افضل و اعلیٰ مخلوق کے لیے قربانی کا عمل اختیار کیے ہوئے ہیں چنانچہ مٹی نے جب ایثار کیا تو اس میں سے دانہ پھوٹ نکلا اور جمادات نے نباتاتی شکل اختیار کر کے ارتقار کی طرف قدم بڑھایا اور عالم نباتات نے حیوانات کی غذا بن کر صورت حیوانی کی شکل میں ترقی کی اور پھر سب انسان کے کام آ کر اور جسم انسانی کا جز بن کر سب سے اعلیٰ ارتقائی شکل اختیار کی فطرت کو جب اس حقیقت کی روشنی میں دیکھا جائے تو جیسا عرض کیا

گیا یہ پورا کارخانہ تنازع للبقاء کی رزم گاہ نہیں ٹھہرتا بلکہ ایثار و قربانی کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے البتہ خود انسان کے اندر دوسری مخلوقات کی طرح بے غرضی کے جذبے کے ساتھ خود غرضی کی جبلت بھی کارفرما ہے اور انسان حیوان سے زیادہ خود غرض خود پرست واقع ہوا ہے اسی لیے حیات انسانی میں زیادہ کشمکش برپا ہے مغرب نے اپنے مادی فلسفہ کو خود غرضی کی جبلت کی بنیادوں پر اٹھایا جب کہ مذہب یا روحانیت نے بے غرضی و ایثار پسندی کو اصل جوہر انسانیت قرار دیا خود غرضی نفرت کو جنم دیتی ہے اور دلوں میں عداوت کا بیج بوتی ہے جب کہ بے غرضی محبت و الفت کو پیدا کرتی اور ہمدردی و ایثار پسندی غمگساری و قربانی کی دعوت دیتی ہے یہی فرق مادیت اور اصلی روحانیت کے درمیان ہے مشرق کے تمام سچے ادیان و مذہب نے ہمیشہ بے غرضی ایثار و قربانی اور انسانی رحمدلی و ہمدردی کی تعلیمات سے انسانیت کو اونچا اٹھایا جب کہ مغرب کے مادی فلسفہ نے خود غرضی و خود مطلبی خود بینی و خود سری کے جذبات کو بھڑکا کر عالم انسانیت کو دہکتی ہوئی آگ کی بھٹی میں ڈال دیا ہے غنیمت یہ ہے کہ ابھی تک پرانی روحانی قدریں ایثار و قربانی مخلوق خدا کے ساتھ غم خواری مادیت کے رو کر سے پوری طرح کچلنے نہیں پائی ہیں اخلاق انسانی کا تھوڑا بہت وجود پچھلی نسلوں سے ورثہ میں چلا آرہا ہے جس کی وجہ سے زندگی کی گاڑی چل رہی ہے اس امر کا بجا اندیشہ کیا جارہا ہے کہ مستقبل میں جس دن خالص مادی فلسفہ کا پروردہ نیا انسانی ظہور آجائے گا تو انسانیت دور وحشت کی طرف ذقن لگا کر پہونچ جائے گی ۔

جس مادی فلسفہ نے انقلاب فرانس برپا کر کے ہر فرد کو کامل آزادی کا تحفہ دیا اس نے آزادانہ تجارت کی نقاب اوڑھ کر ایک طرف نو آبادی نظام کے ذریعہ ایشیا، و افریقہ غریب باشندوں کو اپنے شکنجے میں کس لیا اور دوسری طرف یورپ کے مزدور و کسان اور غریب عوام کی خدمت کے ثمرات کو دونوں مٹھیوں سے لوٹ کر معاشی بحران میں مبتلا کر کے انسانی زندگی کو اجیرن کر دیا لہذا اسی سرمایہ داری کے بطن سے اشتراکیت و اشتمالیت نے جنم لیا جس نے فرد کی آزادی کو سلب کر کے

ایک پارٹی کے عہدہ داروں کے ہاتھ میں ملک کے باشندوں کی قسمت دیدی۔

اشتراکیت کا نظریہ

کارل مارکس کمیونزم کے بانی نے اپنے معاشی نظام کے ذریعہ جس غیر فطری نظریہ کو سائنسی روپ دینے کی کوشش کی ہے اس کا پورا ڈھانچہ مادیت پر رکھا گیا ہے اس کا بنیادی تضاد یہ ہے کہ اس نظریہ کی اساس تاریخی جبریت پر رکھی گئی ہے اس تاریخی جبریت کو تسلیم کر لینے کے بعد مزدوروں کے لیے نعرۂ انقلاب دینا بے معنیٰ ہو جاتا ہے تاریخ انسانیت کی اس جبریت کی روشنی میں جو توجیہہ بیان کی گئی ہے اس کی بناء پر ہر معاشرہ (سوسائٹی) جبر کی زنجیر میں بندھ کر رہ جاتا ہے ارباب مذاہب پر اشتراکیوں تقدیر پرستی کا اعتراض خود ان پر لوٹ آتا ہے ایک طرف تاریخی جبریت کا دعویٰ دوسری طرف غریبوں کو دعوت انقلاب دینا متضاد بات ہے مگر اشتراکی دانشور چونکہ عمل ورد عمل کے چکر کو تاریخی عمل قرار دے کر اس امر کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تہذیبی ارتقاء وتمدنی نشو ونما میں اسی تضاد کا عمل دخل ہے چنانچہ تہذیبی ارتقاء کے جو مدارج قائم کیے گیے ہیں اس کے اندر جاگیر دارانہ نظام کے بطن سے سرمایہ دارانہ نظام کا جنم لینا اور سرمایہ دارانہ نظام سے اشتراکی نظام کا برپا ہونا تاریخی ارتقاء کا سائنٹفک عمل انہوں نے بتایا ہے لیکن مارکس وانیگلس کی یہ خیالی ترتیب پہلے ہی مرحلہ میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی اس لیے کہ یورپ میں سب سے پہلے صنعتی انقلاب انگلستان ۱۷۶۰ء میں آیا پھر جمہوری تاریخی انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء میں برپا ہوا جہاں جاگیر دارانہ نظام کے بطن سے سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوا اور اس سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں مارکس کے تاریخی ارتقاء کے مطابق ان دونوں ملکوں میں اشتراکی نظام قائم ہونا چاہیئے تھا لیکن ایک صدی گذر جانے پر بھی ہنوز دلی دور است کا مصداق ہے وہاں آجتک اشتراکیت اپنا پنجہ نہ جما سکی لیکن روس کا ولپماندہ خطہ جو ابھی جاگیر دارانہ دور سے گزر رہا تھا اور اس نے صحیح معنی میں سرمایہ دارانہ نظام کی دہلیز پر بھی قدم

نہ رکھا تھا وہاں بزور شمشیر اشتراکی نظام کو مسلط کر دیا گیا اور پھر محنت کشوں کی آمریت (ڈکیٹٹر شپ) کے نام سے کمیونسٹ پارٹی کے چند افراد نے پورے روسی عوام کو اپنے شکنجے میں کس لیا۔ برطانیہ و فرانس کے بارے میں جو تاریخی اندازے مارکس و انیگلس نے لگائے تھے وہ سب دھرے کے دھرے رہ گئے یہ تاریخی حقیقت بھی پیش نظر کے انگلستان کا صنعتی انقلاب جس نے پورے یورپ بلکہ پوری دنیا میں ہلچل پیدا کر دی تھی وہ برطانوی سامراج کی ہندوستانی دولت لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں برپا ہوا۔ برطانوی سامراج پہلا سامراج ہے جس نے ہمارے ملک کی ہزار ہا سال جمع کردہ دولت کو انگلستان پہونچا دیا جس کے بل پر ہزاروں کارخانے قائم ہوئے اور غریبوں کا خون چوس چوس کر سرمایہ دارانہ نظام قائم ہوا ورنہ مسلمان بادشاہوں نے تو ملک کی دولت کو ملک ہی میں رہنے دیا۔

روس میں اشتراکیت کی کامیابی

البتہ ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ روس میں انقلاب کیوں کامیاب ہوا اور یورپ کے دوسرے ممالک میں جہاں انقلاب کی کامیابی کے اشتراکیوں کے نظریے کے مطابق تاریخی وجوہ تھے وہاں آج تک انقلاب اپنا پاؤں نہ جما سکا اس کے جواب کے لیے روس کی تاریخی و معاشی حالات کا جائزہ لینا پڑے گا تاریخی یورپ کا ہر واقف کار اس امر کو جانتا ہے کہ مغربی ممالک میں ملک روس سے زیادہ مفلوک الحال غریب و پسماندہ صنعتی نظام سے محروم جدید مشین کاری سے کوسوں دور اور کوئی ملک نہ تھا یورپی حکومتوں میں روس کی تعلیمی و صنعتی پسماندگی کا باعث وہاں کا جابرانہ زار شاہی نظام تھا جہاں زار روس جیسا ظالم و جابر عیاش شہنشاہ جاگیردارانہ نظام کے زیر سایہ اپنے چند مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ جاہل و غیر ترقی یافتہ عوام کے خون پسینہ کی کمائی سے گل چھرّے اڑا رہا تھا اور عوام کی اکثریت دانے دانے کو ترس رہی تھی روس کی سرزمین میں

روحانیت (عیسائیت کا جھنڈا بلند کرنے والا راسپوٹین جیسا سیاہ کار و بدمعاش سراسر عیاش سب سے بڑا پوپ پادری تھا جس کی شرمناک سیاہ کاریوں کی تفصیل سے کاغذ کو سیاہ کرنا بھی باعث شرم ہے ایک طرف زار روس کی چیرہ دستیاں عوام کو کچلتی رہیں اور دوسری طرف چرچ زار کی پشت پناہی کرتا اور ظالم شہنشاہیت کے لیے کلیبا ڈھال بنتا رہا اس لیے روسی عوام میں شہنشاہیت اور عیسائیت دونوں کے خلاف غیض و غضب اور غم و غصہ کا لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا روسی دانشوروں نے اپنی تحریروں اور لینین اور اس کے ساتھیوں نے اپنی تقریروں سے عوام کے دماغوں میں باغیانہ خیالات کو خوب ہوا دی چونکہ عوام کی اکثریت جاہل و ناخواندہ تھی جہالت انسان کو خون کے دریا میں بے محابا کودنے پر آمادہ کرتی ہے جاہل آدمی آگے پیچھے کا خیال نہیں رکھتا جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے اس لیے وہ آتش فشاں پھٹ پڑا ایسا انقلاب برپا ہوا جس نے پرانے دقیانوسی ازکار رفتہ نظام کو بھسم کر دیا خداوندی قدرت کا ایسا معجزہ صادر ہوا جس کا خود انقلابیوں کے دماغوں میں تصور نہ تھا۔ لینین جیسے انقلابی لیڈر کی سرکردگی میں روس کی کایا پلٹ ہو گئی روسی عوام جو صدیوں سے غربت و پسماندگی اور بھکمری سے موت و حیات کے جھولے میں جھولتے چلے آرہے تھے ان کے لیے دو وقت کی روٹی اور تن پر کپڑا میسر آنا ہی معراج زندگی تھا روسی نظام نے نہ صرف اس کو فراہم کر دیا بلکہ زندگی کی مزید سہولتیں بھی مہیا کر دیں اور محنت او مزدوری کے فارغ اوقات میں کلچرل پروگرام سے حسن بن صلاح کی جنت میں الجھا کر حیات انسانی کے مقصد اصلی پر غور و فکر کرنے وقت ہی نہیں دیا لیکن کمیونزم نے روسی قوم کو محنت و عمل کے راستہ پر لگا کر ایک سخت گیر و جابرانہ نظم و نسق کے ماتحت ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ روس کی ہمہ جہتی ترقی نے یوروپ کے دیگر ممالک کو پیچھے ڈال دیا ہے مسلسل انسانی سعی و عمل اور محنت کا یہ کرشمہ لوگوں کو روسی نظام کی طرف ضرور کھینچتا ہے مگر لینین کے بعد اسٹالن کا دور اس قدر تاریک مہیب ظالمانہ اور بھیانک رہا اس کی تصدیق خود کمیونسٹ پارٹی نے

بعد میں کر دی اور روس کا وہ عظیم ڈکٹیٹر جس نے روس کو آہنی پردہ میں رکھ کر لوگوں کے دلوں پر اپنا نقش عظمت بٹھایا وہ نشانِ عظمت خود اس کی پارٹی نے اپنے ہاتھوں سے مٹا دیا پھر روسی کمیونزم نے یوگوسلاویہ کی پارٹی کے ساتھ جو کچھ کیا وہ ذہنوں میں تازہ ہے اب چینی مارکسیزم نے خود روسی نظام قرار دیا ہے ٹروٹسکی اور لینن کا اختلاف اور انٹرنیشنل کمیونسٹ پارٹیوں کا باہمی تصادم اور حال میں روس کے پولینڈ و ہنگری اور افغانستان کے اقدامات نے کمیونزم کے دوسرے چہرے کو بے نقاب کر دیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سوویت روس میں بیکاری و بے روزگاری کے کٹھن معاشی مسئلہ کو حل کر لیا گیا ہے وہاں کوئی بھوکا نہیں کوئی بے گھر بے در نہیں لیکن اس معاشی خود کفالتی کی قیمت آزادیِ فکر و خیال آزادی تحریر و تقریر کی محرومی کی صورت میں بہت مہنگی پڑ رہی ہے فرد کو آزادیِ فکر و عمل سے محروم کر دینا اور کلیت پسند حکومت کے چشم و ابرو کے اشارے پر ہر فرد کو چلانا صدیوں کی آزادی کے لیے انسانی محنت پر پانی پھیر دینا شرف انسانی پر بٹا لگا دینا ہے مارکس کا قدر زائد Sur Plus کا نظریہ قابلِ قدر انقلاب آفریں سہی لیکن اس میں خدا کی سب سے افضل مخلوق انسان کو معاشی حیوان بنا کر رکھ دیا روسی آمریت کے فولادی پنجہ کی گرفت سے ضمیر و خیال ٹھٹھر کر رہ گئے اپنی خوشی رضامندی سے تہذیبی ارتقاء کے لیے اشتراکی نظام روک بن گیا انسانی فکر پر چاروں طرف سے پہرے لگا دیئے گئے اور ذہن انسانی کے ارد گرد ایسا حصار کھینچ دیا گیا ہے جس کے اندر رنگا رنگ خود اختیاری تہذیبوں کے لیے نشو و نما پانے کی گنجائش نہیں رہتی صدیوں کی بادشاہت و شہنشاہیت کی غلامی سے اس ہمہ جہت آزادی کو انسانیت نے سخت محنت و مشقت اور ہزارہا قربانیوں سے حاصل کیا تھا اشتراکیت نے پھر اس کو پابہ جولاں اور قیدی بنا دیا روس میں مذہبی آزادی کا اعلان ضرور ہے لیکن کیا سوویت روس کسی بھی مذہب کو تبلیغ یا پرچار کا حق دیتا ہے بڑے سے بڑا

روس نواز دانشور اس کا جواب اثبات میں نہ دے سکے گا البتہ لامذہبیت کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے خود حکومت روس اس کی نقیب و داعی ہے روس کے اشتراکی نظام کے مقابلہ میں جمہوریت کا نظام اجتماعی حدود کے اندر ہمہ جہتی آزادی کا تحفہ انسانیت کو پیش کرتا ہے لیکن ریاست کے ہر فرد کی معاشی ذمہ داری کو قبول نہیں کرتا آزاد تجارت کے پردے میں ایشیا، وافریقہ کی غریب اقوام کو جمہوریت نے دونوں ہاتھوں سے جس طرح لوٹا ہے پچھلی دو صدیوں کی تاریخ اس سے بھری ہوئی ہے جمہوری سرمایہ دارانہ نظام میں ساری دولت چند چالاک و بے رحم اور خود غرض انسانوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر آجاتی ہے اور وہ استحصال یعنی ناجائز طریقوں سے ملک کی دولت پر قابض ہو کر بیٹھ جاتے ہیں جس طرح روس میں کمیونسٹ پارٹی کے چند افراد کے ہاتھوں میں حکومت کی پوری باگ ڈور آجاتی ہے غرض دونوں نظاموں میں غریب و مزدور کی محنت کا پھل یا اصل محنت کا مکھن مخصوص افراد کے ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ جاتا ہے اس طرح پوری انسانیت چکی کے دو پاٹوں کی بیچ پستی چلی جا رہی ہے۔

شاہ صاحب کا انقلابی پروگرام

اس دل خراش و جگر پاش والمناک صورت حال کا جس شدت و غمگینی کے ساتھ آج احساس کیا جا رہا ہے اور انسانیت کے سچے ہمدرد مخلوق خدا کی مفلوک الحال اور شکستہ حالی سے جس قدر آج افسردہ و ملول خاطر ہیں آج سے ڈیڑھ سو صدی پہلے اس دور کے مفکرین میں احساس تک نہ تھا حکیم الہند حجۃ الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) پہلے اسلامی مفکر ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اس صورت حال کا جائزہ لیا جب کہ کارل مارکس کے مینی فیسٹو میں ایک صدی اور فرانس کے انقلاب ۱۷۸۹ء میں اٹھاون ۵۸ سال باقی تھے اشتراکی مینی فیسٹو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اور پہلی انٹرنیشنل کانفرنس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوئی اس حساب سے شاہ صاحبؒ پہلی انٹرنیشنل کانفرنس سے ایکسو دس سال اور مارکس کے اعلان اشتراکیت سے پچاسی سال پہلے وصال فرما

چکے تھے (تحریک شاہ ولی اللہ ص ۶۲)

اس وقت جیسا کہ لکھا جا چکا مغل شہنشاہیت کا آفتاب اقبال غروب ہو رہا تھا اور ناخلف حکمراں عیش و عشرت کے شبستاں میں محوِ خواب تھے شاہ صاحبؒ کا قلب و دماغ بیدار ان کی روحِ پاک خدا اور اس کی مخلوق کی محبت میں سرشار اس پرخطر ماحول میں انسانیت کے لیے راہِ نجات کے لیے تلاش میں تھی شاہ صاحبؒ نے جو انقلابی پروگرام عالم انسانیت کے لیے تجویز کیا اس کو شخصی حکومت کی جکڑبندیوں کی وجہ سے باقاعدہ منشور (مینی فیسٹو) کی شکل میں پیش نہ کر سکے لیکن اپنی مختلف کتابوں حجۃ اللہ البالغہ، بدورِ بازغہ وغیرہ میں ان انقلابی دفعات کو حقوق انسانی کے نام سے پھیلا دیا ہے شاہ صاحبؒ کا یہ انقلابی اسلامی فکر انسانی قدروں پر مبنی ہے وہ پوری انسانیت کے لیے ایسے معتدل و خوشگوار انقلاب کے داعی ہیں جس کا فائدہ ہر فرد انسانی کو پہونچ سکے حضرت شاہ صاحبؒ ایک فرد کو انسان صغیر اور پوری انسانیت کو انسانِ کبیر قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک پوری انسانیت کو اتحاد کی لڑی میں پرونے والا ہر عمل اور جملہ بنی آدم کو ایک کرنے میں مدد دینے والا ہر قدم زندگی کو ترقی کی منزل تک پہونچانے والا عمل و اقدام ہے اسی طرح عالمی امن و امان اور باہمی ربط و اتصال کو قطع کرنے والا ہر سلسلہ ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانی جسم میں کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے جس کو صدیوں پہلے بلبل شیراز سعدی شیرازی نے یوں فرمایا ہے۔ ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند = کہ در آفرینش ز یک جوہر اند
چوں عضوئے بدرد آورد روزگار = دگر عضو ہا را نماند قرار

شاہ صاحبؒ اس کے قائل و داعی ہیں کہ قرآنی اصول پر جو انقلاب برپا ہوگا اس سے وہی نتائج ہر دور ہر عہد میں پیدا ہوں گے جو قرن اوّل یعنی اسلام کی پہلی صدی میں پیدا ہوئے اس کے اندر کسی آدمی یا زمانے کی خصوصیت نہیں۔

ولی اللہی حکمت اور اس کے اصول

ولی اللہی حکمت جو اسلامی انقلاب کی عالمگیر دعوت پوری انسانیت کو دیتی ہے اس کے اصل الاصول دو ہیں (۱) قرآنی حکمتِ عملی (۲) اقتصادی توازن و مساوات۔

قرآنی حکمت عملی سے مراد انسانی زندگی کا قرآنی لائحہ عمل ہے شاہ صاحبؒ کے نزدیک قرآن کا معجزہ صرف اس کی بلاغت میں منحصر نہیں ہے جس کے لیے اہل عرب کو چیلنج دیا گیا تھا عربوں کے لیے قرآنی بلاغت کا سمجھنا اور اس کے مقام اعجاز کو پہچاننا اہل زبان ہونے کی بناء پر زیادہ دشوار نہیں تھا لیکن اہل عجم کا اس معجزانہ بلاغت کی تہہ تک پہونچنا محال نہیں تو سخت مشکل ضرور ہے اس لیے شاہ صاحبؒ اس کے قائل ہیں قرآنی حکمتِ عملی میں اس کا اعجاز مضمر ہے قرآن حکیم نے تمام انسانوں کے لیے عملی زندگی کا جو نقشہ تجویز کیا ہے وہی سارے عالم کی خوشحالی و فارغ البالی تعلقات باہمی کی خوشگواری و سازگاری اور عالمگیر امن و امان کی باد بہاری کی ضمانت ہے کیونکہ ہر مشین کا موجد جب اپنی ایجاد کو بازار میں پہونچاتا ہے تو اس مشین کا طریقہ استعمال اور اس کے متعلق جملہ ہدایات کا نسخہ بھی ساتھ میں دیتا ہے اور ان ہی ہدایات پر عمل اس مشین کی پائیداری اور مدت مقررہ تک مفید اور کارآمد رہنے کی گارنٹی ہوتا ہے۔

قرآنی رہنما اصول:-

قرآن کریم کی حکمت کی روشنی میں جو حقیقت ہم پر کھلی وہ یہ ہے کہ قرآن نے انسانی کی کامیاب انفرادی اور اجتماعی زندگی کے رہنما اصول عطا فرمائے ہیں خدا اور بندے اور بندوں، بندوں کے درمیان ظاہری و باطنی تعلقات قائم کرنے اور قائم رکھنے کے خطوط و حدود متعین فرماتے ہیں اور حیات انسانی کے خاکے میں واضح و روشن لکیریں کھینچ دی ہیں۔

(۱) خداوند قدوس کی ذات وصفات اور جملہ کمالات کے متعلق شایانِ شان

صحیح اور سچے خیالات دل و دماغ میں بٹھانے اور ان کو قائم رکھنے کا نام ایمان و عرفان ہے جس کو شریعت میں عقائد سے تعبیر کیا جاتا ہے عقائد کی صحت ہی دین اور زندگی اصل بنیاد ہے۔

(۲) پھر خدا کے ساتھ اس سچے عقیدے کے نتیجے میں خدا کی عظمت و محبت کے ساتھ جو نیاز مندانہ عملی تعلق اپنے معبود کے آگے سرنگندگی و فرمانبرداری کی شکل میں ظہور میں آتا ہے اس کا نام عبادات ہے جو اسلام کا دوسرا عظیم رکن ہے۔

(۳) نفس انسانی جس کی فطرت میں خیر و شر، نیک و بد دونوں استعدادیں ودیعت ہیں اس کے اندر نیکی کے حصول کے لیے فضائل سے آراستگی و پیراستگی اور برائی سے بچنے کے لیے رذائل سے پاکی و صفائی اس کو تہذیب نفس تصفیہ قلب اور تزکیہ روح سے یاد کیا جاتا ہے اس کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔

(۴) پھر فرد کا اپنی زندگی میں ان اخلاقی کمالات یعنی اچھی خصلتوں سے آراستہ کرکے اور بری عادتوں سے خود کو پاک صاف رکھ کر زندگی گذارنا معشیت کہلاتا ہے جو اسلام کا چوتھا رکن ہے۔

(۵) انفرادی زندگی کی تہذیب و اصلاح کے ساتھ چونکہ انسان اجتماعیت پسند ہے اس لیے اپنے ہم مذہب و غیر مذہب تمام انسانوں کے ساتھ صحیح حدود کے اندر تعلقات و معاملات قائم رکھنے کو معاشرت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لیے اعتقادیات، عبادات، اخلاقیات اور معاشرت، اور معشیت دین کے پاکیزہ درخت کے پانچ شعبے ہیں جو قرآنی تعلیمات کے اصل موضوع ہیں لھذا جو شخص اس عالم میں قرآنی تعلیمات کے مطابق اپنی زندگی گذارے گا تو اس کے لیے دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی و کامرانی و سرخروئی کی خوشخبری ہے اور جو انسان قرآنی زندگی کے نقشے کے خلاف عملی زندگی اختیار کرے گا تو اس عالم میں سکون روحانی، سکون قلبی، اور دل جمعی سے محروم ہوگا اور آخرت میں سخت عذاب و پریشانی میں مبتلا ہوگا جملہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا مقصد بعثت ان پنجگانہ اصول کی تعلیم و ہدایت ہے قرآن حکیم نے خدا کی آخری کتاب

کی حیثیت سے زندگی کے ان اصولوں کو واضح اور روشن آیات میں کامل مکمل طور پر قیامت تک کے لیے انسانیت کے سامنے رکھدیا ہے۔

(۲) حکمت ولی اللہی کا دوسرا اصل الاصول معاشرت و معشیت اور عام انسانی سوسائٹی میں معاشرتی توازن اور معتدل اقتصادی نظام ہے۔

اسلام کے پچھلے بلند پایہ مفکروں اور عالی قدر مصلحوں نے اخلاقیات انسانی کو اپنی توجہات کا مرکز بنایا اور فرد کی اصلاح تحلیہ بالفضائل اور تخلیہ عن الرزائل یعنی عمدہ خوبیوں کے حصول اور بری خصلتوں سے صفائی پیدا کرنے کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں خصوصیت سے صوفیائے اسلام نے نفس انسانی کی تہذیب، اخلاقِ الٰہی کی تحصیل اور روح و دل کی اصلاح کے لیے جو عظیم کارنامے انجام دیئے ہیں وہ قابلِ فخر ہیں ان اصلاحی کوششوں کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ مختلف اقوام عالم کے سماجی نظاموں سے ٹکر لیتا ہوا اپنی امتیازی خصوصیات کی بنا، پر نشیب و فراز سے گذرتا رہا لیکن انسان کے اندر جو ایک معاشی حیوان چھپا ہوا ہے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی گئی انسانیت کے لیے معاشی مسئلہ جو ریڑھ کی ہڈی کی طرح ایک ضروری و ناگریز مسئلہ ہے اس کو بیشتر ارباب فکر نے درخور اعتبار نہ سمجھا۔

اقتصادی توازن ولی اللہی حکمت کی روشنی میں

عبادات و اخلاقیات کا اقتصادیات یا معاشیات سے کیا تعلق ہے اس کی اہمیت پر سب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہ رح نے روشنی ڈالی اور اس اہم بنیادی مسئلہ کو اسلامی احکام کی روشنی میں اپنا موضوع فکر بنایا اخلاق و عبادات و معاشیات کے باہمی رشتہ کو واشگاف انداز میں، بیان کیا چنانچہ شاہ صاحب رح حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرماتے ہیں "اگر کسی قوم میں تمدنی ترقیات کا سلسلہ برابر قائم رہے تو وہ صنعت و حرفت میں درجہ کمال پر پہونچ جاتی ہے اس کے بعد حکمراں طبقہ عیش و عشرت اسباب و تفاخر و زینت کو اپنا شعار بنالے تو اس کا بوجھ قوم کے دیگر طبقات پر اس قدر بڑھ جائیگا

کہ معاشرے کی اکثریت حیوانوں کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوگی جب جبر و زبردستی اور بیجا دباؤ سے قوم کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جاتا ہے تو انسانیت کے اجتماعی اخلاق برباد ہو جاتے ہیں اس وقت وہ گدھوں بیلوں کی طرح روزی حاصل کرنے یا روٹی کمانے کے لیے مجبور و مضطر ہو جاتی ہے جب بھی انسانیت اس مصیبت عظمیٰ میں گرفتار ہو جاتی ہے تو قدرت الٰہیہ انقلاب کے سامان پیدا کر کے قوم کے سر سے ناجائز حکومت کا بوجھ اتار دیتی ہے چنانچہ قیصر و کسریٰ کی حکومتوں نے عیش پرستی و عشرت پسندی کا یہی طریقہ اختیار کر رکھا تھا اس مرض کو جو جسم انسانی میں پھیل گیا تھا دور کرنے کے لیے خدا نے نبی امیؐ (فداہ ابی و امی) کو امیوں (عربوں) میں مبعوث فرمایا فرعون کی ہلاکت اور قیصر و کسریٰ کی تباہی اسی اصول پر لوازم نبوت سے سمجھی جاتی ہے (حجۃ اللہ البالغہ ص ۸۳) آگے کے ایک فقرہ میں اپنے وقت کی ہیئت کی اجتماعی حکومت کا خاکہ کھینچ کر رکھدیا ہے "ہماری حکومتوں کے بادشاہوں کے حالات جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں ان کے بعد ان پچھلے بادشاہوں کے قصوں کی ضرورت نہیں۔"

شاہ صاحبؒ انسان کی حیات اجتماعی کے لیے حکومت عادلہ (خلافت) کو ایک ناگزیر ضرورت مانتے ہیں وہ فرماتے ہیں "انسان خطرتاً ہیئت اجتماعیہ کا محتاج ہے یہ انسانی ترقی کا پہلا زینہ ہے اسی ہیئت اجتماعی کو قواعد و ضوابط کی روشنی میں قائم رکھنے کا دوسرا نام حکومت ہے اچھی حکومت قائم کرنا انسانی ترقی کا دوسرا قدم ہے جس جگہ یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں وہ مدنیت فاضلہ ہے ورنہ مدنیت ناقصہ چھوٹی سی آبادی میں مختصر ہیئت اجتماعیہ جیسے جرگہ یا پنچایت سے کام چل جاتا ہے لیکن جہاں شہریت جلوہ پرداز ہو دانشور شخصیتیں مل بیٹھ کر معاملات کو طے کرتی ہیں جس کو دارالشوریٰ (پارلیمنٹ) کہا جاتا ہے یہی ارباب حل و عقد شورائی نظام کے ارکان ہوتے ہیں اسلام اسی شورائی نظام کا داعی ہے جمعیت مرکزیہ یا خلافت اسی نظام کی معراج جس کا مثالی نمونہ خلافت راشدہ خصوصیت سے

شیخین کا عہد سعادت مہد ہے (ازالتہ الخفاء) شاہ صاحبؒ نے اپنی مختلف کتابوں میں اور شاہ اسماعیل شہید نے اپنی کتاب عبقات، اور منصبِ امامت میں خلافت وملوکیت پر فاضلانہ و عالمانہ بحث کی ہے جن بنیادوں پر اسلام کا نظام سلطنت تشکیل پا کر پوری انسانیت کے لیے فلاح وبہبود خوشحالی و فارغ البالی کا ضامن بن سکتا ہے جس سے اجتماعی زندگی کے دوسرے شعبے فروغ پاتے اور انسانی قافلہ منزل ترقی کی طرف رواں دواں ہوتا ہے معاش کا رشتہ معاد سے جڑا ہوا ہے جیسے دنیا سے آخرت جڑی ہوئی ہے اگر اقتصادی نظام ہی درہم برہم ہو جائے اور انسان کی بنیادی ضرورتیں تشنہ تکمیل رہ جائیں تو انسانی زندگی ہی ٹھٹھر کر رہ جائے گی اور انسانیت کے بلند مقامات (معرفت وعبادت واخلاقِ عالیہ) سے انسان محروم ہو جائے گا اقتصادی نظام کا توازن ہی اخلاقِ انسانی خوشگواری و استواری پیدا کرنے کا باعث ہے تہذیب نفس کے بغیر اخلاق کی درستگی ممکن نہیں جب معاش کا نظام درست نہ ہوگا تو معاد کیونکر ہوگا تکمیل اخلاق سے عالمِ برزخ حشر ونشر اور انسان کی اصل زندگی سنور جائے گی جو اس کو جنّت کا حقدار بنا دے گی یہی سفر حیات کی آخری منزل ہے وہاں انسان اپنے پروردگار (جو محبوب حقیقی بھی ہے) کی لذّتِ دیدار سے بہرہ یاب ہوگا انسان کی حیاتِ دنیاوی کو مرحلہ بمرحلہ طے کرائے ترقی آخری منزل تک پہونچانا نبوت کا مقصد اصلی ہے اس لیے نبوت حیات انسانی کے لیے ایک فطری ضرورت بن جاتی ہے (بدور بازغہ ص۸)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ انسان کے باطنی امراض کا علاج روحانی و باطنی طبیب کے بغیر ممکن نہیں اُن کو ہی رسول دینی کہا ہے چونکہ دین تو ایک ہے لیکن اس کے شرائع (ظاہری طور طریق رسوم و روایات) ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں لکل جعلنا منکم شرعۃً ومنھاجاً۔ الآیۃ۔ (قرآن حکیم) اس لیے شاہ صاحبؒ کے دعوتی اصول عالمگیر اقدار انسانی پر مبنی ہے ان کا زور مذہب کے رسوم پر نہیں بلکہ مذہب کی روح پر ہے قانون کی ظاہری شکل پر نہیں بلکہ اس کی روح عدل وانصاف پر ہے۔

اسلامی معاشیات کا معتدل نظام

حکمت ولی اللہی کی روشنی میں ہم نے معاشیات اسلامی کے متوازن نظام کو جس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے ان خیالات کو اپنی عبارت میں ہم یہاں ادا کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے جو نظام قدرت نے زمین سے لے کر آسمان تک قائم فرمایا ہے۔ حیات انسانی میں اس کی جلوہ پیرائی کے لیے اسلامی احکام دیئے گئے ہیں فطرت کا پورا نظام عدل و اعتدال کی بنیاد پر قائم ہے خدائے احسن الخالقین کا تخلیقی کمال ہر وجود کے اندر توازن یعنی ترازو کے دونوں پلوؤں کے برابر رکھنے میں مضمر ہے اس کے اندر ادھر اُدھر جھکاؤ نہیں اور جہاں جھکاؤ پیدا ہوا تو وہ شئے یا تو اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے یا وہ وجود اپنے حسن و خوبی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اسی کمال اعتدال سے فطرت میں حسن و خوبی جلوہ گر ہوتی ہے یہ قانونِ عدل و اعتدال اجرام علوی سے لے کر اجسام سفلی تک یکساں طور پر کار فرما ہے اجرام علوی یعنی آسمانی کروں میں ہر کرہ اپنی کشش ثقل کو اعتدال کی زنجیر کو مضبوطی سے پکڑا ہوا خود کو تھامے ہوئے اور سنبھالے ہوئے اور ہر سیارہ دوسرے سیارے کو اپنے مدار میں داخل ہونے سے روکے ہوئے ہے اگر نظام فلکی میں یہ کشش ثقل دجو قانونِ عدل کی زنجیر میں بندھی ہوئی ہے، ختم ہو جائے تو نظام کائنات درہم برہم ہو جائے اسی طرح اجسام سفلی یعنی ہماری زمین بھی اسی قانونِ عدل پر اپنے دائرہ میں

گردش کرتی ہوئی فضا میں قائم و برقرار ہے ہماری کائنات میں حیات و زندگی کی جلوہ آرائی بھی اسی قانون اعتدال کی مرہون منت ہے چنانچہ جب مختلف عناصر ایک مخصوص نظم و اعتدال کے ساتھ اجسام میں جلوہ فرما ہوتے ہیں تو زندگی سطح عالم پر چہرہ پرداز ہوتی ہے پھر ہر زندہ مخلوق کے اندر جب تک اخلاط اربعہ (خون بلغم سودا صفراء) میں اعتدال قائم رہتا ہے تو صحت و تندرستی سے زندگی مالا مال ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر فتور اور کمی یا بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے تو ہر جاندار نعمت صحت سے محروم ہو کر بیماری کا شکار ہو جاتا ہے اسی طرح انسان کے اندر قدرت کی ودیعت کی ہوئی مختلف قوتیں (قوت شہویہ، قوت غضبیہ، قوت ملکوتیہ) جب اعتدال کا رنگ اختیار کرتی ہیں تو اس سے اخلاق فاضلہ کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ فلسفہ اخلاق میں اس حقیقت کو ثابت کیا گیا ہے کہ ہر فضیلت دو رذیلتوں کی درمیانی حالت سے پیدا ہوتی ہے یعنی انسانی خصائل میں حسن و خوبی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ دو ادنیٰ رذیلتوں کی درمیانی خصلت کو اختیار کیا جائے جیسے سخاوت و فیاضی اس کا ایک کنارہ بخل اور کنجوسی ہے اور دوسرا کنارہ اسراف و فضول خرچی ہے انسان ان دونوں بُری خصلتوں کے درمیان معتدل خصلت کا نام سخاوت اور جود و کرم ہے اسی طرح جبن (نامردی) اور فروسیت (درندگی) کی درمیانی معتدل خصلت شجاعت و بہادری سے موسوم ہوتی ہے۔ یہی حال تمام فضائل کا ہے۔

یہ اعتدال جب اعضائے جسمانی میں موزنیت کے ساتھ جلوہ ہوتا ہے تو اس کو حسن و جمال سے اور جب آواز میں پیدا ہوتا ہے تو اس کو نغمہ و زمزمہ سے اور جب جسمانی حرکات و سکنات میں ہوتا ہے تو اس کو عشوہ و ادا سے تعبیر کرتے ہیں اور جب الفاظ و کلمات جملوں اور فقروں میں یہ اعتدال رونما ہوتا ہے تو اس کو فصاحت و بلاغت کہتے ہیں اور جب ایک نقاش اپنے موقلم سے خطوط اور دائروں کی کشش میں نظم و اعتدال کے ساتھ اپنے بنائے ہوئے نقوش میں

رنگ بھرتا ہے تو فن و ہنر (آرٹ) عالم وجود میں آتا ہے۔

غرض بزم کائنات اور چمنستانِ حیات میں اس نظم و اعتدال کی جلوہ گری سے دلکشی و زیبائی دل آویزی و رعنائی پیدا ہوتی ہے جو قانون عالم کبیر (کائنات) میں کارفرما ہے وہی عالم صغیر (انسان) میں بھی جلوہ آرا ہے

جس طرح اخلاق انسانی کی حسن و خوبی اس کی متضاد گوناگوں قوتوں کو راہ اعتدال پر رکھنے سے پیدا ہوتی ہیں اسی طرح حسن معیشت بھی اس سنہری زنجیر کی ایک کڑی ہے اسلام کا اقتصادی نظام بھی اسی قانون فطرت کی ایک شاخ ہے چنانچہ اسلام نے انسانی فطرت کا لحاظ رکھتے ہوئے مال و دولت اور جائیداد میں حق ملکیت کو تو تسلیم کیا ہے لیکن چند اصول و ضوابط کے ذریعہ اس کو محدود کر دیا گیا ہے اشتراکی نظام کی طرح نہ تو نفس ملکیت کا انکار کیا اور نہ سرمایہ دارانہ نظام کی طرح ملکیت کو کھلی چھٹی دے دی گئی معاشیات انسانی کے جسم میں جو سب سے بڑا سرطان (سودی کاروبار) چھپا ہوا پوری انسانیت کو تباہ و برباد کر رہا ہے اسلام نے سب سے پہلے ہی اس کی حرمت کے ذریعے جڑ کاٹ دی پھر ہمارے نزدیک ارتکاز اکتناز و احتکار ان تین لفظوں کے اندر اسلام کی اقتصادیات چھپی ہوئی ہے۔

ارتکاز جو اسلامی معیشت کا اصل الاصول کَیْلَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ. کی قرآنی آیت سے واضح ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے تقسیم دولت کے جو احکام عطا فرمائے ہیں وہ اس لیے ہیں کہ کل مال دولت چند مالداروں کی مٹھیوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے گویا اسلام مال دولت کو پورے معاشرے کے اندر مسلسل گردش میں رکھنے کا قائل ہے ارتکاز یعنی مال کو کسی ایک ہاتھ میں مرکوز ہو جانے کا قائل نہیں۔

دوسرے اکتناز یعنی سرمایہ معاشرے میں جمع ہو کر اکٹھا نہ ہونے دیا جائے اور احتکار مستقبل میں نفع حاصل کرنے کے لیے اشیاء کا ذخیرہ کرنا

اس کو قابل لعنت ٹھہرایا ہے یہ تینوں علتیں جو سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ بنیادیں ہیں اسلام نے انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور افراد کے پاس جمع ہونے والی دولت کو عوام میں تقسیم کر دینے کے لیے مختلف شکلیں تجویز کیں سب سے پہلے اسلام کے اصولِ میراث (ترکہ) نے کسی ایک فرد کے پاس دولت کے مرکوز ہونے کی جڑ کاٹ دی جس طرح دوسرے سماجوں میں بڑا بیٹا خاندان کی ساری دولت سمیٹ کر مالک بن بیٹھتا ہے اور وہ دولت خاندان کے افراد میں پھیلنے نہیں پاتی اسلام نے اس پر ممانعت کی مہر لگادی پھر جو مال و دولت میراث یا خود اپنی کمائی سے حاصل ہوا اس کو زکوٰۃ و صدقات و خیرات کے ذریعہ مستحقین یعنی فقراء مساکین پر تقسیم کرادیا چاندی سونے پر چالیسواں حصّہ چاہی اور نہری زمینوں کی پیداوار پر بیسواں حصّہ اور بارانی زمینوں کی پیداوار پر دسواں حصّہ مقرر کرکے اس کو معاشرے کے کمزور طبقوں میں پھیلا دیا جو خودرو قدرتی جنگلاتی و معدنیاتی دولت ہے ان پر عوام کے حق کو تسلیم کیا اور اس کا ایک مقررہ حصّہ فقراء کے درمیان تقسیم کرنے کا حکم دیدیا اس کے بعد پیغمبر اسلام نے فرمایا:۔ ان فی المال حقا سوی الزکواۃ یعنی مال و دولت میں زکواۃ کے علاوہ بھی فقیر و مسکین اور مستحقین کا مزید حق ہے اسلام نے استحصال یعنی غریب و مزدور کی محنت سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے یا تجارتی مال میں غبن فاحش یعنی بے جا فائدہ اٹھانے کو ناپسندیدہ قرار دیا۔

اسلام فرد کے اخلاقی ارتقاء کے لیے نفس ملکیت کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے سخاوت و فیاضی داد و دہش اور بخشش کا فطری جذبہ کو نشو و نما دی جائے تو اس کے اندر جذبہ ترقی و مسابقت کا جو قدرتی ولولہ ہے مال و دولت خرچ کراکے ایک دوسرے سے بڑھنے کے مواقع مہیّا کیے جاتے ہیں۔

چونکہ حرص و بخل بھی انسان کے مزاج میں ہے قرآن میں ہے لوگوں کے اندر حرص و بخل کو رکھ دیا گیا ہے اور جو شخص بھی اپنے نفس کو حرص و بخل سے بچالے جائے

وہی کامیاب ہے (التغابن القرآن) قرآن نے خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کا
اس کثرت سے حکم دیا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے سرمایہ داری کی جڑ ہی کٹ جاتی ہے
اس لیے صحابہ کرامؓ کو سوال کرنا پڑا کہ آیا مال رکھا بھی جا سکتا ہے۔ "وہ آپ سے
پوچھتے ہیں کتنا خرچ کرنا چاہیئے تو آپ کہہ دیں کہ اپنی ضرورت سے ہر زائد چیز
خدا کی راہ میں دے دو (البقرہ) عفو کی ایک تفسیر صوفیانہ جو حضرت ابوذر غفاری
سے منقول ہے کہ ایک وقت کا کھانا اور پہننے کا کپڑا اپنے پاس رکھا جائے باقی سب
راہ خدا میں دے دیا جائے۔

پھر اسلام دولت کی تقسیم یا ملکیت کی تحدید پر اس قدر زور نہیں دیتا جس قدر
اُن افراد کے اخلاق کی پاکیزگی پر زور دیتا ہے جن کے ہاتھوں میں دولت آجاتی ہے
اگر قانون کے ذریعہ دولت کی تقسیم اور تحدید پر پابندی لگا دی جائے لیکن وہ لوگ
جو حرص و بخل کے پیکر اور چالاکی و ہوشیاری کے حامل ہوں وہ اس قانون کو
حسب منشاء ڈھال لیں گے اور قانون دھرا کا دھرا رہ جائے گا مال و دولت یا
اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی صلاحیت و طاقت سرمایہ داری کی شکل میں یا پارٹی
کی صورت میں استحصال کی صورت نکال لیں گے عوام دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں
گے۔ غرض اشتراکی نظام ہو یا جمہوری نظام مخصوص افراد کے ہاتھوں میں دولت
سمٹ کر رہ جاتی ہے جو سامانِ عیش و عشرت ان کے لیے مہیّا ہے عوام کو ان کا عشر و
عشیر بھی میسر نہیں ہوتا نہ تو جبری غربت مسئلہ کا حل ہے اور نہ دولت کو کھلی چھٹی
دینے سے یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے خلاصہ یہ کہ اسلام نہ تو سرمایہ داری (کیپٹلزم)
کی طرح بے قید مطلق العنان ملکیت کی اجازت دیتا ہے اور نہ اشتراکی
نظام کمیونزم کی طرح نفس ملکیت کا انکاری ہے جو اعتدال کی راہ فطرت کے
ہر گوشہ میں جاری و ساری ہے وہی اسلام کے معاشی نظام میں ہے اسلام کی
اخلاقی معاشرتی تعلیم جن روحانی قدروں پر رکھی گئی ہے وہ انسانوں کو خود غرضی
سے ہٹا کر بے غرضی و بے لوثی و ایثار پسندی کی طرف لے جاتی اور انسانوں میں

باہمی انس و محبت کو پروان چڑھاتی اور طبقاتی جنگ کی آگ بھڑکانے کے بجائے بین الانسانی ہمدردی کے جذبہ کو ابھار کر پوری انسانیت کو مل جل کر رہنے کی دعوت دیتی ہے اس کا معاشی نظام اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے

اقترابات و ارتفاقات

امام ولی اللہ دہلوی نے اپنی حکمت ربانی یا فکر الہامی میں انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تقاضوں کے لیے اقترابات اور ارتفاقات کی اصطلاحات وضع فرمائی ہیں

اقترابات جس کا مطلب قربِ خداوندی ہے اس کی تفصیل بتاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ انسان اپنے ریاضت و مجاہدہ سے اس مقام پر پہونچ جائے کہ انسانی خواص کا جامہ اتار کر خدا کی ذات میں گم ہوجائے (جیسے کہ بعض روحانی مذاہب میں اسی کو مقصود حیات یا راہ نجات بتایا گیا ہے جیسے بدھ مت یا عیسائیت)، لیکن دوسرا تقرب الی اللہ کا راستہ جو صحیح راستہ ہے کہ انسان اپنے اعضاء و جوارح کی صحیح تربیت کرے اور انسانیت کے جامعہ میں رہتے ہوئے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے شریعت کے اس شعبہ کو عبادات سے موسوم کیا جاتا ہے (اور یہی تعلیمات انبیاء علیہم السلام کا مقصد ہے۔)

(۲) ارتفاقات سے مراد اجتماعی ادارے ہیں یعنی انسان کی اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے جن قوانین و ضوابط کی ضرورت ہے وہ عمومی ہیں فطرت انسانی کے قواعد پر پورے اتریں خواہ ظاہری شکل و صورت میں ایک دوسرے سے الگ ہوں۔ کیوں کہ ہر قوم خاص خاص عادتیں اور خاص خاص خصلتیں ہوتی ہیں یوں تو انسانی فطرت اپنے لیے ارتفاق یعنی اجتماعی ادارے کی تشکیل کا تقاضہ کرتی ہے جو ترقی انسانی کا پہلا درجہ ہے دوسرے درجہ میں تجرباتی علوم (سائنس) اور

صحیح اخلاق پیدا ہوتے ہیں (بدور بازغہ ص۵۱) پھر اسی کتاب بدور بازغہ میں شاہ صاحب نے اقترابات وارتفاقات کے باہمی ربط کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے ارشاد فرماتے ہیں وہ تمام ارتفاقات (اجتماعی ادارے) جن پر انسانی نظام تمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے وہ کُل کے کُل اقترابات یعنی خدا تک پہونچنے کے ذرائع و وسائل ہیں۔ حق شناسی وحق طلبی اور خدارسی فطرت انسانی میں روز ازل سے ودیعت ہیں جو عبادات واحسان اور برائیوں سے احتراز پیدا کرنے کا باعث بنتے ہیں یہ ایسے امور ہیں جو مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان کے کلی قاعدے تو ایک ہیں مگر ان کی شکلیں الگ الگ ہیں جیسے نکاح کا اعلان ڈھول باجے کی شکل میں کچھ لوگوں نے کیا لیکن مذہب اسلام نے گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کرنے کے اعلان کو ضروری ٹھہرایا اصل مقصد نکاح سے ایک عورت کا ایک مرد کے لیے تعین کہ دوسرا مرد اس کے اندر دخیل نہ ہو سکے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ملت حنیفی کے نقطۂ نظر سے ہم نے اقترابات وارتفاقات کی شکلیں بطور مثال پیش کی ہیں وہ ان دو شکلوں تک محدود نہیں بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جہاں تک اصل معاملہ کا تعلق ہے کوئی ملّت کوئی مذہبی گروہ ایسا نہیں جو اصل حقیقت کو تسلیم نہ کرتا ہو جو شخص بھی انسان کہے جانے کا مستحق ہے وہ اصلِ حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہے کہ وہ احکام کو بجا نہ لائے جھگڑا اصل حقیقت میں نہیں ہوتا نزاع اس حقیقت کو مختلف شکلوں میں پیش کرنے میں پیدا ہوتا ہے (بدور بازغہ ص۱۸۰)

مذہب کے اصل الاصول

شاہ صاحبؒ اپنی بالغ نظری وژرف نگاری سے مذاہب عالم کے اصل الاصول تک پہونچکر اس کی تشریح عالم گیر انسانی قدروں کی بنیاد پر کرتے ہیں چنانچہ اپنی کتاب لمعات میں لکھتے ہیں کہ جو اصول تمام مذاہب کے نقطہ مشترک

بن سکتے ہیں وہ چار اصول ہیں (۱) خدا پرستی (۲) عدل وانصاف (۳) صحت و صفائی (۴) تربیت نفس۔

شاہ صاحبؒ کے نزدیک ہر مذہب کا فرض ہے کہ ان چار مقاصد کے لیے انسانوں کی رہنمائی کرے گو مذہب کے طریقے علیحدہ علیحدہ ہوں لیکن ہر مذہب کی یہی کوشش ہونا چاہیے کہ وہ خدا تک پہونچنے کی راہ لوگوں کو بتائے ـــــ نیکو کاروں کی پہچان خدا پرستی ہے نہ کہ رسوم پرستی بہرحال ہمارے نزدیک شاہ صاحب کے فکر کی سب سے بڑی خصوصیت حیات انسانی میں اقتصادی و معاشی توازن کا نظریہ ہے ان کی یہ فکر روح عصر سے ہم آہنگ ہے مغربی مفکرین کو جب کہ اس عدم معاشی مساوات کا احساس تک نہ ہوا تھا مشرق کے ایک حکیم صوفی نے اپنے الہام سے نہ صرف انسانیت کے اندر پھیلی ہوئی اس مرض کی تشخیص کی بلکہ اس مہلک و مزمن بیماری کے لیے نسخہ شفا بھی تجویز فرمایا شاہ صاحبؒ اپنے عقیدے کو اپنی کتابوں میں بار بار دہراتے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں کہ جس سوسائٹی میں اقتصادی توازن نہ ہو نہ وہاں عدل وانصاف قائم ہو سکتا ہے اور نہ مذہب ہی اپنا اچھا اثر ڈال سکتا ہے شاہ صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ جس طرح رسولؐ اللہ کے زمانے میں قیصر و کسریٰ نے متمدن دنیا کو مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا ـــ اور قدرت الٰہی نے اس مریضانہ نظام کو ختم کر دیا اسی طرح آج کی حکمراں سوسائٹی بھی ان اجتماعی بیماریوں سے کھوکھلی ہو چکی ہے اور اس کا مٹنا یقینی ہے ـــــ (حجۃ اللہ البالغہ)

شاہ صاحبؒ نے اس عقیدے کو اپنی مختلف کتابوں میں بار بار دہرایا ہے جس کا نقل کرنا طول عمل ہے لیکن اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ شاہ صاحبؒ کے نزدیک قرآن کی انقلابی دعوت اس وقت تک عالم میں قائم نہیں ہو سکتی جب تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ اور مہاجرین کے معاشی و معاشرتی طرز عمل کو نمونۂ حیات نہ بنایا جائے۔ جن کو قرآن کریم نے

اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کا لقب دیا ہے اور جنہوں نے اپنے گھر بار اور تمام کاروبار کو اعلیٰ مقصد کے لیے ٹھکرا دیا ان صحابہؓ کی زندگیاں ہمارے لیے شمع ہدایت ہیں شاہ صاحبؒ کے نزدیک صحابہؓ کی انقلابی روح اور ان کی سیرت ایک معیار اور مثالی نمونہ ہے۔ (تحریک صـ۱۶)

مرزا مظہر جانِ جاناں کے تصدیقی کلمات

شاہ صاحبؒ کے یہ انقلابی نظریات اس دور کے خیالات سے ہم آہنگ نہ تھے وہ عہد مستقبل سے تعلق رکھتے تھے آج کل کی زبان میں شاہ صاحبؒ وقت سے پہلے پیدا ہوگئے تھے بقول غالبؔ ؎

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اس لیے ہم ان افکار پر اس عہد کے روشن ضمیر و صاحب دل بزرگ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں کے تصدیقی کلمات نقل کرتے ہیں۔ "حضرت شاہ ولی اللہؒ کا نیا طریقہ بیان معارف و علوم کے اسرار کی گہرائیوں میں ان کی تحقیقات کا خاص طرز ہے وہ علمائے ربانیین میں سے ہیں ایسے محقق و صوفی جو علوم ظاہری و باطنی کے جامع ہوں اور ایسے علوم بیان کئے ہوں دور ماضی میں بھی کم ہوئے ہیں۔ (کلمات طیبات صـ۸۳-۸۴)

اب ہم شاہ صاحبؒ کے انقلابی نظریات کو بصورت دفعات تحریر کرتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے حرمین شریفین کا سفر ۱۷۳۰ء ۱۱۴۳ھ میں کیا وہاں سے واپسی پر محسوس کرلیا کہ تمام خرابیوں کی بنیاد وہ نظام حیات ہے جو مغل حکومت کے زیر سایہ انفرادی و اجتماعی زندگی پر چھایا ہوا ہے اس لیے ۱۷۳۱ء ۱۱۴۴ھ میں ذریعہ الہام بوسیدہ نظام کی جگہ نیا نظام قائم کرنے کا اظہار فرمایا اور اس بات کا اشارہ کیا کہ اسلام کی تکمیل کے لیے انبیاء جیسے صبر کی ضرورت ہے (تفہیمات صـ۱۲ تا صـ۱۲۱)

چنانچہ اس وقت کے امرا اور رؤسا اور اونچے طبقہ کے ہر حلقہ کے لوگوں کی خرابیوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور اس کی بدانجامی سے آگاہ کیا لیکن اس تخریب کے پردہ سے تعمیری پروگرام کیونکر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو اس کے لیے حسب ذیل اقتصادی اصول بتائے۔

شاہ صاحب کے اقتصادی اصول

(۱) دولت کی اصل بنیاد محنت ہے مزدور اور کسان قوت کاسبہ ہیں ان کا تعاون مدنیت کی روح رواں ہے جب تک کوئی شخص ملک و قوم کے لیے کام نہ کرے ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب سیاست المدن البدور البازغہ۔ بحث الارتفاق۔ الثالث)

(۲) مزدور کاشت کار اور جو لوگ ملک و قوم کے لیے ذہنی و دماغی کام کریں وہی دولت کے مستحق ہیں ان کی ترقی و خوشحالی ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی ہے جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے (حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء الرزق)

(۳) جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے مزدوروں کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے قوم کا دشمن ہے (حجۃ اللہ البالغہ باب السیاست المدنی)

(۴) جو پیداوار اور آمدنی باہمی تعاون کے اصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب ابتغاء رزق)

(۵) تعاون باہمی کا بڑا ذریعہ تجارت ہے لہذا اس کو صحیح اصول پر جاری رہنا چاہیے تاجروں کے لیے بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کا competition کرکے تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی (حجۃ اللہ البالغہ باب البیوع المنہی عنہا)

(۶) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کردے ملک

اور انسانیت کے لیے تباہ کن ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ باب الارتفاق الرابع)

(۷) وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کے عیش و عشرت کے باعث دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو اس کو جلد از جلد ختم کیا جائے اور عوام کو مساویانہ زندگی کا موقع دیا جائے (حجۃ اللہ باب الرسوم السائرہ بین الناس)، باب السیاست المدنیہ۔

(۸) زمین کا حقیقی، مالک خدا ہے باشندگان ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کا حق ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے حق نفع اندوزی میں دوسروں کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہے (حجۃ اللہ باب ابتغاء الرزق)

سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول

(۱) انسان انسان برابر ہیں کسی کو حق نہیں کہ وہ خود کو مالک الملک، ملک الناس کہے یا انسانوں کی جانوں کا مالک خود کو تصور کرے نہ یہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔ (منصب امامت ذکر سلطنت صفحہ ۱۳۱)

(۲)، حکومت کے سربراہ کی حیثیت وہ ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے متولی اگر ضرورت مند ہو تو بقدرِ ضرورت اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گذار سکے (ازالۃ الخفا جلد دوم)

(۳) جوا اور سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا۔

بنیادی حقوق کے متعلق شاہ صاحب کے نظریات

(۱) روٹی کپڑا مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کو تعلیم و تربیت دے سکے بلا لحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۲) مذہب رنگ و تفاوت کے بغیر عام باشندگان کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف اور اس کے جان و مال کی حفاظت، ان کی عزت و ناموس حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت ہر باشندۂ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(۳) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر فرقہ کا بنیادی حق ہے (حجۃ اللہ البالغہ اور البذور البازغہ)

مذہبی حقوق

(۱) (الف) دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے اس کے پیش کرنیوالے ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

(ب) داعیان صداقت ہر ملک اور ہر قوم میں گذرے ہیں ان سب کا احترام ضروری ہے۔

(ج) سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں مثلاً پروردگار کی عبادت، اس کے لیے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

(د) ساری دنیا کے سماجی اصول اور ان کا مقصد و منشا۔ ایک ہے۔ مثلاً ہر ایک مذہب اور ہر ایک فرقہ جنسی انارکی کو ناپسند اور اخلاقی جرم قرار دیتا ہے ایسے ہر فرقہ مردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے اور اختلاف اسی میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے، یا جلا کر۔

(حجۃ اللہ البالغہ باب اصل الدین واحد البدور البازغہ)

(۲) جہاد ایک مقدس فرض ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں مقدس چیز کے لیے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے یہاں تک کہ اپنی ہستی کو ان اصولوں

کے لیے فنا کرلے۔ (البذور البازغہ بحث الارتفاق الثالث اور حجۃ اللہ البالغہ)

شاہ صاحب اس انقلاب کے طریقۂ کار میں عدم تشدد (اہنسا) کے قائل نہیں معلوم ہوتے وہ فوجی طاقت سے انقلاب برپا کرنے کے قائل تھے مگر وہ فوجی طاقت جس کی تربیت جہاد کے اصول پر ہوئی ہو جس کی حقیقت دشمن کشی، غارت گری اور ملک گیری نہیں بلکہ اس کی حقیقت محنت، جفاکشی، صبر و استقلال، ایثار و قربانی یعنی اپنی ذات اور ذاتی مفادات کو ختم کرکے اعلیٰ مقاصد انسانی کی تکمیل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لینا پھر اس مقصد کے لیے اپنی ہر چیز یہاں تک کہ زندگی کو بھی داؤ پر لگا دینا ہے جس کو شہادت کہا جاتا ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے جب اپنی انقلابی دعوت فکِّ کُلِّ نظام کا الہامی زبان میں اعلان کیا اس وقت یورپ اربابِ کلیسا کی گرفت میں تھا اور کوپرنیکس گلیلیو جیسے آزاد مفکرین کو بے دریغ تہ تیغ کیا جا رہا تھا۔ قدیم پاپائیت کا اقتدار پرستانہ دور عہد پیری میں پہونچ کر جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہر جدید نظریہ ہر ایجاد کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا اور اس کو مذہب کے مخالف قرار دیکر قابل گردن زدنی قرار دے رہا تھا قدیم کلیسائی تہذیب دم توڑ رہی تھی اور جدید سائنسی تہذیب اس کے بطن سے ردِّ عمل کے طور پر نمودار ہو رہی تھی ابھی انقلابِ فرانس ۱۷۷۹ء کی صبح طلوع ہونے میں آدھی صدی اور مشینی دور کے آغاز میں چالیس سال باقی تھے کمیونزم کے معلّم اول کارل مارکس کے اشتراکی مینی فیسٹو میں ایک صدی اور فرانس کے انقلاب ۱۷۷۹ء میں اٹھاون سال باقی تھے اشتراکی مینی فیسٹو ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اور پہلی انٹرنیشنل کانفرنس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوئی اس حساب سے شاہ صاحب پہلی انٹرنیشنل کانفرنس سے ایک سو دس سال اور مارکس کے اعلانِ اشتراکیت سے پچاسی سال پہلے وصال فرما چکے تھے۔ (تحریک شاہ ولی اللہؒ ص۶۲)

اس وقت جیسا کہ لکھا گیا مغل شہنشاہیت کا چراغ جھلملا رہا تھا اور ان کے تحت

ناخلف حکمراں عیش و عشرت کے شبستاں میں محو خواب تھے شاہ صاحبؒ کا قلب و دماغ بیدار اور ان کی روح پاک خدا اور اس کے مخلوق کی محبت میں سرشار انسانیت کے لیے راہِ نجات کی تلاش میں تھے شاہ صاحبؒ نے جو انقلابی پروگرام عالم انسانیت کے لیے تجویز کیا اس کو شخصی حکومت کی جکڑ بندیوں کی وجہ سے باقاعدہ منشور (مینی فیسٹو) کی شکل نہ دے سکے لیکن حجۃ البالغہ بدور بازغہ مختلف کتابوں میں ان انقلابی دفعات کو حقوق انسانی کے نام سے پھیلا دیا ہے۔

شاہ صاحب کی دعوت کی اساس

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دعوت کا پہلا مخاطب اہل عجم کو بنایا ہے جس طرح قرآن حکیم نے اہل عرب کو اپنا اوّلین مخاطب بنایا تھا۔ پھر انکے واسطے سے تمام عالم کو مخاطب بنایا اہل عرب اپنے مزاج عقلی کے اعتبار سے سادہ اور سپاٹ فکری سے زیادہ عملی قوم ہے جب کہ عجمی اقوام جن کے اندر خصوصیت سے ایران و ہندوستان شامل ہیں عملی سے زیادہ فکری ہیں اسلامی تعلیمات فکر و عمل کے حسین امتزاج کا مجموعہ ہے وہ صد ہا رنگ و بُو کے پھولوں کا دلکش چمنستان ہے جو ایک عالم گیر اور بین الاقوامی مذہب کا خاصہ ہونا چاہیے اس کے لیے ہر قوم نے اسلام کو اختیار کر کے خوشہ چینی کی اور اپنے مزاج اور ماحول کے اعتبار سے زندگی اور معاشرے کے سلیقے بنائے قرآن و سنت کے کلیات (قواعد کلیہ) کی روشنی میں فرعیات و جزئیات کا استخراج مصالح شرعیہ اور احوال زمانہ کے اعتبار سے علماء و فقہاء کرتے اور اسلامی معاشرے کو آگے بڑھاتے رہے۔ حضرت شاہ صاحب (ولادت ۱۱۱۴ھ وفات ۱۱۷۶ھ) نے اسی ماحول کے زیر سایہ اٹھارہویں صدی میں اپنی دعوت تجدید کا افتتاح کیا شاہ صاحب سلف صالح کے مسلک کے مطابق قرآن و سنت کو اصل ماخذ مانتے ہیں پھر اس کی تفسیر ایسے مجتہدانہ اسلوب سے فرماتے ہیں جو ہندوستانی ذہنیت کے لیے قابلِ قبول

ہو جاتی ہے امام ابن تیمیہ اور ان کے پیرو کار امام شیخ محمد بن وہاب نجدی (ولادت ۱۱۱۵ھ وفات ۱۲۰۶ھ)، محمد بن علی بن محمد شوکانی (ولادت ۱۱۷۲ھ وفات ۱۲۵۰ھ)، اسلامی توحید کی ایسی خشک و سخت گیر انداز میں تعبیر کرتے ہیں جو عرب کی ذہنیت سے میل کھاتی جس کے اندر فکر سے زیادہ عمل کا پہلو غالب رہتا ہے لیکن ایرانی ذہنیت اس سے تسکین نہیں پاتی۔

ہمارے نزدیک ایمان کے بسیط و مرکب ہونے میں فقہاء و محدثین کا اختلاف اسی ذہنیت کا شاخسانہ ہے (واللہ اعلم)

شاہ ولی اللہؒ نے ایرانی و ہندوستانی ذہنیت کو اسلام سے قریب کرنے کے لیے اپنی دعوت کی اساس وحدت الوجود پر رکھی ہے جیسا کہ لکھا گیا۔

شاہ صاحب کا یہ انقلابی اسلامی فکر انسانی قدروں پر مبنی ہے وہ پوری انسانیت کے لیے ایسے معتدل و خوش گوار انقلاب کے داعی ہیں جس کا فائدہ ہر فرد انسانی کو پہونچ سکے حضرت شاہ صاحبؒ ایک فرد کو انسانِ صغیر اور پوری انسانی برادری کو انسان کبیر قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک پوری انسانیت کو اتحاد کی لڑی میں پرونے والا ہر عمل اور جملہ بنی آدم کو ایک کرنے میں مدد دینے والا ہر قدم زندگی کو ترقی کی منزل تک پہونچانے والا عمل ہے اسی طرح عالمگیر امن و امان اور باہمی ربط و اتصال کو قطع کرنے والا ایسا ہی ہے جیسا کہ انسانی جسم میں کسی عضو کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے جس کو صدیوں پہلے بلبل شیراز (سعدی شیرازی نے) یوں ادا فرمایا ہے ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ۔۔۔ کہ در آفرینش زیک جوہر اند
چوں عضو بدرد آورد روزگار ۔۔۔ دگر عضو ہارا نماند قرار

شاہ صاحبؒ اس کے قائل ہیں کہ قرآنی اصولوں پر جو انقلاب برپا ہوگا اور جو انقلابی سوسائٹی قائم ہوگی اس سے وہ ہی نتائج پیدا ہوں گے جو قرن اول میں ہوتے تھے کسی آدمی یا زمانے کی خصوصیت نہیں۔

توحید اسلامی کی بنیادی نقطہ توحید فی العبادۃ ہے جس کے اندر خدائے وحدہٗ لاشریک کی تنہا عبادت کے عقیدہ کا نقش دل میں بٹھایا گیا ہے۔ چونکہ عرب کے مشرک ہو یا ہندو۔ یونان کے سب کے سب شرک فی العبادت کی لعنت میں گرفتار تھے۔ دیوی دیوتاؤں کو تقرب خداوندی کا وسیلہ جانتے تھے اس لیے توحید کے ذریعہ شرک کی ہر ہر بنیاد کو اکھیڑ کر پھینک دیا گیا۔ توحید فی العبادت کا محکم و بنیادی عقیدہ انسان کی عملی زندگی کا دروازہ کھولتا ہے اور خدائے وحدہٗ لاشریک کے حکم کے بجالانے اور اس کے آگے سر تسلیم خم کر دینے اور اپنی ہر حاجت اور ہر ضرورت کیلئے اس کے ہی آگے ہاتھ پھیلانے کی دعوت دیتا ہے جو عبادت و استعانت کا خلاصہ ہے دعوت توحید القدر سے مادی علائق اور ہر طرح کے رشتوں کو توڑ کر خدائے وحدہٗ لاشریک سے رشتہ جوڑتی ہے۔ بے شک معبود حقیقی ایک ہی ہے۔ اسکے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ یہی انسانی ضمیر و وجدانی کا فیصلہ ہے۔ لیکن عقل انسانی اپنی بے چین فطرت شک پسند مزاج کی وجہ سے وجدان کے اس فیصلہ پر فوراً سر خم نہیں کرتی بلکہ ذرا آگے بڑھ کر اس کی دریافت، اس کی فکری بنیاد کی کھوج کرتی ہے۔ کہ وہ ذات احد لم یزل و لم یزال ہے۔ تنہا عبادت کی وہی مستحق ہو سکتی ہے شرکت کی اس کے اندر ذرّہ برابر بھی گنجائش نہیں اگرچہ حقیقت کی تہ اور اصلیت تک عقل خالص کی رسائی دشوار ہے جب تک نورِ وحی نہ شامل حال ہو۔ لیکن عقل ادراک کے لیے کبھی تھکتی نہیں اپنے غور و فکر کے وظیفہ کو وہ کبھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتی ہے اس لیے وہ محفل کائنات میں وجود کی پھیلی ہوئی روشنیوں کو اپنے دام خیال میں اسیر کرنے اور اس کے اصل مطلع و منبع تک پہونچنے کے لیے ہر دم اور ہمہ دم بے تاب و بے قرار ہے۔ وہ جب اپنے فکر و خیال کے جال کو زمین و آسمان میں پھیلاتی ہے تو اس کو ہر جگہ ایک قانون وحدت کی بنیادی جلوہ فرمائی اور ذرے سے آفتاب تک اور قطرے سے دریا تک ایک ہی تجلی کی نور افشانی نظر آتی ہے۔ جب انسانی فکر خدا کی

وحدانیت کے بحر بیکراں اور توحید خداوندی کے دریائے بے پایاں میں غوطہ کھاتی ہے تو ایک گوہر بے بہا اس کے ہاتھ آتا ہے کہ اصل وجود اس آفتاب حقیقت کا ہے۔ جو اللہ نور السمٰوات والارض کا مظہر اعلیٰ ہے جو کچھ اس کے ماسوا زمین سے آسمان تک وہ اس نور مطلق کی پرچھائیاں اور سائے ہیں سورج کی ان ہی ہفت رنگ شعاعوں سے دنیا آئینہ خانہ بنی ہوئی ہے ساری محفل کائنات اسی روشنی سے مستنیر اور جلوہ تاب ہے جب بھی آفتاب کسی چیز سے اپنا رُخ پھیرے وہیں اُس پر ظلمت عدم طاری ہو جاتی ہے۔ اس لیے اصل وجود اور حقیقی وجود صرف آفتاب حقیقت کا ہے۔ اور پوری کائنات کا وجود ظلی و عارضی ہے وحدت الوجود کی صد ہا پیرائے ہیں۔

جس کا خلاصہ ہم نے اپنے لفظوں میں بیان کر دیا یہی فکر ایرانی و ہندوستانی یونان کے حکماء و فضلاء اور شعراء میں پھیلی ہوئی تھی اور صدیوں سے وہاں کے عوام اس سے مانوس چلے آرہے تھے بقول مولانا نانوتوی کہ وحدۃ الوجود ایک حقیقت ہے البتہ وحدت الموجودات مختلف فیہ اور معرکۃ آرا مسئلہ ہے ہندوستان میں ویدانت کا فلسفہ بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے البتہ اسلامی تصوف کے وحدت الوجود کی حقیقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بقول مولانا روم شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) میں تحریری اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں لیکن ان کے درمیان مشرق اور مغرب کا فرق ہے چنانچہ وحدت الوجود کے داعی اکبر حضرت شیخ اکبر نے فتوحات میں لکھا ہے۔

ہو الرب رب وان تنزل ۔۔۔ والعبد عبد وان ترقی

خدا ہی رہے گا بلند بالا۔ اور فکر انسانی سے ماورا۔ چاہے اس کو تنزلات کی سیڑھیوں سے کتنا ہی اتارا جائے اور بندہ بندہ ہی رہے گا چاہے اسکو ترقیات کتنی ہی بلند چوٹیوں پر چڑھا دیا جائے۔ بہر حال ایرانی و ہندوستانی ذہنیت وحدت الوجود سے یگونہ مناسبت وانسیت رکھتی ہے اسلئے حضرت شاہ ولی اللہ رح

اس دعوت کو اس بنیاد پر اہل مشرق کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اگر چہ ہندوستان قدیم زمانہ سے شرک کا گڑھ رہا ہے اور آج شاید دنیا میں اس وقت واحد ملک ہے جہاں چھتیس ۳۶ کروڑ دیوتاؤں کا غلغلہ بلند ہے ۔ مگر علامہ ابو ریحان بیرونی نے تین مقامات پر ہندوؤں کے عقیدۂ توحید پر روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں کہ :۔ ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ وہ خدا واحد ہے ازلی جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہاء وہ اپنے فعل میں مختار ہے قادر ہے حکیم ہے زندہ ہے اور رہی بت پرستی ۔ ہندو عوام کی رسم کے طور پر ہے ہندوؤں کے خواص اس سے بری ہیں اوم کلمۂ تکوینی مسلمانوں کے بسم اللہ یا کے قائم مقام ہے (کتاب الہند صـ ۳۴-۱۴۴-۲۳) علامہ بیرونی کی ان تحقیقات سے قدیم ہندو قوم کے خواص ۔ یعنی اہل فکر و نظر کے یہاں توحید حقیقی کو جلوہ گر ہونے کا پتہ چلتا ہے ۔ لیکن یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعد کی فلسفیانہ موشگافیوں نے اصلی حقیقت کو گڈ مڈ کر دیا ۔ جس طرح اصلی صوفیائے اسلام کی طرف سے نہیں بلکہ بعض غلط متصوفین کی طرف سے اس مسئلہ کی ایسی غلط تعبیریں اختیار کی گئیں ۔ اور اصل حقیقت کے ساتھ غلط اجزاء کو خلط ملط کر کے خدا و بندہ کے لطیف و نازک پر پردہ ڈال دیا ۔ اس لیے حضرت مجدد الف ثانی ۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بر خود غلط صوفیاء کے خلط ملط کئے ہوئے غلط اجزاء سے پاک وصاف کر کے توحید حقیقی کا پاکیزہ عقیدہ پیش کیا ۔

تفہیمات الٰہیہ میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ہم سے پہلے جو مشائخ گزرے ہیں وہ وحدۃ الوجود کی سراغ میں بہت آگے بڑھ گئے اور ان کا علم اس منزل پر پہونچا کہ سب کچھ اللہ ہی اللہ ہے ان پر ملاء اعلیٰ میں وجود حقیقی ۔ اور مخلوقات میں جو اتحاد و اختلاف ہے اس کا علم مشکل ہوا ۔ پھر حضرت شیخ مجدد آئے اور اس علم کے ارد گرد جو ملاء اعلیٰ میں ہو چکا تھا ۔ گشت فرماتے رہے کبھی فرمایا کہ عالم وجود فی الخارج ہے ۔ اور کبھی عالم کو موہوم بتاتے

اور کبھی ارشاد فرمایا کہ عالم اسماء الٰہی کا پرتو ہے۔ لیکن اس مسئلہ کی صراحت نہ فرمائی۔ آخر کار اسی دور کا فاتح آیا۔ اس نے جو حقیقت تھی وہ کھول کر بیان کر دی۔ ص ۱۰۲،۱۰۱) اس کے مقابلہ میں علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور ان کے پیرکاروں نے اس خلط ملط اجزاء کے مل جانے کی وجہ سے حقیقت توحید کو اکھاڑ کر رکھ دیا اور وحدۃ الوجود کے ماننے والوں کو اپنی تیز مزاجی پر۔ اپنی پریشانی پر خارج اسلام قرار دیا۔ یہاں تک کہ ان کے قلم کی تیغ براں یا شمشیر عریاں سے شیخ اکبر جیسا عظم محدّث و صوفی بھی نہ بچ سکا۔ لیکن خود امام ابن تیمیہ کے ہندوستانی معتقدین اس بارے میں ان سے متفق نہ ہو سکے۔ مولانا اسمٰعیل صاحب شہید نے اپنی کتاب "العبقات" میں وحدۃ الوجود کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ کے مسلک کے خلاف رائے کا اظہار کیا ہے۔ ہمارے نواب صدیق حسن صاحب ابن عربی کے بارے میں اپنی رائے التاج المکلل میں اسطرح ظاہر کرتے ہیں۔ ابن عربی کے بارے میں صحیح نقطہ نظر وہی ہے جس پر محقق علماء (جو علم و عمل کے جامع ہیں) عامل ہیں وہ یہ کہ ان کے مسلک کے متعلق سکوت اختیار کیا جائے اور ان کے یہاں جو باتیں خلاف شرع نظر آتی ہیں ان کی تاویل کی جائے اور ان کی تکفیر سے روکا جائے ان کے علاوہ اور جو مشائخ گزرے ہیں جن کا تقویٰ سب کے نزدیک مسلم تھا اور ان کے علم و فضل کو سب مانتے ہیں اور عملی صالح ہیں وہ بلند مقام رکھتے تھے ان کے معاملہ میں یہی مسلک اختیار کرنا چاہیئے (التاج المکلل) ہندوستان میں اہل حدیث کے مسلک کے بانی ؐمبانی نذیر حسین دہلوی انھیں خاتم الآیۃ المحمدیہ کہہ کر پکارتے تھے اس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یہ اساطین علم و توحید ایرانی یا ہندوستانی فکر کی اصلیت کو پہونچ چکے تھے۔ بہرحال شاہ ولی اللہ صاحب نے قرآنی اصول دعوت کے اعتبار سے اس نقطہ مشترک کو اختیار کیا۔ جس کو عجمی یا ایرانی و ہندوستانی ذہن پہلے سے مانتا چلا آ رہا تھا:۔ اور تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ

سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا کے مصداق ایسے کلمہ کی طرف بلایا جس کو وہ پہلے سے تسلیم کرتے تھے۔ بڑے شاہ صاحب نے اپنے مخصوص شاگردوں کو اس دعوت کے لیے تیار کیا اور چھوٹے شاہ صاحب (شاہ عبدالعزیز صاحب) نے، اس دعوت الٰہی کو عام کیا چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے کہ سراج الہند کی صحبت مبارکہ یا محفل شریف میں جو شخص بھی بیٹھتا۔ (خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو) مطمئن ہو کر اٹھتا تھا۔ آپ کے یہاں ہر مشکل سے مشکل کا جواب موجود تھا۔ حکمت ولی اللہ کا آپ جیسا زبردست شارح اور عملی قائد پھر نہ مل سکا۔

ولی اللٰہی پارٹی کا اقدام

سب سے پہلے دعوت ولی اللٰہی کو پھیلانے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک جماعت پارٹی سراج الہند نے قائم فرمائی۔ اس جماعت کے دو بازو یا دو شعبے تھے۔ (۱) شعبہ ہدایت۔ وارشاد (۲) شعبہ جہاد۔ شعبہ ارشاد دوسرے شعبہ جہاد کے لیے بمنزلہ رسد اور کمک کے تھے اور اپنا مستقل وجود بھی رکھتا تھا چونکہ اصلاً اسلام اصلاحی دعوت ہے لیکن جب مخالف طاقتیں ہدایت اور ارشاد میں سدِ راہ بن جائیں تو وہ انقلابی جماعت بن جاتی ہے۔ ارشاد و ہدایت۔ یا تہذیب و اصلاح کا راستہ طویل ہے سخت کٹھن دشوار کانٹوں سے بھرا ہوا ہے اس راستہ میں زندگی مر مر کر جیتے جانے کا دوسرا نام ہے راہ جہاد میں اگرچہ خون سے بھرے ہوئے دریا سے گزرنا پڑتا ہے لیکن اس کا انجام یا نتیجہ کامیابی، یا ناکامی، سرداری یا بغاوت کی شکل میں جلد نکل آتا ہے۔
شاہ صاحب کے ذریعہ قائم شدہ دونوں جماعتیں ابتداء شانہ بشانہ ساتھ کام کرتی رہیں۔ لیکن آگے چل کر ایک دوسرے سے جدا ہونا بھی پڑا۔ چنانچہ پہلی جماعت نے قرآنی وحدیث کی تعلیم و اشاعت کو اپنا نصب العین بنایا اور ہندوستانی و افغانستانی اور ایشیاء کے علاقوں میں ولی اللہ چراغ حکمت سے

یہ سارے چراغ روشن ہوئے اور ہر علاقہ میں اسی مشرق حکمت سے روشنیاں پھیلی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے آج کل جہاں بھی قال اللہ وقال رسول اللہ کی آوازیں گونج رہی ہیں وہ اسی مکتبۂ ولی اللہ کی صدا ہائے بازگشت ہیں اور قرآن و سنت کے یہ جلتے ہوئے چراغ پھونکوں سے نہ بجھائے جائیں گے لیکن دعوت جہاد کو کہ معرکہ بالاکوٹ پر ختم کر دیا جاتا ہے یہ امر حقیقت سے بعید ہے ولی اللہی دعوت اسکے بعد بھی فرنگی سامراج سے.... اور خود ہندوستان میں مختلف تحریکات کے واسطے لوہا لیتی رہی امام عبدالعزیز کے بعد شاہ اسحاق و شاہ یعقوب اور ان کے بعد حاجی امداد اللہ۔ اور مولانا نانوتوی، اور مولانا گنگوہی سامراج نبرد آزما ہے آخری امام حضرت شیخ الہند نے اسی تحریک جہاد کو بیرونی اسلامی حکومتوں کی امداد و معاونت جاری کرنے کا منصوبہ بنایا جو حالت کی نظربندی پر ختم ہوا۔

ولی اللہی دعوت کی کامیابی

جیسے کہ لکھا گیا تاریخ انسانی سمندر کی طرح ہے جہاں ہمیشہ مد و جزر ہوتا رہتا ہے جس کی رفتار اکثر مدھم اور سست ہوتی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی طوفانی موجوں کا ایسا زور ہو جاتا ہے کہ بہت سے جزیرے غرقاب ہو جاتے اور بہت سے نئے جزیرے سطح بحر پر نمودار ہو جاتے ہیں چنانچہ تاریخ انسانی کا بھی یہی حال ہے کہ اس کی انقلابی لہروں کی وسعت میں اگر بہت سی قومیں ڈوب جاتی اور بہت سی نئی قومیں ابھر آتی ہیں یوں تو تاریخ انسانی میں ہمیشہ اُتار چڑھاؤ جاری رہتا ہے لیکن بعض صدیوں میں ایسے طوفانی خیز انقلابات برپا ہوتے ہیں کہ جنھوں نے سطح کو زیر و زبر کر دیا ہے چنانچہ سولھویں ۱۶ و سترھویں ۱۷ صدی عیسوی اور گیارہویں بارہویں صدی ہجری مشرق کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس نے بہت سی قوموں کو اوپر اٹھایا اور بہت سی قوموں کو نیچے گرا دیا ان ہی صدیوں میں ہمارے ملک کے اندر حکومت مغلیہ

عروج پر پہونچ کر زوال پذیر ہوئی۔

اسی افراتفری کے دور میں مرکز کی کمزوری نے طوائف الملوکی پیدا کی سلطنت آصفیہ لکھنؤ ٹینالول کی ریاست روہیل کھنڈ حیدرآباد، بھوپال، رام پور اور ٹونک مسلم ریاستیں قائم ہوئی۔ اسی مادی زوال کے پہلو میں سے روحانی تحریکات ابھریں۔

مسلم افغانی ترک کے دور میں جس طرح تخت حکومت پر طاقت ور و مدبّر شخصیتیں بیٹھ کر ملک کو ترقی و خوش حالی کے راستے پر آگے بڑھاتی گئی۔ اسی طرح روحانی مسندوں پر ایسی عظیم روحانی شخصیتیں قدرت کی طرف سے ظاہر ہوتیں کہ جن کی روحانی سلطنت نے مادی شہنشاہیت کو بھی دبا دیا تاریخ اسلام کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا ہزار سالہ دور میں روحانی شخصیتوں کا دور تھا۔ جنہوں نے باطنی اصلاح و تربیت کے زبردست کارنامے انجام دیئے سید الطائفہ حضرت جنیدؒ بغدادی، حضرت بایزید بسطامی، شیدنا شیخ عبدالقادرؒ جیلانی خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی خواجہ شہاب الدین سہروردی۔ خواجہ بہاؤ الدین زکریا ملتانی، سہروردی خواجہ بہاؤالدین نقش بندی، خواجہ عبیداللہ احرار۔ خواجہ نظام الدین اولیاء۔ خواجہ علاءالدین علی احمد صابر۔ خواجہ باقی باللہ۔ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی جیسے زبردست روحانی مشائخ گزرے ہیں جن کی باطنی فتوحات سے تاریخ بھری ہوئی ہے۔ لیکن دور ہزار سالہ کے بعد جب دوسرا دور آیا تو پھر انفرادی شخصیتوں کا یہ چھلاجاہ و جلال روحانی شکوہ ظہور میں نہیں آیا جماعتوں نے ان کی جگہ لے لی۔ گویا شخصیت کے ظہور کے بجائے اجتماعی یا جمہوری رنگ میں مادیت کی طرح روحانیت جلوہ گر ہوئی اس اجتماعیت کے دور میں ولی اللہی جماعت کا سب سے زبردست ہاتھ ہے ولی اللہی دعوت سے پہلے قرآن و حدیث کا ہمارے ملک میں عام چرچہ نہ تھا، سندھ، گجرات، اور کوکن میں محدثین ضرور پیدا ہوئے لیکن علم حدیث

عوام تک نہ پہونچ سکا۔

ولی اللہی دعوت سے پورا ملک قرآن وحدیث کے غلغلوں سے معمور ہوگیا اور شمال سے جنوب تک قرآن وسنت کی اشاعت کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ چنانچہ سراج الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی ذات بابرکات سند الکل کی حیثیت رکھتی ہے ان سے شاہ ولی اللہ کی دونوں دعوتوں کو فروغ حاصل ہوا۔ دعوت جہاد اور دعوت ارشاد بہرحال یہی وہ صدی ہے جب کہ مغربی ممالک نے صدیوں کے خواب غفلت سے بیدار ہوکر ایک نئی انگڑائی لی اور کلیسائی نظام کو توڑ کر (جو صدیوں سے شہنشاہیت کا مددگار اور دبیل بن کر عوام پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہا تھا) حریت وآزادی کا نعرہ بلند کیا اور سینٹ پال کی جھوٹی عیسائیت کی تار وپود کو بکھیر کر رکھ دیا کلیسائی نظام کے مقابلہ میں ان کی زبردست قربانیاں رنگ لائیں۔ اور سائنس جدید کے ذریعہ علم تحقیق کا پرچم بلند ہوا۔ زندگی کی ایک متحرک لہر تھی جو پورے یوروپ میں پھیل گئی اور ترقیات کا ایک ولولہ آفریں طوفان تھا جو غلط وباطل عقائد اور پچھلے دقیانوسی افکار وخیالات کو بہالے گیا۔ سترہویں صدی میں مغربی اقوام سائنسی ہتھیاروں سے مسلح ہوکر مادی فلسفہ کے تحت جس نے عیسائیت کے مقابلہ میں فتح حاصل کرلی تھی۔ مشرقی ممالک پر حملہ آور ہوگئیں کیوں کہ مادیت کی بناء پر ہر طاقت ور کو کمزور پر حکومت اور اس کی محنت کے استحصال کا (ناجائز نفع اندوزی) کا حق حاصل ہے ان یوری قوموں کے جنگی وتجارتی بیڑے مشرق کے ساحلوں پر اترنے لگے۔ اسلام جو ایک ہزار سال سے مشرقی اقوام کی قیادت کررہا تھا۔ اس کے نام لیوا اقتدار اور سیاست کے چکر میں پھنس کر اب خانہ جنگی اور برادر کشی میں مصروف عوام اور رعایا، کی فرائض کی ادائیگی سے غفلت پسندی کا شکار ہوچکے تھے اکثر مسلم ممالک میں مذہب کے نام پر، جاہل، فریبی مکار پیروں اور جھوٹے دنیادار عالموں نے مسلم عوام کو اپنے جال میں پھانس لیا اور دین کے

کے ذریعہ دنیا کمانا ان کا مشغلہ بن گیا تھا اور مذہب کی روح سے بے گانہ ہو کر رسوم و روایات کو انھوں نے اصل مذہب قرار دے رکھا تھا علاوہ ازیں دنیا کی دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول سے ان کے باطل افکار و نظریات خود مذہب اسلام میں داخل ہو گئے تھے اسلام کی نکھری اُجلی اور صاف و شفاف توحید، شرک کی آمیزش سے گندی اور میلی ہو گئی تھی پیر پرستی نے قبر پرستی کا راستہ صاف کر دیا تھا۔ کیا عرب کیا عجم کیا ایران کیا افغانستان اور کیا ہندوستان روح مذہب کے خلاف ایک ایسی صورتِ حال پیدا ہو چکی تھی۔ اسلئے قانون فطرت کے مطابق اصلاح و انقلاب کی ضرورت تھی جس طرح نجد و حجاز میں امام عبدالوہاب (ولادت ۱۱۱۵ھ وفات ۱۲۰۶ھ) اور یمن میں محمد ابن علی شوکانی (ولادت ۱۱۷۲ھ وفات ۱۲۵۰ھ) عرب میں اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ نے ایران و ہند کو اور افغانستان کو اپنی دعوت کا جولان گاہ بنایا۔ عرب ممالک کے بہت سے حصوں میں زیادہ تر شافعی مسلک اور کمتر حنبلی مسلک کے ماننے والے ہیں جب کہ مسجد اقصیٰ اور افریقی ممالک میں فقہہ مالکی کو عام مقبولیت حاصل ہے لیکن ایشیاء کے بہت سے بڑے علاقے میں حنفی مسلک کو فروغ حاصل ہوا۔ اور اکثر مسلمان حکومتوں کا یہی مذہب رہا۔ لیکن حنفی علماء کو حکومت چلانے کے لیے حدیث سے زیادہ فقہ کی طرف توجہات کو مبذول کرنا پڑا۔ نت نئے حوادث اور ہنگامی ضروریات و مشکلات کے حل کرنے کے لیے فقہی استنباطات کی ضرورت پیدا ہوتی رہی کیوں کہ نظام قضا زیادہ تر حنفی علماء کے ہاتھوں میں رہا۔

یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک انقلابی عالم اور ایرانی طرز فکر کے مجتہد تھے اس لیے انھوں نے فقہ کی ترتیب و تدوین ایسے طریقہ سے اختیار کی کہ عجمی ذہن بھی اس کو فوراً قبول کر لے یاد رکھئے کہ ایرانی ذہن ہر مسئلہ کو ایک عقلی اور کلی اصول کے ماتحت حل

کرنے کا شائق رہا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کتاب و سنت سے اپنے ملکۂ اجتہاد کی روشنی میں ایک اصل کلی اخذ کرتے اور پھر تمام جزئیات کو اس پر منطبق کرتے ہیں اس اصل کلی کے خلاف اگر کوئی حدیث آجائے تو اس کی تاویل حسن کر لیتے ہیں۔ لیکن حدیث کے مقابلہ میں قیاس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جہاں تک اصول کی روشنی میں ہو سکتا ہے اس قاعدہ کلیہ کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔

بہر حال ہندوستان کے کچھ ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر ہمارا ملک حنفی عوام کا مرکز بنا رہا۔ لیکن حنفی علماء کو فقہی جزئیات اور انکی فروعات اس قدر غلو ہوا اور اس کے اندر اس قدر جمود پیدا ہوا کہ وہ اصل ماخذ قرآن و سنت سے دور ہوتے چلے گئے فتاوی تاتارخانیہ فتاوی عمادیہ، فتاوی عالمگیری جیسے بے شمار مجموعہ یہاں تیار ہوئے۔ لیکن فن حدیث میں پچھلے دور کے علماء مشارق الانوار سے آگے نہ بڑھ سکے۔ اور شاہ عبدالحق رحمۃ اللہ علیہ محدث دہلوی نے اس جمود کو توڑا اور انکے خاندان کے افراد نے حدیث کی طرف توجہ فرمائی۔ لیکن حضرت شاہ ولی اللہ رح اس دور کے فاتح اقلیم بن کر آئے اور انھوں نے حرمین شریفین سے واپس ہو کر قرآن و سنت کی اشاعت اس انداز سے کی کہ ہر طرف قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے فضا میں گونج اٹھی آج ہندوستان کا کوئی علمی حلقہ ایسا نہیں ہے جو شاہ صاحب سے نسبت نہ رکھتا ہو علمائے دیوبند شاہ صاحب کی اس علمی و عملی میراث کے وارث بنے چنانچہ علمائے ہند کی اس صدی میں حدیث پاک کے اہتمام کا اعتراف علامہ رشید رضا مصری نے شاندار لفظوں میں فرمایا کہ اگر ہندوستانی علماء اس درمیان میں اس علم شریف کی طرف توجہ و اہتمام نہ کرتے تو یہ علم دنیا سے اٹھ جاتا۔

(مقدمہ مفتاح کنوز السعادہ)

علامہ کا یہ گراں قدر اعتراف ولی اللہی دعوت کی کامیابی کی زبردست سند ہے۔ ریاست بھوپال جو روز زوال سے ولی اللہی دعوت کا مرکز بنی اس نے ریاستی حالات کے ماتحت دعوت ارشاد کو اپنا نصب العین بنایا۔ اور شاہ عبدالعزیز رح محدث دہلوی کے شاگردوں کی تشریف آوری سے یہ خطہ شروع ہی سے منور ہو گیا جن کا تفصیلی تذکرہ تاریخ بزرگان بھوپال میں ہے یہاں ایک اجمالی خاکہ پیش خدمت ہے۔

ولی اللّٰہی پارٹی کی تشکیل

حضرت شاہ ولی اللہؒ صرف ایک مفکر عالم ہی نہ تھے بلکہ ایک عملی قائد بھی تھے۔ انھوں نے بالواسطہ اس وقت کی عملی سیاست میں بھی حصّہ لیا مرکز کی کمزوری کو دور کرنے کے لیے نواب نجیب الدولہ کے ذریعہ (جو) شاہ صاحبؒ کا خصوصی مرید تھا۔ احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنے کی ایرانی و تورانی کشمکش کو دور کرنے کے لیے دعوت دی۔ (مکتوب شاہ صاحبؒ)

لیکن ابدالی کے عہدوں کے بانٹ دینے سے بھی مرکز کو استحکام حاصل نہ ہوسکا۔ ابدالی کے چلے جانے کے بعد پھر جوتیوں میں دال بٹنے لگی کیونکہ جس محل کی بنیادیں اور چھتیں اور دیواریں ساری کی ساری بوسیدہ وخستہ اور شکستہ ہوچکی ہوں ان کو سہاروں اور ٹیکوں سے کیوں کر روکا جاسکتا ہے اس لیے فکِّ کلِّ نظام شاہ صاحبؒ کا انقلابی پیغام بنا ظاہر ہے کہ اس انقلابی نعرے کی زد میں خود مغل شہنشاہیت بھی آتی تھی کیونکہ شاہ صاحبؒ نے اس دور کے بادشاہ اور عام امرا سے صاف صاف اظہارِ بیزاری کیا تھا اس لیے شاہ صاحبؒ کو اس سلسلہ میں مصائب وامتحانات کی راہ سے گزرنا پڑا شاہ صاحبؒ کو فک کل نظام کے ساتھ بتایا گیا تھا کہ اس سنگ لاخ ودشوار گزار راستہ پر چل کر منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے انبیا علیہم السلام نے صبر کی ضرورت ہے لہٰذا اس مردِ حق آگاہ ہمدرد خلق درویش کو آزمائش کے اس کٹھن راستہ میں قدم رکھنا پڑا۔

شاہ صاحبؒ کے ان مقدس ہاتھوں کو قلم کرایا گیا جن سے دکھی انسانیت

پریشان حال مفلس بھوکی ننگی سوسائٹی کی تصویریں کھینچی تھیں اوران کے لیے اقتصادی مساوات کا نسخہ تجویز کیا تھا شاہ صاحبؒ کے پہنچوں کو اتروا لیا گیا فتح پوری مسجد (دہلی) سے باہر نکلتے وقت بدمعاشوں کے ذریعہ ان پر حملہ کرایا گیا وہ خدا کی مدد سے اپنے بہادر ساتھیوں کے ساتھ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے ورنہ ان کے چراغ حیات کو گل کرنے کا پورا پورا منصوبہ تھا اس لیے انھوں نے اسلامی وانقلابی پروپیگنڈہ کے لیے ایک جماعت قائم کی جو تعلیم و اصلاح کے ذریعہ اس تحریک کو آگے بڑھائے جوان کے جاں نثار و جاں باز ساتھیوں اور شاگردوں پر مشتمل تھی۔

اس کے ارکانِ خصوصی یہ تھے:

(۱) شاہ محمد عاشق پھلتی جو حجۃ اللہ کی تصنیف کے محرک ہیں (۲) شاہ نور اللہ بڑھانوی (جد امجد شاہ عبد القیوم محدث بھوپال) (۳) مولانا شیخ محمد امین کشمیری (۴) ملا معین الدین سندھی جن کے مرید سندھی کے مشہور شاعر شاہ عبد اللطیف ٹھٹائی تھے۔

شاہ صاحبؒ نے دار السلطنت دہلی کو اپنی تحریک کا مرکز بنایا اور اس کی شاخیں ملک میں پھیلا دیں (۱) پہلی شاخ مدرسہ نجیب آباد میں جہاں نواب نجیب الدولہ برسر اقتدار تھے جن کے جانشین ضابطہ خاں ہوئے (۲) دائرہ شاہ علم اللہ جہاں شاہ ابوسعید جیسے چہیتے شاگرد رونق افروز تھے (۳) ملا معین کا مدرسہ ٹھٹا سندھ میں تھا۔ شاہ صاحبؒ کے بعد امامت کا تاج شاہ عبد العزیز دہلوی کے سر پر رکھا گیا چنانچہ مدرسہ نجیب آباد کے مرکز میں حضرت مفتی الٰہی بخش نے یہاں کام کیا نواب ضابطہ خاں کے بعد حضرت مفتی صاحب کے دار الاقبال بھوپال کو اپنی علمی وعملی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اس طرح ایک طرف مفتی صاحب کی تشریف آوری سے اور دوسری طرف حضرت مولانا ضیاء الدین بھوپالی شاگرد شاہ ولی اللہ اور خلیفہ شاہ ابواللیث کے واسطے سے ریاست شروع سے ہی اس تحریک سے جڑ گئی۔

مالوہ کی مختصر تاریخ

ہمارا ملک ہندوستان جو سرزمینِ ایشیا کی جنت ہے۔ یہ سرزمین اپنے رنگارنگ علاقوں اور بوقلموں خطوں کی وجہ سے ایک برّ صغیر کی حیثیت سے دنیا کے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے۔ اس سرزمین کا ہر ٹکڑا اپنی اپنی جائے وقوع کے لحاظ سے بے حد دلربا، اور دلکشا ہے۔ جس کی کچھ تفصیل "اسلام ہندوستان کے سایہ" میں ہم کرچکے ہیں۔ پورے ملک میں موجودہ صوبہ مدھیہ پردیش رقبہ کے لحاظ سے تمام صوبوں میں سب سے بڑا اور اپنے پھیلے ہوئے جنگلاتی اور معدنیاتی دولت سے مالامال ہے۔ یہ علاقہ عہد تاریخ سے پہلے بھی اپنی مذہبی پاکیزگی و برگزیدگی، شعور وادب، فلسفہ و نجوم (جیوتش) کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خطّہ کے پہاڑوں اور دریاؤں میں کوہ وندیاچل اور دریائے نربدا مشہور و معروف ہیں۔ جس طرح کوہ ہمالیہ اپنی رفعت و بلندی میں شہرۂ آفاق ہے اسی طرح وندیاچل اپنی وسعت و فراخی میں یکتا و بے نظیر ہے۔ پرانے زمانے میں اس کا ایک قطعہ ودھیاری ورکشا کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جو ریوا میں واقع ہے۔ اور ہمارے علاقہ بھوپال میں سر بہار پاتر کے نام سے پہچانا جاتا تھا لیکن پھر سارا وندیاچل کہلایا جانے لگا۔ پرانی قوموں میں حیات و کائنات کے بارہ میں جو دلچسپ قصّے کہانیاں اور عہد طفلی کے کہاوت چلی آرہی ہیں جن کو "علم الاصنام" (دیومالا) کہا جاتا ہے۔ اس علم الاصنام (ہندو دیومالا) کی روشنی میں یہ چوڑا چکلا پہاڑ رشیوں کی عبادت گاہ رہا۔ خاص طور پر اگست مُنی نے یہاں ریاضت (تپسّیا) کی تھی۔ اس مہاپُرش اور عظیم ترمنی کے حکم

ے اس پہاڑ نے سر جھکا دیا اور ان کو دکن جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ وہ جب دکن سے نہ پلٹے تو وہ اسی شان سے کھڑا رہا۔ اور اب تک کھڑا ہوا ہے۔ اس لیے یہ کوہ ہمالیہ سے پست نظر آتا ہے۔ بھگوت پران کی دوسری روایت ہے کہ اس نے اپنی بلندی کی بنا پر کوہ ہمالیہ سے مقابلہ کرتے ہوئے سورج دیوتا کے رتھ کا راستہ روک دیا تھا جس پر دیوتاؤں نے اگست مہاتما سے شکایت کی اس پر اس کو طلب کیا گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ سربسجود ہو گیا۔ تو مہاتما نے اس کی یہی سزا مقرر کر دی لیکن کچھ مدت کے بعد پھر اس نے سرتابی اختیار کی۔ بہر حال وندیاچل کا پھیلاؤ ہمارے ملک کے تمام پہاڑوں سے زیادہ ہے۔ اس سرزمین کا سب سے بڑا دریا نربدا بھی اپنے پانی کی خوشگواری، وشیرینی، روانی وصحت افزائی غذا کے لیئے زود ہضمی اور قلب وجگر کی تقویت بخشی کے لیے خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔ مشاہدہ میں آتا رہا ہے کہ اس کے اندر ہڈی اور لکڑی کچھ مدت رہ کر پتھر بن جاتی ہے نربدا میں پارس پتھر کا ہونا بھی بتایا گیا ہے۔ اکبر اعظم نے اس کا کھوج بھی لگایا تھا۔ نربدا ندی امر کنٹک پہاڑ کی دیوی ہے جو سون ندی کے ساتھ اسی پہاڑ سے نکلی ہے۔ ہندو دیومالا میں ہے کہ یہ دونوں ندیاں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ گلے مل کر رہتی تھیں کسی بات پر ان کے درمیان رنجش ہو گئی جس کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے سے منھ پھیر لیا۔ سون ندی نے مغرب کا رخ پکڑا اور نربدا مشرق کی طرف بہہ نکلی۔ چنانچہ ہندوستان بھر میں یہی وہ واحد دریا ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے ورنہ اور تمام دریا مغرب کی طرف بہہ رہے ہیں۔ دریائے نربدا تین صوبوں مدھیہ پردیش، مہاراشٹر و گجرات کو سیراب کرتا ہے۔ لیکن اس کے پانی کا بڑا حصّہ ہمارے صوبہ کو فیض پہنچانے کے لیے وقف ہے۔ یہی وہ خطہ ہے جس کی مشہور تاریخی راجدھانی اُجین میں بکرماجیت جیسا زبردست مدبر، علم پرور و ادب نواز مہاراجہ نے جنم لیا اور دوسری طرف یہیں پرمار خاندان کے حق پسند راجہ بھوج دھار نگری میں جلوہ افروز ہوا۔ ایک طرف مشہور عالم، ادیب و ڈرامہ نگار کالیداس نے زبردست

شہرت حاصل کی تو دوسری طرف بھرتری ہرؔی جیسے حقیقت نگار شاعر نے معرفت کے نغمے بکھیرے۔ عوام کے لیے یہ حیرت ناک واقعہ ہوگا کہ جبکہ مشہور عالم فاتح شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر حملہ کر کے دہلی پر قبضہ کیا تو اسی خطّہ کے ایک بادشاہ بہادر شاہ اس سے معرکہ آرائی کے لیے دہلی کی طرف بڑھا اور لڑ کر شہید ہوگیا۔ اس تاریخی واقعہ کھل کر سامراجی اِس مفروضہ کی تردید ہوتی ہے کہ غوری کے حملہ سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور انھوں نے اس ملک میں سکونت اختیار کی۔

پھر مشہور فاتح علاء الدین خلجی کے دور ۱۳۰۹؁ء میں طوطئ ہند امیر خسرو صاحب خزائن الفتوح دہلی سے ملک کافور کے ہم کاب ہو کر جنوبی دکن کی طرف جا رہے تھے تو بھوپال کے دریائے بھوج کے سرسبز و شاداب جنگلوں کو اپنے مدھ بھرے گیتوں سے بھر دیا۔ امیر خسرو کا یہی وہ دریائے بھوج ہے جس نے بعد میں بیتوا ندی کا نام پایا۔ انھوں نے دریائے بیتوا کو بھوج ہی تحریر کیا ہے اور وہ ان پانچ دریاؤں میں سے آخری دریا تھا جس کو عبور کر کے ملک کافور کا لشکر سلطان پور (موجودہ بابینا) ۱۵ر جمادی الثانی ۹۰۹ھ کو پہنچا تھا۔ (ترجمہ خزائن الفتوح)

پرمار خاندان ۸۲۰ء

ہندوستان کا یہ وسطانی علاقہ (سینٹرل انڈیا) جو بعد صوبہ مالوہ کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ صوبہ کوہ وندیاچل اور دریائے نربدا کو آغوش میں لیئے ہونے کی وجہ سے سبزہ زار و پُر بہار علاقہ ہے۔ مالوہ کا علاقہ دریائے نربدا کے شمال کی وہ سرزمین ہے جو عہد قدیم میں اونتی (سلطنت اجین) کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔

اس علاقہ کی حکومت کے سلسلہ میں پرمار خاندان تاریخ کی پیشانی میں جھومر کی طرح درخشاں ہے۔ اس خاندان کی بنیاد نویں صدی ۸۰۰ء کے آغاز میں ایک سردار اپیندر ما کرشن راج نے رکھی تھی۔ جس کی بادشاہت کا سلسلہ چار سو ۴۰۰ برس تک قائم رہا۔ نویں صدی کا دور وہ دور ہے جبکہ ہم کو مختلف علاقوں سے مختلف حکومتیں قائم ہوتی نظر آتی ہیں۔ گویا اس دور میں بہادر سردار اور جنگ جو سپہ سالار اپنی طاقت وقوت کے جھنڈے لہراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پرمار راج کا بانی راجپوتانہ کے کوہ آبو کے قریبی اضلاع چندراوتی، اچل گڈھ سے چل کر ۹۵۵-۹۷ء میں یہاں آکر آباد ہوئے جہاں یہ قوم مدتوں سے آباد تھی۔ اس خاندان کا ساتواں راجہ منج ۹۵-۹۷۴ء سب سے زیادہ مشہور ہوا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنے علم وفضل، زبان وبیان، فصاحت وبلاغت میں خصوصی کمال کا حامل تھا۔ اور خود مشہور و معروف شاعر تھا اور شاعروں کا سرپرست تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی کا قصہ بھی قابل عبرت ہے۔ چندر پال کا بیٹا جے چند شکار کا دلدادہ تھا۔ ایک روز جنگل میں ایک درخت کے نیچے ایک نوزائدہ بچہ ملا اس کو اولاد کی طرح پالا پوسا۔

اور اس کا نام تیج رکھا۔ جب راجہ کا آخری وقت ہوا تو اس کا لڑکا بھوج نابالغ تھا اس نے تیج کو جانشین بنا دیا۔ اس دور کی منتخب ادبیات میں اس کی طرف منسوب نظمیات ہیں اس عہد کا مشہور مصنف دھنپیا اور خود اس کا بھائی دھنک بھی مشہور شاعر تھے۔ جو اس کے درباری تھے۔ اس کی زندگی کا بڑا حصہ جنگ و جدل میں گزرا تھا۔ چھ بار اس نے چلو کیا خاندان کے راجہ نیل کو شکست دی۔

تیج مہاراجہ نیل کی شمالی سرحد دریائے گوداوری کے پار تک گیا تھا۔ وہاں شکست کھا کر گرفتار ہوا اور ۹۹۵ء میں مارا گیا۔ بہر حال اس کی اولوالعزمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ علم و ادب کی سرپرستی میں پیش پیش رہا۔ اسے کئی ناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ وگپتی اول، انیل راج، امورگھوشی، پرتھوی ولبھ اور شری ولبھ۔

پونوار خاندان جس کے اٹھارہ راجہ ہوئے

کہا جاتا ہے کہ پونوار راجپوت قوم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو قدیم موریوں کی نسل سے بتاتے ہیں۔ جو موریا خاندان کی ہی ایک شاخ تھی۔ یہ خاندان مالوہ و راجپوتانہ میں پھیلا ہوا تھا۔ ایک شاخ کوہِ آبو کے شہر چندراوتی میں سکونت پذیر تھی۔ دوسری شاخ آنتی (اجین) میں اور تیسری شاخ دھار میں تھی۔ ۸۳۰ء میں اگرسین کوہ آبو سے اتر کر راجہ بن گیا۔ بہر حال اس خاندان کے راجاؤں میں سب سے زیادہ جس مہاراجہ نے شہرت حاصل کی وہ راجہ بھوج ہے۔ جو اپنی علم دوستی کی وجہ سے اس لقب سے زیادہ مشہور ہے۔ مہاراجہ بکرماجیت کے بعد تاریخ وسط ہند میں جس راجہ کی سب سے زیادہ شہرت ہوئی وہ راجہ بھوج ہے۔ ہمارے نزدیک راجہ بھوج لقب ہے۔ بہت سے راجہ اسی لقب سے ملقب ہوئے بہر ۵۴۱ سمت میں دھار میں راجہ بھوج تخت نشیں ہوا اور

بہت سے ملکوں کو فتح کر کے اپنے قلمرو میں شامل کیا۔ وہ علم و ہنر کا مربّی اور اہلِ علم (پنڈتوں، جیوتشیوں) کا قدرداں تھا۔ اس کے دربار میں پانچ سَو اہلِ کمال رونق بڑھاتے اور ہر وقت علم و فضل کا چرچا کرتے رہتے تھے۔ ان میں سب سے اعلیٰ شاعر سرزید مزاج پھر دھن پال گزرے ہیں۔ جن کے رنگین و دلآویز اشعار بعد کے آنے والوں کے لیے بیش بہا ذخیرہ اور قیمتی تحفہ ہیں۔ علم ہیئت و فنِ تعمیر اور علم عروض میں اور دیگر علوم میں ان کی طرف کئی کتابیں منسوب ہیں۔ وہ بھی سندر گپت کی طرح غیر معمولی لیاقت کا انسان تھا۔ اس نے دھار میں سنسکرت کے علوم و فنون کی ایک یونیورسٹی قائم کی۔

(تاریخ ہندوستان ص۳۱۱ ترجمہ مولوی سید غلام ربانی باب ۱۲-۹۸)

راجہ بھوج کی پیدائش کے وقت نجومیوں نے غلط فہمی سے یا جنم پتری بنانے والوں کی غلطی سے اس کو منحوس قرار دیا۔ اور وہ جنگل میں پھینک دیا گیا۔ سروج پنڈت نے جو اس وقت راجہ کے دربار میں نہ پہنچ سکا تھا اس کو اٹھایا اور اس کا زائچہ تیار کیا۔ سروج نے اس جنم پتری کو راجہ کی گزرگاہ پر پھینک دیا۔ جے نند نے اس کو پڑھ کر حقیقت حال سے آگاہی حاصل کی بھوج آٹھ برس کا ہوا تو تیج نے اس کو قتل کرانا چاہا۔ لیکن راجہ کے لوگوں کو اس پر رحم آگیا۔ بھوج کے بعد اس کا لڑکا جے چند حکمراں ہوا اور پھر پوار خاندان کی حکومت ختم ہوگئی۔

(تاریخ ہندوستان مولوی ذکاء اللہ ج ۲ ص۳۵۹ تا ۲۹)

جب بھوج کے بیٹے جے چند (جو اٹھارھواں حکمراں تھا) ختم ہوا تو جیت تونوز جو زمینداروں میں سے تھا اس کے خاندان میں حکومت منتقل ہوئی اس خاندان کے گیارہ راجہ ہوئے۔ آخری راجہ کنور پال کے راجہ مالو کے زمانہ میں غزنی سے شیخ شاہ آکر مالوہ کا حکمراں بن گیا۔ پھر اس کے بیٹے علاء الدین کی خورد سالی کی وجہ سے اس کا وزیر دھرم راج حاکم بن بیٹھا۔ پھر علاء الدین جب بڑا ہوا تو اس نے دھرم راج کو مار ڈالا۔ پھر جیت پال جو ناگ دیو کی نسل سے تھا

اور کمال الدین کا ملازم تھا وہ تخت پر قابض ہوگیا۔ پھر راجہ تپر سین کے عہد میں ایک افغان نے راجہ کو قتل کر کے جلال الدین لقب اختیار کر کے بادشاہ بن گیا۔ تپر سین کے لڑکے کھڑک سنگھ نے گجرات سے آکر مالوہ پر حملہ کیا اور انتقام لیا۔ پھر سنگت سنگھ کے زمانے میں بہادر شاہ نامی سردار دکن سے آکر مالوہ کا بادشاہ بن گیا۔ پھر جو اس کی شامت آئی تو وہ شہاب الدین غوری کو تخت دہلی سے ہٹانے کے لیے دہلی پہنچا۔ اور اس کے ہاتھوں ۱۳۱۰ء میں مارا گیا۔ پھر شاہانِ دہلی میں سلطان غیاث الدین نے سب سے پہلے ملک مالوہ فتح کیا۔

اب ہم ایک فہرست ان حکمرانوں کی (جس کے ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی) پیش کرتے ہیں جنھوں نے شہاب الدین غوری کے حملہ سے پہلے اس علاقہ میں حکومت کی تاکہ فرنگی سامراج کے اس تاریخی مفروضہ کی تردید کھلے طور پر ہو جائے کہ مسلمان ہندوستان میں غوری کے بعد آئے۔

"فہرست حکمراں"

	نام حکمراں	مدت حکومت
۱۔	شیخ شاہ	ستر سال
۲۔	دھرم راج	بیس سال
۳۔	علاء الدین	بیس سال
۴۔	کمال الدین	بارہ سال
۵۔	جیت پال چوہان	تیس سال
۶۔	ہر چند	بیس سال
۷۔	کیرت چند۔	تیرہ سال

	نام حکمراں	مدت حکومت
۸۔	اگرسین	دو۲ سال
۹۔	سورج نند	بارہ۱۲ سال
۱۰۔	تیرسین	دس۱۰ سال
۱۱۔	جلال الدین	بائیس۲۲ سال
۱۲۔	عالم شاہ	چوبیس۲۴ سال
۱۳۔	کھڑک سین	آٹھ۸ سال
۱۴۔	نرماسین	بیس۲۰ سال
۱۵۔	بیرسال	سولہ۱۶ سال
۱۶۔	پورن مل	انتالیس۳۹ سال
۱۷۔	ہرنند	باسٹھ۶۲ سال
۱۸۔	سکت سنگھ	ساٹھ۶۰ سال

(بحوالہ شعلہ حیات ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۶۴ء)

خطہ بھوپال کی پچھلی تاریخ

ہمارا یہ شہر بھوپال اس خطّہ کا ایک جدید و نوخیز شہر ہے۔ اس خطّہ میں بکرماجیت کی تاریخی راجدھانی اجین اور پرمار خاندان کے پایہ تخت دھار کی طرح یہ شہر اتنا پرانا نہیں ہے۔ پرمار خاندان کے مشہور و معروف عالم راجہ بھوج کو اس شہر کی تعمیر کا اولین فخر حاصل ہے جو ہم کو ہزار ڈیرھ ہزار سال پہلے کے تاریخی عہد تک پہنچا دیتا ہے۔ جبکہ پرمار حکمرانوں کے اس علمی خاندان سے اس خطہ کو علم و ہنر و تہذیب و تمدن اور ثقافت و کلچر کے حسین و جمیل نقوش سے سجایا۔ بہرحال ہمارا شہر ایک نو پیدا شدہ شہر کی حیثیت سے تاریخ کے صفحہ پر ابھرا ہے۔ مگر اب جبکہ آثار قدیمہ نے تاریخی عہد سے پہلے کے احوال و واقعات پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھا کر ہندوستان کی پچھلی قوموں کے چہروں پر سے نقاب الٹ دیے ہیں اور ان محققین و منکشفین کی مسلسل سرگرمیوں کے نتیجہ میں اور بروز نت نئے قدیمی پردہ کشائی کا سلسلہ جاری ہے۔

جب ہم ان آثارِ قدیمہ کی روشنی میں پہاڑوں کے دامن میں آباد جھیلوں کے اس شہر (بھوپال) پر نگاہ تحقیق ڈالتے ہیں تو ان پہاڑیوں، ٹیکریوں اور اونچے نیچے میدانوں کے سینہ سے ایسے پرانے آثار برآمد ہوتے ہیں جو ہم کو ہزاروں سال پہلے (ما قبل تاریخ) کے دور میں لے جا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جس سے اس بستی کی قدامت آشکارا ہوتی ہے۔

بھوپال کے آثارِ قدیمہ کی دریافت

قدیم شہر بھوپال کے ملحقہ جدید آبادیوں جیب گنج، ٹی۔ ٹی نگر، اریرہ کالونی، گوونڈ پورہ، سنگر نگر، شملہ پہاڑی، حجری دور (پتھر کا زمانہ) معدنی دور (تانبے و کانسہ کا دور) کے آثار ہاتھ لگے ہیں۔ ان پہاڑیوں کی بعض گپھاؤں میں ایسے نقوش ملے ہیں جو دورِ ماضی کے باشندوں کے احوال زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جب ہم دورِ ماضی کے جھروکہ میں سے جھانک کر ان گزری ہوئی قوموں اور پھیلی ہوئی نشانیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو اس علاقہ میں تین[۳] خاندانوں کے قافلے اپنا جھنڈا لہراتے اور یہاں کے باشندوں پر حکومت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

عہدِ ماضی کے تین حکومتی دور

(۱) سب سے پہلے جس عہدِ حکومت کی تصویریں یا نقوش ابھرتے وہ آج سے دو ڈھائی ہزار سال قبل مسیح مہاتما گوتم بدھ کے عہد سے پہلے کے ہیں۔ بقول آر۔ ڈی۔ تیواری "مہاتما گوتم بدھ سے پہلے سولہ[۱۶] جن پدوں کے عہد میں علاقہ بھوپال ادنتی (اوجین)، کے مہاراجہ پردھوت کی ریاست کا حصہ تھا۔ راجہ پردھوت مگدھ کے راجہ اجات شترو کے ہم عصر تھے۔"

(۲) دوسرا دور موریہ حکومت ہے۔ اس عہد میں بھوپال کا علاقہ اشوک کی سلطنت کے زیرِ نگیں تھا۔ اشوک نے شہنشاہیت کا تاج پہننے سے پہلے اجین کے صوبیدار کی حیثیت سے اس علاقہ پر حکومت کی تھی۔ جب اشوک نے شہنشاہیت کا تاج اپنے سر پر رکھا تو اس علاقہ میں بہت سے اسٹوپ اور خانقاہیں (بدھ دیہار)

قائم کیں چنانچہ مشہور عالم سانچی کے اسٹوپ کا سنگ بنیاد رکھا۔ سانچی کی مہااودیوگری کی تعمیر میں مہاراجہ اشوک کی مہارانی دیوی کا بڑا ہاتھ ہے۔ جو ودیشہ کی تھیں۔ بھوپال شہر میں باغ امراؤ دولھا جو سنگیں ستون ہے وہ اسی موریہ عہد کا ہے۔

(۳) پھر تیسرا دور گپت خاندان کا ہے۔ گپت خاندان کے حکمرانوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس علاقہ کو خصوصی مرکز بنایا جس کا ثبوت سانچی کی گپھاؤں اور عمارتوں سے اودے گری کی گپھاؤں وغیرہ سے ملتا ہے۔

شہر بھوپال کی پہلی تشکیل

شہر بھوپال اس وقت صفحہ تاریخ پر ابھرا اور معرض وجود میں آیا جب عہد وسطیٰ میں "پرمار" فرماں رواؤں کو عروج ہوا چنانچہ پرمار خاندان کے سب سے بڑے مہاپرش راجہ بھوج نے جب اس جگہ ایک عظیم بندھ باندھا اور "بھوج تال" کی وسیع جمیل معرض وجود میں لایا گیا۔ موجودہ شہر کا نام اسی "بھوج پال" کی بنا پر رکھا گیا۔ بھوپال کے مغربی رویہ مشہور منوا بھانڈ کی ٹیکری پر ایسے مندر کے آثارِ قدیمہ ملتے ہیں جو "پرمار عہد" دسویں صدی سے سترھویں صدی سے پہلے کے ہیں۔ چور پورہ کے ماتا مندر میں جو مورتی ہے وہ بھی پرمار عہد سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے ہی مشرقی جانب جہانگیر آباد میں (جہاں اب پولس کوارٹرس ہیں) جو مورتیاں ملی ہیں وہ بھی مسلمانوں کے عہد سے بیشتر کی ہیں۔ بہرحال شہر بھوپال کے ارد گرد پتھروں پر جو کتبات یا نقش دستیاب ہوئے ہیں وہ پرمار راجاؤں کی عہدِ حکومت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

بھوپال میں اسٹیٹ بنک کی عمارت سے ملحقہ جین جھرنا مندر میں جین مورتیاں دسویں و گیارھویں صدی کی ہیں۔ اسی طرح لال گھاٹی پر پرمار زمانہ کی بہت سی مورتیاں ملی ہیں جو بھوپال کے عجائب خانہ میں رکھ دی گئی ہیں۔ ایسے ہی گووند پورہ

(حال ایچ۔ ای۔ ایل)، برکھیڑہ پٹھانی میں بھیرو، گن پتی، سوریہ سمیت کئی مورتیاں (جس میں عورتوں کے نقش بھی شامل ہیں)، پائی گئی ہیں۔ بھوپال میں ۱۱۹۹ء اودھے دائیں راجہ کے تانبے کے کتبے پرمار عہد کے ملے ہیں۔

بھوپال سے بیس کلومیٹر دور قدیم شہر بھوجپور کی بنیاد بھی پرمار سمراٹ بھوج نے رکھی تھی مہاراجہ بھوج نے ہی بھوجپور کے شیو لنگ مندر کو تعمیر ایا تھا۔ جو اس کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

"بھوپال تال"

بھوپال کے بڑے تالاب کا پشتہ (جس کو پرانی بولی میں پال کہا جاتا تھا) عام روایت کے مطابق مشہور راجہ بھوج کا عہد (۱۰۵۳ — ۱۰۱۰) میں تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ دو ہزار مربع ہیکٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اسی راجہ بھوج کے پوتے اودے دتیہ پرمار کی بیوی سال منی بڑی علم دوست خاتون تھی وہ شہر بھوپال کو علم و فن تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دینا چاہتی تھی۔ اس لیے انھوں نے یہاں ایک عظیم درسگاہ ۱۰۸۴ء میں تعمیر کروائی اور اس دور کی مروجہ تعلیم کا نظام جاری کر کے سبھا منڈل نام رکھا۔ لیکن تھوڑے دنوں بعد جب اس خاندان کو زوال ہوا تو رفتہ رفتہ وہ سبھا منڈل حکومت کی سرپرستی سے محروم ہو جانے کی وجہ سے افراتفری کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گیا۔ سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارھویں صدی کے شروع میں یہ شہر گونڈ راجاؤں کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ جس کی آخری حکمراں کملا پتی رانی تھی۔ جو ایک شریف علم دوست خاتون تھیں جن کی خوبصورتی و خوش سیرتی کی وجہ سے اس دور میں اس علاقہ کے اندر دھوم مچی ہوئی تھی۔ جس کی شہادت اس لوک گیت سے ہوتی ہے۔ جس کی گونج آج تک ہے سے

تال ہے تو بھوپال سب ہیں تلیاں   رانی ہے تو کملا پتی سب ہیں رنیاں

اس بڑے تالاب اور چھوٹے تالاب کے درمیان ایک پختہ عمارت رانی کملاپتی کا محل تھا جو آج بھی کملا پارک کے نام سے شہر بھوپال کی حسین جمیل پارک ہے، رانی کملاپتی کے قلعہ کے کھنڈر ہندو مسلم فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔ یہ قلعہ رانی کملاپتی کے لڑکے نول شاہ کے کنبہ کا آخری ٹھکانہ تھا۔ جب سردار دوست محمد خاں بانئ ریاست بھوپال کے اس مقام کو اپنی ریاست کی راجدھانی بنانے کا منصوبہ بنایا تو پھر نیا قلعہ فتحگڈھ تعمیر کرایا تو یہ قلعہ پرانے قلعہ کے نام سے شہرت پذیر ہوا جو اسی نام سے آج تک مشہور چلا آرہا ہے۔

بھوپال مختلف ادوار میں

شہر بھوپال جب پرمار خاندان کا آفتاب اقبال زوال میں آیا تو نہ صرف اس شہر کی علمی مرکزیت کو دھکا لگا بلکہ تھوڑے عرصہ میں خود اِس کی شہرت بھی ختم ہوگئی پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ راجہ بھوج کا آباد کیا ہوا یہ شہر مچھیروں کی ایک بستی، ایک معمولی گاؤں بن گیا۔ پرمار خاندان کے بعد پورے صوبہ میں طواف الملوکی رہی اس لیے یہ خطہ کبھی ٹھاکروں، راجپوتوں اور گونڈوں کے ہاتھوں میں رہا جب مہاراجہ پرتھوی راج کے بعد دہلی میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی تو خاندانِ غلامان میں سے سب سے پہلے التمش ۶۳۳ھ نے صوبہ کے صدر مقام بھیلسہ یا ودیشہ کو فتح کرکے اس علاقہ کو مرکز کے ماتحت بنایا۔ جب خاندانِ خلجی مرکزِ دہلی میں برسرِ اقتدار آیا تو اس خاندان کے اولوالعزم شہنشاہ علاءالدین خلجی ۶۹۲ھ میں اس علاقہ میں اس فتحمندی کا پرچم لہرایا، دہلی کا یہی وہ بلند حوصلہ بادشاہ ہے جس نے سب سے پہلے شمالی ہند سے آگے بڑھ کر جنوبی ہند میں فاتحانہ اقتدار حاصل کرکے متحدہ ہند کے تصور کو سب سے پہلے عملی جامہ پہنایا۔ اس سے پہلے کوہ وندھیاچل اور ست پڑا کی پھیلی ہوئی پہاڑیاں اور دریائے نربدا کی

وادیاں شمالی ہند کے راجاؤں کو قدم پکڑ کر آگے بڑھنے سے روک لیتی تھیں۔ جب خلجی خاندان کی بساط اقتدار بھی لپٹ گئی اور تغلق خاندان کے بادشاہوں نے دہلی کو پایہ تخت بنا کر پورے ملک کو اپنی جولانیوں اور معرکہ آرائیوں کا آماجگاہ بنایا تو شہنشاہ تغلق نے ۷۴۷ھ میں اس خطّہ کو فتح کیا اور مرکز کا صوبہ بنایا۔ اس کے بعد جب تیموری حملہ نے مرکز کو زیر و زبر کر دیا تو پھر صوبہ مالوہ میں دلاور خاں غوری نے ۸۲۸ھ میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ اور دھار کو راجدھانی بنا کر اس علاقہ کو اپنے ماتحت بنا لیا۔ غوری خاندان کے بعد مالوہ میں بھی خلجی خاندان برسرِ عروج ہوا تو محمود شاہ خلجی نے ۸۵۹ھ میں اپنی دینداری اور بزرگوں کے ساتھ خوش عقیدگی کے ماتحت دھار میں شاہ عبداللہ چنگال اور ان کے مرید راجہ بھوج عرف عبداللہ وغیرہ کے مقابر تعمیر کرائے اور خطّہ بھوپال میں حضرت شاہ فتح اللہ چشتی کی درگاہ شریف بنوائی۔ پھر اوّلاً شہنشاہ ہمایوں نے ۹۳۱ھ میں مالوہ کو فتح کیا۔ مگر پھر باز بہادر نے بازیاب کر کے اپنی حکومت قائم کی یہاں تک کہ اکبر اعظم نے اپنی مشہور عالم فتح مانڈو ۹۶۸ھ میں اس کو مرکز دہلی کے ماتحت کر دیا۔ اس کے درمیان حکومت مالوہ پر بہادر شاہ گجراتی نے حملہ کر کے ۹۶۲ھ میں اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا تھا اور پھر آخر دور عالمگیر ثانی ۱۱۸۶ھ تک یہ علاقہ دہلی کے زیر نگیں رہا۔ دارالسلطنت دہلی سے مختلف صوبیدار آتے جاتے رہے یہاں تک کہ سردار دوست محمد خاں نے ۱۱۲۰ھ ۱۷۰۹ء میں ریاست بھوپال کی بنیاد ڈالی۔

ریاست بھوپال کی اجمالی تاریخ

چونکہ ہماری اس کتاب کا تعلق سابقہ ریاست بھوپال سے ہے اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ ریاست کی تشکیل اور اس کے اولوالعزم بانی اور اس کے اخلاف نوابوں اور بیگمات کے زمانے کے ان خصوصی واقعات کی رونمائی کرائی جائے جس کے اندران کی حریت پسندی، انسان دوستی، رعایا پروری اور ریاست کے باشندوں کے درمیان اتحاد باہمی کی ان پرانی قدروں کے نقوش کو اجاگر کیا جائے جن کو سامراجی مؤرخوں نے اپنی ستھری اور روپہلی مصلحتوں کی خاطر ندھم کرنے کی کوشش کی ہے حصول اقتدار اور شہرت و ناموری کے لیے رسہ کشی بلند حوصلہ انسانوں کی پرانی بیماری ہے۔ جس سے کوئی قوم، کوئی ملّت خالی نہ رہی جس کو پچھلے زمانہ میں خدمت خلق کے پیرایہ میں اور مغربی سامراج نے غیر مہذب قوموں کو مہذب بنانے کے پردہ میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔

حکومت و سلطنت کے لیے خانہ جنگی و برادرکشی تاریخ انسانی کی ایک دل خراش و غمگین گوشہ ہے جس کے نقوش کو اس دور میں ابھارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ریاست بھوپال کی تاریخ کے لیے گلستانِ ارم کا یہ لطیفہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بانی ریاست دوست محمد خاں جب اپنی قسمت آزمائی کے لیے سرزمین مالوہ میں فروکش ہوئے تو عام مسلمانوں خصوصاً سیدھے سادے پٹھانوں کی طرح ایک صاحب کشف درویش کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سردار صاحب اس وقت بھوکے تھے اور ان روشن ضمیر بزرگ کے سامنے ابلے ہوئے چاول رکھے ہوئے تھے۔ درویش نے فرمایا، "خان اگر تو یہ سب

چاول کھالے تو ہم تجھ کو دہلی کی حکومت دے دیں گے اور اگر آدھے آدھے چاول کھالے تو حیدر آباد کی ریاست عطا کریں گے اور اگر ایک چوتھائی کھالے گا تو تجھ کو مالوہ بخش دیں گے"۔ سردار صاحب نے بہت کوشش کی لیکن چوتھائی سے زائد نہ کھا سکے درویش نے فرمایا بحکم رب العالمین تجھ کو مال و متاع، کثیر اولاد اور حکومت عطا کی گئی لیکن تیری اولاد آپس میں اس طرح لڑے گی جیسے دو کتے ہڈی پر لڑتے ہیں

(بحوالہ فرمارو ایان بھوپال صہ ۲۹)

اس لیے راقم السطور نے تاریخ کے ان اوراق کو قصداً ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیا ہے جن کو ہڈیوں کی چھینا جھپٹی سے دلچسپی ہے۔

حکومت مغلیہ کا زوال اور ریاست بھوپال

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب بھی کسی سلطنت کا مرکز ضعیف و کمزور ہو جاتا ہے اور اپنے ماتحت علاقوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے تو ملک میں طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے اور ماتحت صوبے خود مختاری کا جھنڈا لہرانے لگتے ہیں چنانچہ مغل شہنشاہیت جو ظہر الدین بابر کے ہاتھوں ہمارے ملک میں قائم ہوئی درمیان میں شیر شاہ سوری کی مختصر مدت چھوڑ کر نصیر الدین ہمایوں سے اس کو استحکام حاصل ہوا اور جلال الدین اکبر نے وسیع و عریض فتوحات ہندوستان کے جنوب و شمال کو ایک لڑی میں پرونے کی عظیم سعی کی پھر نور الدین جہانگیر اور شہاب الدین شاہجہاں کے سنہری دور میں ہندوستان مغلوں کے تعمیری ذوق ملک کی سرسبزی و شادابی اور خوشحالی کی جنت بن گیا۔ مغل سلطنت کا نقطہ عروج عالمگیر اعظم اور ان کے جانشین بہادر شاہ اول کا دور ہے جبکہ ہمارے ملک کی سرحدیں ایک طرف بلخ و بخارا تک اور دوسری طرف نیپال و تبت تک پہنچ گئی تھیں اورنگ زیب نے اپنے عہد میں سب سے پہلے جنوبی ہند کی جملہ ریاستوں کو مرکز کے ماتحت کر کے متحدہ ہند کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کر دیا۔ لیکن قدرت کا یہ قانون ہے کہ ہر عروج را زوال جب بھی کوئی چیز درجۂ کمال پر پہنچ جاتی ہے تو وہی نقطۂ کمال اس کے زوال کی بنیاد بن جاتا ہے۔ یوں بھی بقول علامہ ابن خلدون ہر شخصی سلطنت چوتھی پانچویں پر پہنچ کر روبہ زوال ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس قدر عظیم و طویل و عریض سلطنت کے لیے جس بھاری بھرکم متحرک و فعال شخصیت کی ضرورت تھی افسوس کہ عالمگیر اعظم کے بعد پھر اس خاندان تیموری میں اس درجہ کا کوئی بادشاہ پیدا نہ ہو سکا اور آخر میں بادشاہ امراء کے ہاتھوں مغل بادشاہ

ایک کھلونہ بن کر رہ گئے۔ اور پھر اس مغل خاندان کو وہ برے دن دیکھنے پڑے کہ بقول اقبال ؎

حمیت جس کو کہتے ہیں گئی تیمور کے گھر سے

سامراجی مؤرخوں نے اپنی ڈپلومیسی و حکمت عملی کی بنا پر اورنگ زیب جیسے عظیم کردار انسان کے نورانی چہرہ پر تعصب کا گرد و غبار اڑایا اور اس درویش صفت بادشاہ کو مغل شہنشاہیت کے زوال کا ملزم گردانا ہے۔ اس لیے یہاں پہنچ کر ہم کو مغل حکومت کے زوال کے بنیادی وجوہ کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو بقول غالب ہر تعمیر میں تخریب کی صورت مضمر ہوا کرتی ہے کیونکہ یہ عالم ہی عالم کون و فساد ہے لیکن سلطنت یا حکومت جو مختلف انسانی طبقات میں توازن قائم رکھنے سے چل سکتی ہے اس کے اندر باہمی توازن قائم کرکے اس قافلہ حیات کو آگے بڑھاتے رہنا ہر ایک انسان کا کام نہیں ہے۔ کیونکہ ان مختلف طبقوں میں اقتدار پرستی کی کھلی ڈھکی جنگ مسلسل جاری رہتی ہے۔ جیسے عناصر اربعہ کے اعتدال کا نام حیات و زندگی ہے اسی طرح انسانی اجتماعیت میں اس اعتدال و توازن کا قائم رکھنا مدبرانہ سیاست کا کام ہے۔ مغل شہنشاہیت کا قوام ایرانی و تورانی امرار کے عہدوں اور مناصب سے تیار ہوا تھا۔ جب تک ایسے طاقتور بادشاہ رہے جو ان امرار پر قابو پاتے اور توازن قائم رکھتے رہے مغل حکومت کا نظام صحیح طور پر چلتا رہا اور جہاں اقتدار کی باگ ڈور رکھنے والے ہاتھ کمزور ہوئے سلطنت کے اندر خانہ جنگی و برادر کشی کا چکر چلنے لگا۔ ایرانی و تورانی آویزش کی جڑ بنیاد یہ ہے کہ جب ہمایوں بادشاہ سوری خاندان سے شکست کھا کر ایران پہنچا اور صفوی بادشاہ سے مدد کا طالب ہوا تو ایرانی شہنشاہ نے اس شرط کے ساتھ ہمایوں کو امداد دی کہ سلطنت کا وزیر اعظم ایرانی ہوگا اور امیر الامرار تورانی چنانچہ اس پر عمل درآمد ہوتا رہا اور اکبر بادشاہ سے بہادر شاہ اوّل تک جیسے طاقتور فرمارواں اس نظام کو مضبوطی سے قائم رکھتے رہے لیکن عالمگیر اعظم

کے اٹھ جانے کے تھوڑے دنوں بعد توازن قوت (بیلنس آف پاور)
درہم برہم ہونے لگا اور اندرونی تصادم رنگ لانے لگا۔ بقول علامہ گیلانی "تاریخ اسلام کی ابتدا سے جن کے دل میں دنیا طلبی کی انگیٹھی سلگی اس نے دین کے اس سلسلہ کی آڑ لے کر اپنے حرص وہوس کی جہنم روشن کی۔

(الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۱۹۲)

بہر حال مغل شہنشاہیت ایرانی، تورانی (شیعہ وسنی) آویزشوں کا شکار ہوکر بیرونی خطرات سے آنکھیں بند کیے تیزی سے زوال کی طرف جارہی تھی اندرونی فتنے بار بار سر اٹھا رہے تھے اور ہر ایک کا نزلہ کمزور عضو (دار السلطنت دہلی) پر گر رہا تھا۔ نہ تخت طاؤس باقی رہا تھا نہ اُس کے مستحق مسند نشیں رہے تھے۔ نادر شاہ شامت اعمال بن کر خون کے دریا بہا کر تخت طاؤس لے کر ایران جا چکا تھا اور مغل بادشاہ ان امراء کی کٹھ پتلی بن کر مسلسل بدلتے رہتے تھے۔ مرہٹہ گردی، جاٹ گردی نے دار السلطنت کی خاک اڑا دی تھی۔ رہی سہی کسر ابدالی نے پوری کردی۔ دہلی والوں کے لیے ہر صبح، صبح محشر اور ہر شام، شام قیامت بن کر آرہی تھی۔ بادشاہ گر سادات کے ہاتھوں فرخ سیر کا قتل پہلا سانحہ تھا جس نے سلطنت کے رعب وداب کو ختم کر کے رکھ دیا آصف الدولہ نظام الملک سے جب حسین علی خاں کا خاتمہ ہوا تو محمد شاہ کو از سر نو سانس لینے اور خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے سلطنت کے مردہ جسم میں روح زندگی پھونکنے کا موقع ملا لیکن پھر نادر شاہ درّانی کے حملہ نے حکومت کی چولیں ہلا دیں۔ بعد میں احمد شاہ ابدالی پانی پت کی فتحیابی کے بعد ہر چند سابقہ احوال کی بحالی کی کوشش کی لیکن مغل سلطنت پھر نہ پنپ سکی۔ بہر حال مرکزی حکومت کی کمزوری سے ایک طرف اس وقت کی منہ زور طاقتوں کی بن آئی اور دوسری طرف جو طاقتور امراء اور صوبیدار تھے انھوں نے اپنے علاقوں میں خود مختاری کا علم لہرا دیا۔ مشرقی ہند (پورب) میں ایرانی سلطنت (حکومت آصفیہ) کی لکھنؤ میں داغ بیل پڑی اور جنوبی ہند (دکن) میں نظام الملک نے اپنی حکومت قائم کی۔

سیاستِ ہند میں سرحدی پٹھانوں کا داخلہ

اب یہاں پر ایک اہم تاریخی سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ جب مغل سیاست ایرانی و تورانی امرار سے وابستہ رہی تھی تو سرحدی پٹھانوں کی یہ تیسری طاقت کہاں سے ابھر آئی۔ آزاد سرحد کی یہ خوانیں درّہ خیبر اور گولان کی پہاڑیوں کے اندر محصور آزاد قبائلی زندگی میں مست و مگن، بیرونی دنیا اور اس کے سیاسی جھگڑوں سے کوسوں دور، اپنے آزاد علاقہ میں خوشحال خاں خٹک کے آزادی کے گیت گاتے ہوئے زندگی گذار رہے تھے۔ یہ ان سرحدوں کو پھاند کر مضطرب ہندوستان کی سیاست میں کیوں کر داخل ہوئے؟ اس اہم تاریخی سوال کے حل سے ریاست بھوپال کی تشکیل کا پس منظر سامنے آجاتا ہے۔ اس لیے اس کا جواب دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔
ہمارے نزدیک اس کا حقیقی جواب حملۂ نادری میں مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نادر شاہ درانی بھی امیر تیمور کی طرح ایک قہر الٰہی بن کر آیا تھا اس کی تلوار کے سامنے بھی کوئی نہ ٹک سکا۔ مغل شہنشاہیت اپنے پورے لاؤ لشکر اور جاہ و حشم کے باوجود اس کے وحشیانہ حملوں کی تاب نہ لا سکی۔ مغل حکومت کا مضبوط و مستحکم محل ایک جھٹکے میں زمین بوس ہو کر رہ گیا۔ تین دن تک چاندنی چوک اور دلّی میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ قزلباشوں نے کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور کوئی طاقت آڑے نہ آسکی۔ بہر حال نادر شاہ چونکہ کابل و قندھار اور یاغستان کی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ راستہ میں آزاد سرحد کے ان آزاد قبائل نے روک بننا چاہا لیکن یہ سرحدی پٹھان بھی اس کی تاب نہ لاسکے ہر مقام پر ان کے پاؤں اکھڑ گئے

آفریدی و مہمندری و مسعودی اور دوسرے پٹھان قبیلوں کو اس کے مقابلہ میں زک اٹھانا پڑی اور اس قہر خداوندی کی تلوار نے ان کو منتشر و پراگندہ کر دیا۔ چنانچہ ان بکھرے ہوئے افراد نے اپنے اپنے سرداروں کے ماتحت ہو کر جنگی خدمات کے لیے آزادانہ یا ملازمانہ مرکز بنانا شروع کر دیئے۔ (سیر المتاخرین ص ۴۸)

محمد خاں (روہیلے) نے قندھار وغیرہ کے جرگوں کو اکٹھا کر کے اور اعتماد الدولہ کی نگاہِ التفات سے سرفراز ہو کر روہیلکھنڈ کی بندیل کھند کے مقابل بنیاد ڈالی اور آملہ کو پایہ تخت بنایا جس کے جانشین حافظ الملک رحمت خاں نے ایک فلاحی ریاست قائم کی۔ جس کو فرنگی سامراج کے اشارہ پر شجاع الدولہ لکھنوی نے ختم کیا اور نجیب الدولہ نے نجیب آباد کی ریاست ہمالیہ کی ترائی میں قائم کی احمد شاہ ابدالی نے اس منتشر طاقت کو منظم کر کے پانی پت کے آخری میدان میں ان خانماں برباد پٹھانوں کے لیے نہ صرف زمین ہموار کی بلکہ شاہ عالم سے عہد لیا کہ بادشاہ تو مغل رہیں گے اور قلمدان وزارت نواب اودھ اور امیر الامرائی کا عظیم عہدہ نجیب الدولہ کے سپرد ہو گا۔ اس نظام سے مغل شہنشاہیت نے کچھ دن سنبھالا لیا لیکن اندر سے اس کی جان نکل چکی تھی۔ فرنگی سامراج کی ریشہ دوانیاں اندر ہی اندر چل رہی تھیں اس لیے یہ آخری نسخہ بھی سلطنت کی زندگی بڑھانے کے لیے کارگر نہ ہو سکا۔ بہر حال روہیل کھنڈ، نجیب آباد، فرخ آباد، باندہ، ٹونک وغیرہ پٹھانوں کی ریاست بنیں۔ ریاست بھوپال جو ہماری موضوع بحث ہے وہ بھی ان پٹھانوں کی یادگار تھی جو نیم آزاد سابقہ ریاستوں کی طرح سنہ ۱۹۴۹ء تک رہی اور پھر انڈین یونین میں ضم ہو گئی۔

بانی ریاست سردار دوست محمد خاں انکی اولوالعزمی و سادگی اور انسان دوستی

سابقہ ریاست بھوپال کے بانی سردار دوست محمد خاں افغانی قوم آزاد سرحد (تیراہ)

کے باشندے ایک سیدھے سادے مسلمان اور انسانیت دوست پٹھان اور ایک اولوالعزم بہادر انسان تھے۔ حکومت و ریاست کی نخوت و غرور سے نفور اور درباری شان و شوکت سے دور کا بھی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جب بہادر شاہ اول اس کے جانشین ہوئے اور مرکز کی کمزوری نے ہر طاقتور و حوصلہ مند سرداروں کو اقتدار قائم کرنے کا سنہرا موقع دیا اور ہر دلیر و بہادر اپنی فوجی و جنگی طاقت کی بنیاد پر مغل شہنشاہیت کے اندر حصہ بٹانے کے لیے سرگرم ہوا تو سردار صاحب ہندوستان ۱۱۲۰ھ آئے۔ اولاً جلال آباد پھر دہلی اور مالوہ پہنچے۔ اس دور میں فرنگی سامراج کی لائی ہوئی فرقہ پرستی کی پرچھائیاں بھی کسی پر نہ پڑی تھیں اس لیے منگل گڈھ کی رانی کے یہاں ملازم ہو گئے اور اپنی بہادری و وفاداری کا یقین رانی کے دل میں قائم کیا کہ ان کو بیٹا بنا لیا۔ یہیں سے ان کے روشن مستقبل کا دروازہ کھلا وہ مختلف مقامات پر ملازمت کرتے رہے۔ پھر جب یہاں ان کے قدم جم گئے تو اپنے رشتہ داروں کو بلا کر ایک جمعیت تیار کی اور قسمت آزمائی کے لیے اس علاقہ کو منتخب کیا۔ بیرسیہ کو اس کے جاگیردار تاج محمد خاں سے قاضی محمد صالح اور سب دل رائے کے واسطے سے حاصل کیا۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں اور ٹھاکروں کے ظلم و زیادتی سے بدامنی کا آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مظلوموں، کمزوروں کی دعوت پر ان کی طاقت کو توڑ کر پاداشون و جگدیش پور (اسلام نگر) وغیرہ پر قابض ہوئے۔ محمد فاروق حاکم بھیلسہ سے معرکہ آرائی میں کامیاب ہو کر یہ علاقے ان کے تصرف میں آ گئے۔

سردار صاحب کی خوش آئند ترقیات کا عروج

جب وہ دور آیا کہ نظام شاہ گونڈ کی بیوہ رانی کملاپتی نے اپنے شوہر کے قاتلوں کو بدلہ لینے کے صلہ میں سردار صاحب کی بہادری و ہمدردی کی وجہ سے ان کو اپنا بیٹا بنا لیا اور ان کو موضع بھوپال دے دیا۔ انھوں نے ایک حکم جاری کر دیا

کہ جو شخص اس خطہ میں سے جتنا برّو (گھاس) کاٹ کر صاف کرے وہ زمین اسکی ہے چنانچہ برّو کاٹ بھوپالی کی اصطلاح اس دور کی یادگار ہے۔ شہر بھوپال کی دوبارہ قسمت اس وقت جاگی جبکہ سردار صاحب نے بھوپال کو ریاست کی راجدھانی بنایا اور اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مزدور بن کر قلعہ کی چار دیواری تعمیر کرنا شروع کی اور بھوپال کے پہلے قاضی محمد معظم کے ہاتھوں اس کی بنیاد رکھوائی شہر کے دروازوں کو ہفتوں کے نام سے موسوم کیا اور اپنی بیوی کے نام پر قلعہ کا نام فتحگڈھ رکھا۔ فتح بی بی ان کی بیوی نے ایک ہندو بچے کی پرورش کی تھی جو مسلمان ہو کر ابراہیم خاں کہلایا وہ اس قدر وفادار ثابت ہوا کہ سردار صاحب کو ایک بار بھوپال چھوڑنا پڑا تو ابراہیم خاں جملہ امور خانگی کے ذمہ دار بنائے تھے آج بھی محلہ ابراہیم پورہ ان کی یادگار ہے۔

راقم السطور کے بچپن میں جب مسجد ابراہیم پورہ کی نئی تعمیر کے وقت ان کی نعش نکلی وہ صحیح وسالم حالت میں تھی۔ بھوپال کے مشرقی و مغربی علاقہ آشٹہ سہیور چین پوری باڑی وغیرہ ان کے قبضہ میں آگئے دیوان وجے رام نے اپنا علاقہ شجالپور کی از خود پیش کش کی ان کی نیکی و بزرگی کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب وہ ان علاقوں پر فتحیاب ہو گئے تو انھوں نے اپنے والد نور محمد سے اور ان کے انکار کرنے پر بھائیوں سے حکومت کرنے کی درخواست کی۔ جب سب نے متفق ہو کر خود ان کو سردار بنانا طے کیا تو اس منصب کو قبول کیا۔

(سلک مروارید)

وہ اپنی رعایا میں گھل مل کر رہتے اور عام رعایا ہندو مسلم ہر ایک کو ایک نظر سے دیکھتے تھے اور ظالم کے خلاف مظلوم کی امداد کے لیے میدان میں کود پڑتے جس کی وجہ سے اس علاقہ میں ہر دلعزیز ہو گئے۔ ان کی انسان دوستی کا واقعہ یہ ہے کہ ایک لڑائی میں وہ زخمی ہو کر گرے ان کے پاس ایک اور زخمی پیاس سے تڑپ رہا تھا جب پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ مخالف فوج کا سردار ہے۔ لیکن انھوں نے

اپنی پانی کی چھاگل نیزہ میں لگا کر اس کے منھ کے قریب کردی اور اس کو پانی پلا کر حیات نو بخشی۔

سردار صاحب نے تیس سال کی مدت میں ریاست کے رقبہ کو پچیس ۲۵ ہزار مربع میل تک وسیع کر کے ایک چھوٹی سی ریاست چھوڑ کر ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں انتقال کیا اور قلعہ فتحگڈھ میں دفن ہوئے۔

نواب یار محمد خاں ان کی دلاوری اور علوم نوازی

جب سردار دوست محمد خاں کا انتقال ہوا تو ان کے بڑے صاحبزادے یار محمد خاں نظام کے یہاں حیدر آباد میں نظر بند تھے جس کا قصّہ یہ ہے کہ نظام الملک آصف خاں ۱۱۳۱ھ میں صوبیدار مالوہ محمد شاہ بادشاہ کی طرف سے ہو کر آیا تھا اور اس کا مقابلہ دلاور خاں نے برہان پور میں ۱۱۳۲ھ میں کیا تھا۔ دلاور محمد خاں کی مدد سردار صاحب کے بھائی منیر احمد خاں نے کی تھی جس کی وجہ سے جب نظام الملک صوبیدار دکن بھوپال سے ۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء میں گذرے اور سردار صاحب کی گوشمالی کرنا چاہی تو سردار صاحب نے باہمی صلح کر کے یار محمد خاں کو یرغمال کے طور پر نظام کے ساتھ کر دیا۔ جب ان کے انتقال کی خبر وہاں پہنچی تو نظام نے بلا کر تعزیت کی جس کے جواب میں یار محمد خاں نے عرض کیا کہ ایک پٹھان کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو کیا ہوا حضور کا سایہ تو باقی ہے۔ اس جواب سے نظام نے خوش ہو کر نوابی کے خطاب و شاہی مراتب کے ساتھ ان کو بھوپال روانہ کیا۔ اس اثنار میں ریاست کے تخت پر ان کے بھائی سلطان محمد خاں کو بٹھایا گیا۔ ان کے آنے پر یار محمد خاں تخت نشین ہوئے۔ انھوں نے دیوان عاقل محمد خاں کے انتقال پر دیوان وجے رام کو اپنا دیوان یا مدار المہام بنایا۔

ماںجی ممولابی اور ان کی حسنِ تدبیر و رعایا پروری

نواب یار محمد خاں اولوالعزمی و بہادری میں اپنے پدر بزرگوار سے پیچھے نہ تھے

چنانچہ دائرہ ریاست کو بے حد وسیع کیا کوٹہ بوندی کے علاقہ تک وہاں کے راجہ
سے جنگ کر کے فتحیاب ہوئے اور وہاں کی راجکماری ممولابی سے بعد قبول اسلام
عقد نکاح کیا جو ماںجی ممولابی کے لقب سے مشہور ہوئیں اور حضرت غوث قادری سے
بیعت ہو کر درجہ ولایت کو پہنچ گئیں۔ امور سلطنت میں ان کا برابر کا ہاتھ رہا۔
اس قدر رعایا پرور و رحمدل تھیں کہ جب تک یہ نہ معلوم کر لیتیں کہ شہر میں کوئی
بھوکا باقی نہ رہا اس وقت تک کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ ماںجی صاحبہ کی مساجد اور
باؤلی د اسلام نگر یادگار ہیں۔

یار محمد خاں ایک دلیر و بہادر انسان ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے علم دوست
اور علماء نواز بھی تھے چنانچہ سب سے پہلے انھوں نے ہی مفتی قاضی خیر اللہ صدیقی
کو جو مالوہ کے زبردست عالم فاضل تھے ریاست کے افتار کے لیے خصوصی حقوق
و مراعات کے ساتھ بلایا۔ موصوف کی آمد سے شہر بھوپال علم و فضل کا شہر بن گیا۔
ان کے زمانہ ہی میں ایک گمنام مگر زبردست مؤرخ رستم علی شاہ آبادی نے شہر
بھوپال کے پرسکون خطہ کو اپنا مستقر بنا کر ہندوستان کی سچی اور اہم تاریخ لکھی
جس تاریخ نے سرجان مالکم کو بقول یوسف قیصر مالوہ کی تاریخ کا مورخ بنا دیا۔
اس تاریخ کا ایک نسخہ قلمی و غیر مطبوعہ برٹش میوزیم میں ہے۔

اسی طرح اخوند جی ہردہ کو بھی بھوپال مدعو کیا۔ جو ایک قابل فاضل عالم
اور مورخ تھے۔ ہنڈیا جہانگیران کو دی گئی۔ رستم علی کی تاریخ اس لیے بھی اہمیت
کی حامل ہے کہ اس نے بلا رو رعایت خوشامد پرستی ہندوستان کی سچی تاریخ

بھوپال کی آزاد فضا میں تحریر کی۔ یار محمد خاں نے تیرہ سال برسر اقتدار رہ کر اور
ریاست کی علمی و توسیعی ترقی دیتے ہوئے ۱۱۶۷ھ ۱۷۹۳ء میں انتقال کیا۔ اپنی قائم کردہ
راجدھانی اسلام نگر میں دفن ہوئے

نواب فیض بہادر شاہ اور ان کی روحانیت و درویشی

ریاست کا یہ دور ہر دو فرمارواؤں کی دلاوری و بہادری کی بناپر توسیع ریاست کے حق میں بہت سازگار ثابت ہوا۔ لیکن اس کے بعد جب نواب فیض محمد خاں مسند نشین ہوئے تو ایک طرف اندرونی خانہ جنگی اور دوسری طرف بیرونی طاقتوں مرہٹوں کی حملہ آوری سے یہ ریاست خطرات میں گھر گئی تھی۔ نواب صاحب کم سن و نو عمر تھے لیکن ماںجی ممولابی کے حسن تدبیر اور انتظامی صلاحیت نے ریاست کو منجدھار سے نکال لیا۔ جو مدعی ریاست بن کر کھڑے ہو گئے تھے ان کو نواب صاحب نے اپنی بہادری اور ماںجی ممولابی نے اپنی حکمت عملی سے خاموش کر دیا۔ نواب فیض محمد خاں کا اہم کارنامہ قلعہ رائسین کو اور اس کے قلعہ دار نوید خاں سے فتح کر کے حاصل کرنا ہے جو ایک نہایت کاہل الوجود اور عیش پرست آدمی تھا۔ اس واقعہ کی اطلاع جب بادشاہ دہلی کو مع نذرانہ کے دی گئی تو وہاں سے ان کو فیض الدولہ فتح جنگ کا خطاب دیا جا کر یہ علاقہ ریاست کے قبضہ میں دیدیا گیا جیسا کہ لکھا جاچکا کہ اس دور کے اندر ایک نئی طاقت (مرہٹوں کی) جنوبی ہند سے ایک طوفان بن کر پورے ملک کو زیر و زبر کر رہی تھی اور یہ ریاست رہ گذر میں کانٹا بن کر کھٹکتی تھی۔

اس لیے پونا کے پیشوا نے جو صوبیدار مالوہ بن کر آیا تھا بھوپال پر چڑھائی کی جس کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی اس لیے ماںجی ممولابی کے مشورہ سے آدھی ریاست دے کر صلح کر لی گئی۔ اس وقت کے حالات کی پر آشوبی اور خود

نواب صاحب کی درویشانہ طبیعت نے ان کو عبادت الٰہی کی طرف مائل کر دیا اور شاہ محمد غوث قادری کے حلقہ ارادت میں داخل اور اشغال باطنی کی تکمیل سے وہ نواب کے بجائے فیض بہادر شاہ ایک ولی کامل کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہوئے اور ان کی کرامت کا واقعہ زبان زد خاص و عام ہے کہ جب ۱۱۷۳ھ ۱۷۵۹ء میں باجی راؤ پیشوا

ابدالی سے مقابلہ کے لیے پانی پت جا رہا تھا تو اس نے فیض بہادر شاہ کے ساتھ جانے کے انکار پر دھمکی دی کہ واپسی میں اس پٹھان کو سمجھ لوں گا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ بھاؤ واپس ہی نہ آئے گا۔ چنانچہ پانی پت کے میدان میں ہی ۱۱۷۴ھ/۱۷۶۵ء میں مرہٹہ طاقت کی شکست ہوئی۔ تاریخ مالوہ میں ہے کہ نواب چاہتے ہیں وہ غیب سے ہوتا ہے۔ دیوان بجے رام نے ان کے دور میں وفات پائی جو ریاست کا مخلص وفادار تھا اور خود نواب صاحب نے ۱۱۹۱ھ/۱۷۷۷ء میں انتقال فرمایا۔ وہ ایک عابد و زاہد، صوفی منش، گوشہ نشیں، فیاض، رحمدل انسان تھے۔ ان کا قد سات فٹ کا اور ان کے ہاتھ بھی بڑے تھے۔ اہل بھوپال ان کو ایک ولی اللہ کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ان کی بیوی صالحہ بیگم نے ان کے مزار پر گنبد وغیرہ تعمیر کیا۔

نواب حیات محمد خاں اور انکی گوشہ نشینی

نواب فیض محمد خاں چونکہ لاولد تھے اس لیے ان کے بھائی حیات محمد خان کافی ہنگامہ آرائی کے بعد مسند ریاست پر بیٹھے۔ انھوں نے دیوان چھوٹے خاں جو ایک نومسلم تھے اپنے بیٹے کی طرح اس کو پالا تھا۔ دیوان ریاست بنایا تھا جن کی خدمات ریاست کے لیے دیوان بجے رام سے کم اہم نہ رہیں۔

دیوان چھوٹے خاں کے کارنامے

سب سے پہلے اس نے خانہ جنگی (جو سردار صاحب کے خاندان کے افراد کی طرف سے ریاست کے لیے برپا تھی) اس کو بزور طاقت ۱۲۰۱ھ میں ختم کیا۔ پھر بیرونی فتنوں (جس کے اندر سب سے بڑا فتنہ پنڈاروں کا تھا) دبا دیا۔ پنڈاروں کے جب بھوپال پر حملے ہوئے تو اس نے شکست دے کر ہر ایک کو ایک ایک پگڑی اور نذرانہ دے کر احسان مند بنا لیا۔ راجہ بھوج کے بندھ کے بعد سے دوسرا بندھ شہر کے

مشرق رویہ اسی نے باندھا اس لیے وہ چھوٹا تالاب کہلایا۔ بعد میں یہ کچا پل "پل پختہ" بن گیا۔ دیوان چھوٹے خاں ایک مدبّر و منتظم دیوان ثابت ہوا۔ یہی وہ چھوٹے خاں ہے جس نے خانوادۂ ولی اللہ کے چشم و چراغ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو بھوپال کیلئے دعوت دی، وہ علماء و فضلاء کا بے حد قدرداں تھا۔ اس کے انتقال ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء کے بعد ریاست میں افراتفری پیدا ہوئی۔ ہوشنگ آباد ریاست کے ہاتھ سے نکل گیا۔ نواب صاحب گوشہ نشین عبادت تھے۔ ان کی بیوی عصمت بیگم نے جو ایک بیدار مغز خاتون تھیں اور ان کا اور نواب صاحب کا معاملہ جہانگیر و نور جہاں کا تھا، اپنی انتظامی صلاحیت سے بدامنی کو دور کرنا چاہا۔ مرید محمد خاں کو دیوان بنایا لیکن بگڑی حالت نہ سنبھل سکی تب وزیر محمد خاں کو ملایا جو سردار صاحب کی اولاد سے تھے اور جنھوں نے دوسروں کے یہاں ملازم ہوکر اپنی بہادری کا سکہ دلوں پر بٹھایا تھا۔ چنانچہ انھوں نے ریاست کو مرہٹوں کے نرغہ سے نکالا۔ نواب وزیرالدولہ خطاب ملا۔ قلعہ رائسین کو دوبارہ ریاست میں داخل کیا۔

نواب وزیرالدولہ اور ان کی غیر معمولی بہادری

جب نواب حیات محمد خاں کا انتقال ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء میں اور اقتدار حاصل ہوا نواب غوث محمد خاں نواب بنائے گئے لیکن سارے اختیارات وزیرالدولہ کے ہاتھ میں رہے۔ غوث محمد خاں نے ساز باز کر کے راگھوجی بھونسلہ ناگپور کے ذریعہ نواب صدیق علی خاں کو بلاکر ان کی طاقت کو توڑنا چاہا قریب تھا کہ ریاست ختم ہو جائے کہ وزیرالدولہ بھوپال کے نجات دہندہ کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور ریاست کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بھنور سے نکال لیا۔ راگھوجی بھونسلہ ناگپور اور سندھیا وغیرہ مرہٹہ متفقہ افواج نے بھوپال پر ۱۸۱۴ء میں اس شدت سے حملہ کیا کہ شہر خطرہ میں پڑ گیا۔ اس وقت شہر کی عورتوں نے اس قدر بے جگری سے مقابلہ کیا کہ دشمن جو اندرونِ شہر گھس آیا تھا اس کو باہر نکال دیا اور دشمن کے چھکے چھڑا دے یہ ریاست کے لیے

ایک خطرناک دور تھا کہ شہر بھوپال کو جنگی سات حملوں سے دوچار ہونا پڑا لیکن نواب وزیر الدولہ کی کمال جواں مردی سے ریاست خون کے دریا سے سرخ رو ہوکر نکلی ان کی فتوحات سے ان کا رعب داب ملک میں بیٹھ گیا اور بانڈے گھوڑے والے نواب کے نام سے شہرت پائی۔ یہی وہ دور تھا جب کہ فرنگی سامراج نے پورے ملک میں سیاسی ریشہ دوانیاں پھیلا رکھی تھیں ریاست بھوپال کو بھی معاہدہ باہمی کے جال میں پھانس لیا۔ جس کے نتیجہ میں ریاست غوث محمد خاں کی اولاد سے منتقل ہوکر ان کے بیٹے نظر محمد خاں کو ملی۔ جن کی شادی نواب گوہر بیگم دختر غوث محمد خاں سے اتحاد باہمی کے لیے کردی گئی۔

نواب نظر محمد خاں اور انگریزوں کی معاہداتی جکڑبندی

نواب وزیر محمد خاں کے ۱۲۳۱ھ ۱۸۱۶ء وفات پانے پر ان کے بیٹے نظیر الدولہ کے ساتھ نواب بھوپال بن گئے۔ اس وقت کی بدامنی اور مرہٹہ گردی کے فتنہ سے بچنے کے لیے انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے معاہدہ کرکے ریاست کی نیم آزادی پر قناعت اختیار کرلی۔ سیہور چھاؤنی پولٹیکل ریجنٹ مقرر ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے والد مرحوم کی بہادری و انتظام ملکی میں قدم بہ قدم تھے۔ لیکن انگریزوں کے ساتھ باہمی معاہدہ ان کو راس نہ آیا اور ان کے خاندان میں ناراضگی و برہمی پھیل گئی اور تین سال حکومت نہ کرپائے تھے کہ ایک روایت کے مطابق اپنے برادر نسبتی فوج دار محمد خاں کے ہاتھ سے شہید ہوگئے ان کی موت سے نوابان بھوپال کے پرآشوب خونیں دور سے ریاست نکل کر بیگماتی پرامن زریں عہد کے اندر داخل ہوگئی۔ نواب گوہر بیگم ان کی جگہ پر مسند ریاست پر بیٹھ گئیں۔

نواب قدسیہ بیگم ان کی شانِ ولایت وغربا پروری

گوہر بیگم دختر نواب غوث محمد خاں جن کو اپنی پاکیزہ نفسی اور غیر معمولی نیکی و پرہیزگاری

کی وجہ سے قدسیہ لقب ملا اپنے شوہر کے سانحۂ شہادت پر ان کو فرماں روا ۱۲۵۳ھ/۱۸۱۹ء میں بنا دیا گیا۔ راجہ خوشوقت رائے حاکم شہر نے مع ان صاحبان کے جو ریاست کے قدیمی خیر خواہ تھے ریاست کے فتنوں کو دبایا۔ لیکن پولٹیکل ریجنٹ انگریز بہادر کے اولاد منیر محمد خاں پھر جہانگیر محمد خاں کے ساتھ ان کی بیٹی سکندر بیگم کے ساتھ رشتہ نکاح کے لیے مجبور کر کے نظم و انتظام میں ابتری پیدا کر کے اور آخر میں ایک ولیہ کاملہ اور ایک درویش منش بیگم کو ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں تختِ ریاست سے اتار دیا۔

قدسیہ بیگم نے اولاً اپنے بھائی میاں فوجدار محمد اور پھر معز محمد خاں کو مختار ریاست بنانا چاہا لیکن پولٹیکل ریجنٹ نے اپنے سیاسی مصالح کی خاطر اجازت نہ دی۔ پھر راجہ خوشوقت رائے مختار ہوئے جو وزیر خوش تدبیر ثابت ہوئے۔ خود قدسیہ بیگم ایک نہایت مدبّرہ و منتظم خاتون تھیں۔ ہندو مسلم رعایا ان کی نظر میں یکساں تھی۔ وہ ہر ایک کی فریاد بذات خود سنتیں اور پھر گھر گھر جاتی تھیں۔ مسلمانوں کے جملہ معاملات دار القضا میں فیصلے پاتے۔ ان کی دین داری کی شہادت بھوپال کی پختہ و سنگین و بلند و بالا جامع مسجد ہے۔ انھوں نے ذوقِ روحانی کی تکمیل قادری سلسلہ میں کی۔ ان کی زندگی اولیاء اللہ کی تھی۔ وہ اپنی رعایا کے پریشان حال اور مصیبت کے ماروں کے پاس خود پہنچتی اور ہر ایک کی امداد کرتی۔ وہ پہلی والیہ تھیں جنھوں نے اپنے مصارف سے آب رسانی کا انتظام (نل وغیرہ) جاری کیے اور ٹیکس سے رعایا کو مستثنیٰ رکھنے کے لیے خزانہ میں روپیہ جمع کیا۔ جس کا فیض آج تک جاری ہے۔ ان کی عادت شریفہ تھی کہ دسترخوان بچھانے سے پہلے پوچھتیں کہ شہر کی غریب رعایا میں سے کوئی ایسا گھر تو نہیں رہ گیا جہاں فاقہ ہو۔ ان کے نقیب محلے محلے مقرر تھے جو اس کی خبر پہنچاتے کہ ہر غریب و مسکین کو ڈیوڑھی سے کھانا پہنچا دیا گیا ہے۔ پھر وہ سوال کرتیں کہ مسجدوں، سراؤں اور دھرم شالاؤں میں تو کوئی بھوکا نہیں رہ گیا۔ ان کے ملازم ڈھونڈ ڈھونڈ کر، دوڑ دوڑ کر ہر جگہ کی خبر لا کر ان کو پہنچاتے تو پھر کہتیں کہ بھڑوا شہر کی چار دیواری کے باہر بھی قافلے اور مسافر اترتے ہیں

اس کی رپورٹ لاکر دو کہ وہ بھی پیٹ بھر کر سو گئے۔ فقیر کے دادا (سید ث کر علی صاحب مرحوم) فرماتے تھے کہ بعض اوقات رات کا کھانا آدھی آدھی رات کو کھایا جاتا تھا جبکہ ان کو یقین دلایا جاتا کہ شہر میں کوئی بھوکا پیاسا نہیں سویا۔ ان کے باورچی خانے سے غریبوں، مسکینوں کو رنگا رنگ کے کھانے کھلائے جاتے لیکن وہ خود سوت کات کر اس کی آمدنی سے جوار کی روٹی اور مسور کی دال اکثر کھاتی تھیں قدرت نے ان کی عمر شریفہ میں غیر معمولی برکت عطا فرمائی کہ انھوں نے اپنی نواسی (شاہجہاں بیگم) کے نواسے نواب نصر اللہ خاں اور جرنل عبید اللہ خاں کو دیکھا۔ ان کی داد و دہش کے بہانہ ڈھونڈنے کا لطیفہ مشہور ہے۔ پرانا بھوپال چار دیواری میں آباد تھا اس سے لگا ہوا جنگل تھا جہاں صحرائی جانوروں کا زور تھا۔ ایک بار سردیوں کی رات میں گیدڑوں کی آوازیں سن کر پوچھا کہ آخر یہ اتنا شور کیوں کر رہے ہیں۔ مصاحبوں نے عرض کیا حضور ٹھنڈ کی وجہ سے شور مچا رہے ہیں۔ یہ جواب سن کر خاموش ہو گئیں اور سویرے شہر کے تمام غربا میں لحاف تقسیم کرانے کا حکم جاری کر دیا۔ قدسیہ بیگم اپنے باون[۵۲] گاؤں جو ان کو جاگیر میں ملے تھے سب کو بھلائی کے کام اور رفاہ عام کے لیے زندگی میں وقف کر دیا تھا۔ جس کے اندازاً اڑتیس[۳۸] ہزار روپیہ سالانہ مسلمانوں کے لیے اور بتیس[۳۲] ہزار روپیہ ہندو رعایا پر خرچ کیے جاتے تھے۔ وہ اسی فیاضی و دریادلی اور غیر معمولی عبادت گذاری اور خشیت الٰہی کا مجسمہ تھیں اسی طرح اپنے مالک کی مخلصانہ عبادت اور مخلوق خدا کی سچی خدمت فرمائی ہوئی بھوپال کی مادر مہربان جو والیہ ریاست سے زیادہ ولیہ کاملہ تھیں ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں اپنے پیچھے پوری ریاست کو روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔

نواب جہانگیر محمد خاں اور ان کی ادب نوازی

نواب قدسیہ بیگم کی صاحبزادی سکندر جہاں بیگم تھیں جو کمپنی کے معاہدہ کے مطابق ریاست کی جائز وارث تھیں ان کی کم سنی سے کمپنی بہادر نے ناجائز فائدہ

اٹھاکر ایک طرف قدسیہ بیگم کو عارضی والیہ بنایا۔ لیکن اختیارات نائب سلطنت کے ہاتھ میں دینا طے کیا اور نائب سلطنت کو ریجنٹ بہادر کے ماتحت بنا دیا۔ اس طرح برطانوی ڈپلومیسی ڈیوائڈ اینڈ رول نے افراتفری پیدا کر دی۔ سکندر جہاں بیگم کا عقد جہانگیر محمد خاں سے کر دینے پر مجبور کیا۔ اور دوسری طرف ان کے غلط کار مشیروں کے ذریعہ ان کو نوابی اور خود مختاری کے لیے اکسایا۔ اس رسہ کشی میں دوبارہ ریاست کی کشتی پھر گردابِ سیاست میں پھنس گئی۔ لیکن قدسیہ بیگم اور قدیمی بہی خواہانِ ریاست نے اس کو ڈوبنے سے بچایا اور جہانگیر محمد خاں نواب بنا دیے گئے۔ جہانگیر محمد خاں بذات خود ایک شریف النفس، علم دوست، فیاض، دلیر، ادب نواز اور شاعر تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے باہر کے علماء و فضلاء شیخ احمد یمینی نفحۃ الیمن قاضی شریف حسین دہلوی (جو شاہ عبد الحق محدث دہلوی کے خاندان سے تھے) مشہور حکیم اعظم حسین اور دیگر فضلاء و شعراء کو خصوصی طور پر بھوپال مدعو کیا۔ اور بے حد قدر دانی کی۔ جس کی وجہ سے ریاست میں علم و ہنر کو فروغ حاصل ہوا۔ شہر کے باہر ایک مستقل محلہ محلہ جہانگیر آباد عالیشان عمارت سے آباد کیا لیکن فرنگی سامراج نے ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ نواب اور بیگم میں باہمی نزاع کی خلیج پیدا کر دی کہ ایک دوسرے کا منھ نہ دیکھ سکتے تھے۔ غرض وہ اپنے برخود مشیروں کے ہاتھوں (جن کو کمپنی بہادر سے شہ ملتی رہتی تھی) شکار ہو کر ترپن ۵۳ سال کی عمر میں ۱۲۶۰ھ ۱۸۴۴ء میں اس عالم ویران سے گذر گئے اور نور باغ جہانگیر آباد میں مدفون ہوئے۔

نواب سکندر جہاں بیگم اور ان کی انتظامی صلاحیت و مردانگی

جس وقت ان کے والد نواب جہانگیر محمد خاں کا انتقال ہوا تو وہ سب سے کم عمر تھیں اس لیے اولاد قدسیہ بیگم پھر جہانگیر محمد خاں انتظام ریاست ان کی طرف سے چلا رہے تھے۔ سکندر بیگم کو تخت ریاست پر پہنچنے تک مصیبتوں کے جنگل اور خانہ جنگی کے خطرناک میدانوں کو طے کرنا پڑا جیسا کہ ابھی گذرا انگریز بہادر نے وارثِ تخت

ان کو تسلیم کیا تھا۔ لیکن ان کے شوہر کے لیے نواب ہونا اور فوجدار محمد خاں کو مختارِ ریاست مگر پولٹیکل ریجینٹ کے ماتحت ہونا تجویز کیا تاکہ یہ سب آپس میں لڑتے رہیں اور صاحب بہادر اس باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ قدرت نے نواب سکندر جہاں بیگم کے اندر مدبرانہ دماغ اور اعلیٰ درجہ کی انتظامیہ صلاحیت اور معاملہ فہمی کے جوہر ودیعت کیے تھے اور ان کی والدہ کی پرورش اور اپنے وقت کے باکمال علمار کے فیض و تعلیم و تربیت سے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ پھر ان کی پوری زندگی بچپن سے (جس میں یتیمی کا داغ لگ گیا تھا) جوانی تک سخت خطرناک حالات اور جاں گسل امتحانات کی بھٹی میں تپ تپا کر کندن بن گئیں اپنے ملک سے پیار موروثی طور پر ملا تھا جس کی بہبودی و ترقی میں برابر لگی رہتی تھیں جس کی وجہ سے ترقی و خوشحالی کی منزل کامیابی تک پہنچایا ریاست بھوپال کی تاریخ میں ان کا وہی مقام ہے جو مغل حکومت میں اکبر کو دیا گیا ہے۔ جس وقت حکومت کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں آئی تو ریاست بدامنی و خانہ جنگی کے دور سے گذر رہی تھی۔ بھوپال کا وہی حال تھا جو استاد ذوق نے کہا تھا ؎

سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر چل کر رہ گئی

اندرون ریاست میں امن و امان پیدا کر کے اس کو ترقی کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ چنانچہ ۱۲۷۶ھ ۱۸۶۰ء میں اس کی باقاعدہ صدر نشینی کی تقریب منعقد ہوئی اور ان کی بیٹی شاہجہاں بیگم کو ولی عہد بنا دیا گیا۔ ان کے دور حکومت میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا بگل پورے ملک میں بج گیا اور ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک فرنگی سامراج کے خلاف آزادی پسند اٹھ کھڑے ہوئے۔ بغاوت کے ان شعلوں کی آنچ ریاست میں بھی محسوس کی گئی اور خاندان ریاست کے دو معزز جاگیردار فاضل محمد خاں اور جمال محمد خاں راحت گڈھ میں انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا کر جام شہادت نوش کیا۔ خود شہر و سیہور وغیرہ میں اس کے شعلے بھڑک اٹھے تھے لیکن سکندر جہاں بیگم نے دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک کر پیتا ہے کہ مصداق اپنی حکمت عملی سے ریاست کو بچا لیا۔ ان کے وزیر مدار المہام منشی جمال الدین نے

فنون کا مرکز بنا دیا۔ ولی اللٰہی خانوادہ کے چشم و چراغ شیخ الحدیث مولانا مفتی عبد القیوم دہلوی اور قاضی زین العابدین یمانی۔ شیخ الحدیث حسین عرب محدث بھوپال مولانا حیدر علی (آخری شاگرد شاہ عبد العزیز رح) صاحب منتہی الکلام اور حضرت شاہ رؤف احمد صاحب مجددی جیسے روحانی و علمی بزرگوں کے فیوض و برکات سے یہ خطہ مشہور ہوا۔ وہ پہلی رئیسہ تھیں جنھوں نے پوری ریاست کا تفصیلی دورہ کیا اور عدالتی و انتظامی ہر طرح کے شعبے قائم کیے۔ ہندوؤں کے فیصلے شاستر اور مسلمانوں کے شریعت کے مطابق کرنے کے احکامات جاری کیے گئے۔ زمینوں کی پیمائش اور کاشتکاروں کے لیے ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرنا راجدھانی سے پرگنوں کو ملانے کے لیے سڑکیں بنوانا۔ خصوصاً غریب رعایا کی دیکھ بھال ہر وقت اُن کے مدنظر رہتی تھی وہ ایک خاتون ہوکر فوجی اسپرٹ اور سپاہیانہ خصائل کی حامل تھیں اس لیے فوجی اصلاحات اس قدر اعلیٰ پیمانہ پر کیں کہ انگریزوں کو بھی اس کا اقرار کرنا پڑا۔ جملہ رعایا کا تعلیمی نظام قائم کیا اور مدارس دینی و دنیوی دونوں طرح کے جاری کیے۔ مشرقی علوم کا سب سے بڑا مدرسہ سلیمانیہ اُس کی یادگار تھا سب سے پہلے اُنھوں نے فارسی کی بجائے اُردو کو ریاست کی سرکاری زبان بنایا۔ شہر و دیہات میں جملہ رعایا کے لیے شفاخانے تعمیر کرائے وہ ایک اعلیٰ درجہ کی شہسوار، بہترین انشاء پرداز اور بیدار مغز مدبّر اور منتظم دیندار حکمراں تھیں۔ جن کے حسن تدبیر و انتظام سے بھوپال کا شمار مہذب و ترقی یافتہ ریاستوں میں ہونے لگا۔ ریاست کے علاوہ انھوں نے دہلی الٰہ آباد وجبل پور کے درباروں اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں سفر کیے اور وہاں کے ارباب فضل و کمال کی قدر افزائی کی۔ جب دہلی پہونچی تو ۱۸۵۷ء کے بعد جامع مسجد نمازیوں کے لیے بند کر دی گئی تھی۔ وہ پہلی رئیسہ تھی جنھوں نے مسجد کو کھلوا کر نماز ادا کی اور بازیابی کی کاروائی کی۔ اور زیارت حرمین شریف کی سعادت حاصل کی۔ اُن کے دور میں اپنی ریاست خوش حالی و ارزانی اور ارباب کمال کی قدر دانی کی وجہ سے ملک میں نیک نام ہوئیں۔ اُن کو جدید تعمیرات کا بھی شوق تھا۔ چنانچہ اُن کے تمام ابتدائی نام پر موتی مسجد، موتی محل اور بے شمار عالی شان عمارت تیار کیں۔ اُن کے

ہی زمانہ میں بھوپال ریلوے لائن سے پورے ملک سے جُڑ گیا۔ تاریخ بھوپال میں وہ معمار ریاست کی حیثیت سے یاد کئے جانے کی مستحق ہیں۔ آخر یہ امور خیر و رفاہ عوام کے کام انجام دینے والی، مخلوق خدا کی سچی خدمت گزار ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء کو اللہ کو پیاری ہوئیں اور اپنے باغ فرحت افزا میں محو خواب ابدی ہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم اور اُن کا ذوق تعمیر و دریا دلی

سکندر جہاں بیگم کی اکلوتی لڑکی ہیں۔ جو اسلام نگر ۱۲۵۴ھ ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوئیں۔ اُن کی والدہ نے سابقہ باہمی خانہ جنگی کے واقعات کے پیش نظر یہ طے کر لیا کہ میری لڑکی رئیس اور اُن کے شوہر برائے نام نواب ہوں گے اس لیے اُن کی تعلیم و تربیت کامل استادوں کے ذریعہ دلائی گئی کہ وہ بعد میں والیہ ریاست بن سکیں جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو حسب معاہدہ ان کو رئیس بنا دیا گیا اور اختیارات سکندر جہاں بیگم کو دیئے گئے۔ ان کا نکاح نواب باقی محمد خاں عرف امراؤ دولہا سے منعقد ہوا۔ جو خوان ریاست میں تھے اور میر بخشی تھے۔ شاہجہاں بیگم کی صدر نشینی ۱۸۶۸ء میں عمل میں آئی۔ جبکہ مادرِ مہربان کا انتقال ہو گیا۔ اور اُن کی بھی اکلوتی لڑکی سلطان جہاں بیگم کو ولیعہد بنا دیا گیا۔ جب وہ والیہ بھوپال ہوئیں تو داغ بیوگی سے دوچار ہوئیں۔ اس لیے گورنمنٹ سے عقد ثانی کی حسب حکم شریعت اجازت مانگی اور نواب صدیق الحسن صاحب سے نکاح ثانی ۱۲۸۸ھ میں ہوا۔ اسی قرآن السعدین سے بھوپال کی تاریخ کا ایک زبردست دور شروع ہوا۔ دور سکندری میں جن جن انتظامی امور و تعمیری امور کا آغاز کیا گیا عہد شاہجہانی میں اُن کو پایہ تکمیل تک پہونچا گیا۔ عدلیہ اور انتظامیہ کے جو قوانین و دستور تجویز کئے گئے اُن کا حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے ترمیمات کرا کے نافذ کیا۔ صحتِ عامہ میں مریضوں کے لیے دیسی شفا خانے قائم کئے۔ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ ہسپتال قائم کئے مدرسہ سلیمانیہ کو کلکتہ یونیورسٹی سے ملحق کر کے معیار تعلیم کو بلند کیا۔ اپنے والد کے نام پر دینی مدرسہ جہانگیریہ قائم کیا۔ محکمہ تعلیمی کو

نظارۃ المعارف العمومیہ کا نام دیا۔ تعلیم نسواں کا بھی آغاز کیا۔ رفاہ عام کے لیے سرائے سکندری بنوائی۔ بتلی گھر تعمیر کرایا۔ محکمہ آب رسانی کی توسیع کی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بقول سکندر جہاں بیگم "اس اندھی" ریاست کو جس کے اندر نہ ریل نہ تار برقی اس کا اجرا کر کے ملک کے ہر حصّہ سے جوڑ دیا۔

شاہجہانی تعمیرات:۔

نواب شاہجہاں بیگم کو مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی ہم نامی کا شرف ہی حاصل نہ تھا بلکہ وہ ذوقِ تعمیر بھی اُن کی طرح رکھتی تھیں۔ ایک چھوٹی سی ریاست کی والیہ ہونے کے باوجود، بھوپال کی خوشنما و خوبصورت عمارتوں سے آراستہ کیا۔ شہر کے مشرقی رویہ ایک مستقل آبادی شاہ جہاں آباد، آباد کی عام رعایا کو اس کی ترغیب و امداد کی۔
(۱) تاج محل (۲) عالی منزل (۳) بے نظیر کی عجیب و غریب اور دلفریب و دیدہ زیب عمارت تعمیر کرائیں۔ تاج محل میں ہر کمرہ کا رنگ علیحدہ اور اس کے مطابق فرنیچر سے آراستہ کیا۔ تفریح کے لیے پائیں باغ اور اُس کے اندر ساون بھادوں اور مختلف قسم کے خوش ثمر درختوں کے باغات لگوائے۔ اُن کی آخری تمنّا ایک ایسی عظیم مسجد کی تعمیر جو نادرہ اور یادگار ہو اِس کے لیے تاج المساجد کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اُسی دور میں پندرہ سولہ لاکھ روپے خرچ ہو چکے۔ اُس کا صحن بلّوری بنانے کا منصوبہ تھا۔ جو واقعتہً اس طرح بن جاتی تو ایشیا کی ایک ہی مسجد ہوتی۔ اُن کی دو ہی آرزوئیں تھیں جن کو لے کر وہ دنیا سے چلی گئیں۔ ایک یہ کہ کوئی مجھ سے ایک لاکھ روپیہ مانگتا اور وہ اُس کو دیتی دوسرے تاج المساجد اُن کے ذہنی منصوبہ کے مطابق مکمل ہو جاتی جس کا حوض موتیا تالاب بنتا۔ مسجد کا پورا فرش اور سارے گنبد بلّوری ہوتے۔ اور اس کے چاروں طرف عربی و اسلامی جامع ازہر کی طرح کی ایک یونیورسٹی بنائی جاتی۔

نواب شاہ جہاں بیگم عالمہ فاضلہ اور شاعرہ خاتون تھیں۔ اُن کے اندر انتظامی قابلیت اعلیٰ درجہ کی تھی۔ وہ بیحد فیاض و سخی اور رعایا پرور اور ارباب کمال کی

قدرداں تھیں۔ وہ جملہ رعایا کو ایک آنکھ سے دیکھتی تھیں۔ اُن کی سخاوت و فیاضی کا لطیفہ یہ ہے کہ بھوپال کی جامع مسجد کے میناروں کے کنگوروں پر حرم کے کبوتروں کو لاکر پالا گیا تھا۔ اُن کے لیے کئی من غلّہ کی بوریاں منجانب ریاست مقرر تھیں۔ ایک افسر بالا نے اپنی وفاداری کو ثابت کرنے کے لئے رپورٹ سرکار میں پیش کی کہ حضور کبوتروں کی تعداد اتنی ہے اُن کے لیے چند بوری غلّہ کافی ہے۔ رپورٹ دیکھ کر گالی دے کر فرمایا "کیا میں اتنی نادان ہوں کہ اس کو نہیں جانتی آخر غریبوں کا بھی پیٹ ہے" اور کاغذ پھینک دیا بلا کی قافیہ شناس تھیں ایک شخص نے دستِ سوال دراز کیا انھوں نے ایک روپیہ دیا۔ اُس نے کہا کہ حضور میں تو بہت اُمید لے کر آیا تھا تو انھوں نے اس سے قرعہ ڈلوایا۔ قرعہ میں وہی ایک روپیہ اُس کے لیے نکلا تو فرمایا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تیری قسمت میں اتنا ہی ہے۔

اُس کے ساتھ وہ بہت ہی رحم دل اور تمام رعایا کے لیے جاں نثار تھیں۔ چنانچہ اُن کے زمانہ میں جب طاعون کا حملہ ہُوا تو انہوں نے رعایا کی آسائش و آرام کے لئے دن رات ایک کر دیا۔ محلّہ محلّہ پہونچکر انتظام فرمایا۔ وہ ایک سچّی مذہبی خاتون تھیں ریاست میں محکمہ مساجد قائم کیا اور ہندوؤں کے لیے سدابرت قائم کیے۔ جہاں اُن کو آٹا دال پکانے کے لیے دیا جاتا۔ لندن میں شاہ جہانی و وکنگ مسجد پہلی مسجد ہے جو اُن کی یادگار ہے۔ اُن کو دوبارہ صدمہ بیوگی سے دوچار ہونا پڑا لیکن مستقل مزاجی سے اپنی ہندو مسلم رعایا کی خدمت کرتی ہوئی کینسر میں مبتلا ہو کر ۱۲۹۹ھ ۱۹۱۰ء میں اِس دنیا سے رخصت ہوئیں اور باغ نشاط افزا میں آرام فرما ہیں۔

تحریکِ جہاد اور نواب صدیق حسن خاں

ہندوستانی ریاستوں کے بارہ میں

انگریزی ڈپلومیسی

جیسا کہ لکھا جا چکا کہ آزاد سرحد کے باشندوں (پٹھانوں) نے ہندوستان کے طوائف الملوکی کے دور میں ریاست بھوپال کو قائم رکھا تھا۔ یہ حکمراں اپنی فطری

سادگی پر قائم رہے۔ حکومتی غرور و نخوت اُن کے اندر نہ پیدا ہُوا۔ اس لیے راعی و رعایا میں کوئی دوری نہ پیدا ہوئی۔ بقول اقبالؔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں رہتے چلے آرہے تھے۔ نوابوں کا دور تاریخ ہند کا خطرناک دور تھا۔ اس لیے خانہ جنگی کے علاوہ ریاست بیرونی حملوں سے دوچار ہوتی رہی اٹھارویں میں جب کہ مغربی سامراج نے مشرق کو اپنے استحصال و غارتگری اور لوٹ کھسوٹ کے لیے تاکا تو ملک مرکزی کمزوری کی وجہ سے افراتفری کا شکار تھا۔ فرنگی سامراج نے اپنی رسوائے عالم ڈپلومیسی (ڈیوائڈ اینڈ رول) کے تحت ہر جگہ اس پر فریب کھیل کو کھیلا۔ حافظ رحمت الملک والئ روہیلکھنڈ کو شجاع الدولہ سلطنت آصفیہ سے شمالی ہند میں ٹکرا دیا۔ جس طرح جنوبی ہند میں نظام حیدر آباد ٹیپو سلطان (میسور) کے مقابلہ میں لاکر کھڑا کر دیا۔ جہاں اس قسم کی دراندازی کا موقع نہ ملا دیال افرادِ خاندان میں ریشہ دوانی کر کے ایک دوسرے سے لڑوا دیا حکومت برطانیہ کی توسیعی پالیسی کا بانی ہیسٹنگز تھا۔ ابتدا لارڈ کارنوالس تک کمپنی کی پالیسی یہی رہی کہ ہر مضبوط و خوش حال ریاست کو ایک دوسرے کے ٹکراؤ اور توڑ پھوڑ کر اپنی تحویل میں لے لیا جائے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے بعد جب ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے قبضہ میں آیا اور ملکہ وکٹوریہ کا اعلانِ معافی جاری ہوا تو اب معاہداتی سیاست کے ذریعہ جکڑ بندی کی پالیسی کو اختیار رکھا گیا۔ چنانچہ ریاست بھوپال بھی اس سے ایک ریاست ہے جہاں فرنگی سامراج نے من مانی شرائط تھوپ کر نیم غلامی کی زنجیروں میں ریاست کو باندھ لیا۔ سب سے پہلے نواب نظر محمد خاں کو والی ریاست بنا کر نواب غوث محمد خاں کی اولاد (معز محمد خاں) فوجدار محمد خاں جن کو وراثت کے طور سے نواب ہونا چاہیئے تھا اُن اِس منصب سے ہٹا کر خاندانِ شاہی میں بغض و عداوت اور دشمنی کا بیج بو دیا۔ پھر نواب نظر محمد خاں کے سانحۂ شہادت کے بعد قدسیہ بیگم کو اپنے خیال میں صنف نازک سے متعلق ہونے کی وجہ سے کمزور سمجھ کر تختِ ریاست پر بٹھا دیا۔ لیکن جب وہ زیرک و دانشمند اور مدبر و منتظم ثابت ہوئیں تو اُن کو

تختِ ریاست سے اتار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل اس لیے کی جارہی ہے کہ فرنگی سامراج نے ریاستوں کے بارے میں جو ہتھکنڈے اختیار کیے تھے وہ سامنے آجائیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی یہ معاہداتی سیاست ہندوستانی ریاستوں کے لئے مکڑی کا ایک پرفریب جال تھا۔ جس کے اندر پھنس جانے کے بعد گلو خلاصی ورہائی مشکل تھی۔ اِن معاہدات کے اندر فرنگی سامراج نے اپنا پلّہ ہمیشہ بھاری رکھا۔ نواب بنانے کا اختیار، انگریزی فوج رکھنے پر اصرار جس کے مصارف ریاست ادا کرے۔ اور اپنی حیلہ سازی کے ماتحت جہاں ضرورت ہو مداخلت کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ اس لئے دیسی ریاستیں فرنگی سامراج کی کٹھ پتلیاں بن کر رہ گئیں۔ جو اُس کے چشم وآبرو کے اشارہ پر ناچتی رہتی تھیں۔ جہاں کوئی مدبّر فرمانبردار برسرِ اقتدار آجاتا تو اِس کو حکمتِ عملی سے معزول یا برطرف کر دیا جاتا۔ جیسے نوابؔ محمد علی خاں والئ ٹونک کو ریاست سے برطرف کر کے بنارس میں نظر بند کر دیا گیا۔ اسی طرح نواب نظر محمد خاں کے سانحہ شہادت پر قدسیہؔ بیگم کو اِس خیال سے فرمانروا تسلیم کر لیا گیا کہ وہ عورت ہونے کی وجہ سے نظم ونسق نہ چلا سکے گی اور انگریز ایجنٹ کی محتاج بن کر رہیں گی۔ لیکن جب ایسا نہ ہُوا تو ایجنٹ نے اُن کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ اِس لئے اُن پر یہ دباؤ ڈالا کہ وہ اپنی بیٹی سکندر جہاں بیگم کا عقد منیر محمدؔ خاں سے باوجود، دونوں کی کمسنی کے کر دیں اور یہ کہ عاقل بالغ ہونے کے بعد وہی مختارِ ریاست ہوں گے۔ لیکن منیر محمد خاں نے اپنا حق جمانا اور نظامِ ریاست میں ابتری پھیلانا شروع کر دیا۔ تو اُن کی منگنی کو مجبوراً منسوخ کرنا پڑا۔ پھر اُن کے چھوٹے بھائی جہانگیر محمدؔ خاں سے ایک طرف سکندر جہاں بیگم کی نسبت طے کر دی اور نواب نظیر الدولہ خطاب بھی دے دیا اور دوسری طرف اُن کے غلط کار مشیروں اور پولٹیکل ایجنٹ بہادر کی تائید نے اُن کو بھی مخالفت پر لا کھڑا کر دیا۔ اور خانہ جنگی شروع کرا کر گورنر جنرل سے پولٹیکل ایجنٹ کے ذریعہ مداخلت کر کے بیگم صاحبہ کو تخت سے اُتار دیا۔ اور ایک ناتجربہ کار ونوعمر نوجوان کو نواب بنا دیا۔ اور سکندر جہاں بیگم کو بھی اُن کے ماتحت

کر دیا گیا جس کو مجبوراً قبول کرنا پڑا۔ لیکن گورنمنٹ کی شہ پر انہوں نے اپنی بیوی کو ختم کرنے کے لیے وار کیا جو اوچھا پڑا اور ماں بیٹا دونوں اسلام نگر جانے پر مجبور ہوئیں۔

نواب جہانگیر محمد خاں بذات خود ایک شریف، علم دوست اور شاعر انسان تھے۔ لیکن گورنمنٹ کی غلط پالیسی کے آلہ کار بن گئے۔ اُن کی عمر نے وفا نہ کی اور جواں عمری میں گذر گئے۔ اس لیے سکندر جہاں بیگم کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء میں اُن کی دلی ہمدردیاں باغیوں کے ساتھ تھیں۔ جس کے لئے قاضی شریف حسین کو دہلی روانہ کیا گیا تھا۔ لیکن جب ہندوستان کا پانسہ پلٹتا ہوا دیکھا تو پھر اپنی حکمتِ عملی سے ریاست کو اِن شعلوں سے بچالیا۔ اور تاج برطانیہ سے یہ معاہدہ لکھوالیا کہ اُن کے بعد اُن کی لڑکی شاہجہاں بیگم ہی رئیسہ ہوں گی۔ جیسا کہ پہلے گذر چکا کہ اُن کو پہلا نکاح امراؤ دولہا سے ۱۸۰۰ء سے ہوا۔ لیکن جب اُن کا انتقال ۱۳۸۴ھ / ۱۸۶۷ء ہو گیا تو نواب صدیق حسن صاحب کے ساتھ عقد ثانی ۱۳۸۸ھ / ۱۹۰۱ء میں ہوا۔

"نواب صدیق الحسن کے خاندانی و تعلیمی حالات"

نواب صدیق الحسن بخارا کے سادات سے تھے۔ اُن کے آباؤ اجداد سید جلال اعظم سرخ بخارا سے آکر بابا فریدالدین شکر گنج کی خانقاہ ملتان میں اترے اور حضرت زکریا ملتانی کے مرید ہوئے اُن کو شہر اوچھ خلیفہ بنا کر روانہ کیا گیا۔ جہاں ان سے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ پھیلا۔ اُن کے صاحبزادے سید احمد ہوئے جن کے بیٹے مخدوم سید جلال الدین بخاری رح صاحب جو جہاں بان گشت کے مشہور لقب سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ حضرت مخدوم رح کی اولاد میں سید جلال ثالث بہلول شاہ لودھی کے عہد میں دہلی آئے اور قنوج اُن کو جاگیر دے کر بھیجا۔ بعد میں جب آصفیہ حکومت کے دور میں شیعہ گردی کا زور ہوا تو اُن کے اخلاف بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ نواب صدیق الحسن کے دادا سید انور علی اُسی رنگ میں رہے۔ وہ قنوج سے حیدرآباد

پہونچکر گولکنڈا کے جاگیر دار ہوئے۔ اُن کے لڑکے سید اولاد حسن قنوج میں رہے۔ والد ماجد (نواب صدیق الحسن کے) سید آل اولاد حسن کو تحصیل علوم و فنون کا فطری ذوق تھا۔ اپنے وطن میں شیخ عبد الباسط سے ابتدائی تعلیم حاصل کر کے لکھنؤ شیخ حسن علی محدث لکھنوی (شاگرد شاہ عبد العزیز دہلوی رح) سے کسب علم کیا مزید تکمیل کے لیے دار الخلافہ دہلی پہونچکر شاہ رفیع الدین رح دہلوی سے علم و تفسیر و حدیث فقہ کو حاصل کیا۔ اِن بزرگوں کے فیض صحبت نے اُن کے اندر جہاد حق اور ایسی ایمانی حرارت پیدا کی کہ اپنے آبائی مذہب شعیت سے تائب ہو گئے۔ اور اس قدر حق پسندی کا ثبوت دیا کہ اپنے خاندان والوں سے قطع تعلق کر لیا۔ حیدر آباد کی جاگیر اور مال و دولت سنہری زنجیروں کو ٹھکرا دیا۔ ملت اسلامیہ کی زبوں حالی اور مسلم اقتدار کی پامالی کے احساس نے اُن کو قربانی و جہادِ ایمانی کے راستہ پر ڈالدیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ملک کے طول و عرض خصوصًا شمالی ہند میں سید احمد شہید، مولانا اسمٰعیل شہید کی تحریکِ جہاد کا چرچا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ یہ تحریک جہاد بارہویں ۱۱۰۰ھ صدی ہجری (اٹھارویں صدی عیسوی) میں نبوت و خلافت کے خطوط پر اُٹھائی گئی تھی۔ جو انسانی نظام حیات کی معراج ہے۔ اس جہاد کا اصل نشانہ فرنگی سامراج تھا لیکن فی الوقت اس کے لیے اندرون ملک فضا ساز گار نہ تھی اس لیے ہجرت کے اصول پر وطن کو خیر باد کہہ کر اس کا مرکز آزاد سرحد کا علاقہ بنایا گیا۔ فرنگی سامراج کے خلاف یہ ایسی عجیب و غریب غیر معمولی تحریک تھی جو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلی ہوئی تھی اور نہایت رازداری کے ساتھ منظم طریقہ پر افراد و رسد کے پہنچنے کا سلسلہ قائم تھا جو تحریک کاروں کے خلوص نیت اور غیر معمولی جانفشانی و قربانی کا مظہر تھا۔ یہ تحریک اگرچہ کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکی اور سانحہ بالاکوٹ میں ایک مرحلہ تک سرد پڑ گئی پورے ہندوستان میں فرنگی سامراج کے خلاف بغاوت کی آگ کو پھیلا دیا جو ۱۸۵۷ء میں دھیرے دھیرے سلگ اٹھی اور پورے ملک کو حیرت انگیز طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بہر حال حضرت مولانا سید اولاد حسین رح سید شہید رح کے معرکہ جہاد میں ہم رکاب رہے۔ وہ اس معرکہ

جہاد کے ایک عظیم مجاہد اور سید احمد شہید کے زبردست شیدائی اور فدائی تھے۔ معرکہ بالاکوٹ شہادت پر ختم ہو جانے کے بعد سید احمد شہید کے مرید و مخلص اس تحریک جہاد کو فریضۂ ہدایت و ارشاد کی شکل میں بدلنے کے لیے ملک کے ہر گوشہ میں بھیج دیے گئے۔ جیسے مولانا کرامت علی، مولانا سخاوت علی بنگال میں، اور مولانا ولایت علی و صادق علی صادق پور بہار میں اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ یو۔پی کے لیے جن بزرگوں کو اس عظیم فریضہ کے لیے منتخب کیا تھا اِن میں سرِ فہرست نام انہیں مولانا اولاد حسن قنوجی کا ہے۔ وہ تحریک جہاد کے اہم رکن سید شہید کے مرید خلیفہ شیخ الاسلام مولانا عبدالحی، مولانا اسماعیل شہید کے رفیق خاص تھے۔ اُن کی پوری زندگی مجاہدانہ اور درویشانہ تھی بتیس سال تک قنوج میں دعوت حق کا فرض انجام دیا۔ تعمیل شریعت اور اتباع سنّت جو سید شہید کے مریدوں کا خصوصی شیوہ تھا اس کے اندر یہ ممتاز تھے۔ سید اولاد حسن ایک متبع شریعت اور صاحبِ عزیمت بزرگ تھے۔ اس لیے نواب صدیق الحسن کے قلب و دماغ پر جو کچھ ابتدائی تعلیم کے نقوش ثبت تھے وہ اسی بزرگوار ہستی کے تھے۔ جس کے قلب پاک میں خدا کی محبت کے ساتھ فرنگی سامراج کی طرف سے بغض و نفرت اور عداوت کی آگ شعلہ زن تھی جس کی چنگاریاں اس بزرگوار باپ کی طرف سے سعادت مند بیٹے کی طرف یقیناً منتقل ہوئی ہوں گی۔

نواب صدیق الحسن ولادت اور تعلیمی زندگی

نواب صدیق الحسن کی ولادت ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء میں قنوج میں ہوئی تھی۔ یورپ کے قصبات علماء و شرفا کے گہوارہ تھے۔ جہاں صدیوں سے علوم و فنون کی شمعیں روشن تھیں۔ چھ برس کی عمر میں داغ یتیمی لگ گیا۔ تعلیم کے لیے باہر جانا پڑا اُن کی والدہ مفتی محمد عوض کی بیٹی تھیں۔ نواب صاحب نے اپنے بھائی سید احمد حسن عرشی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پھر کانپور میں (جو علماء کا مرکز تھا) تکمیل علوم کی۔ مولانا سخاوت علی جونپوری، مولانا ولایت علی، مولانا خرم علی بلہوری، مولانا محمد علی (خلفاء سید احمد ح

وغیرہ کے مواعظ سے آتش ایمانی حرارت قلب میں پیدا ہوئی۔ وہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ ان میں اکثر وہ بزرگ تھے جنھوں نے شاہانِ دہلی (سراج الہند شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادرؒ کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی حکمت ولی اللہ کے شارح اور شاہ ولی اللہؒ کے جہاد کے عملی پروگرام کے سچے قائد تھے۔ جن کی دوربین نگاہوں نے فرنگی سامراج کی ملک میں بڑھتی ہوئی عیّاری ومکّاری اور فرعونی سیاست کو بھانپ کر ۱۸۰۳ء میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا سب سے پہلے فتویٰ دیا تھا۔ اور فتویٰ کا تکمیل کے لیے مجاہدین کی جماعت حضرت سید احمد شہیدؒ کی سرکردگی میں تیار ہوئیں اور اس تحریک کا پہلا مرحلہ بالاکوٹ پر پہونچکر پورا ہوا۔ لیکن جو چنگاریاں بچپن میں نواب صاحب کے دل میں سے اپنے والد ماجد کے سینہ سے منتقل ہوئیں اور کانپور کے علماء کی گرمیٔ صحبت سے شعلہ بن گئیں۔ اُن کے شعلہ جوّالہ بنانے میں دہلی کے دوسالہ قیام کو بڑا دخل ہے۔ جو اُجڑ جانے کے بعد بھی اس وقت علماء وفضلاء سے آباد تھی۔ بقول اُن کے جب وہ ۱۲۶۹ھ میں کانپور سے دہلی آئے تو صدرالافاضل مفتی صدرالدّین دہلوی نے اُن کو مہمان بنایا اور نواب مصطفےٰ شیفتہ کے یہاں ٹھہرایا۔

اس وقت مولوی مخصوص اللہ (خلف شاہ شاہ رفیع الدینؒ) مولوی محبوب علی مشہور مجاہد شیخ نصرالدّین، نواب قطب الدین، شاہ ابوسعید مجددی، شاہ عبدالغنی مہاجر مدنی وغیرہ کے نفوس قدسیہ سے یہ شہر پُرنور و معمور تھا۔ مفتی صدرالدین جیسے عالم وفاضل نے اس جوہرِ قابل کو اپنی خصوصی تعلیم وتربیت سے چمکایا۔ اور مذکورہ بالا بزرگوں کے فیض صحبت نے جذبہ جہاد کو روشن کیا۔ خود مفتی صاحب بھی ۱۸۵۷ء کے جہاد کا فتویٰ دینے والوں میں سے تھے نواب صاحب نے سلطنت مغلیہ کی آخری بہار کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کیا تھا۔ اور فرنگی سامراج کے ظلم وستم کے ہاتھوں کو اس چمن کی تاراجی میں بڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ انہوں

نے فرنگیوں کی مغل دربار میں ریشہ دوانیوں کا قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ بادشاہِ سلطنت اور مغل شاہزادوں کی حصول اقتدار کے لیے باہمی کشمکشوں رنگ رلیوں اور نظامِ سلطنت سے غفلت انگیزیوں نقشہ اُن کی نگاہوں میں تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانیوں کے پاؤں کے نیچے سے زمین کس طرح کھسکتی جارہی ہے۔ اور سرزمین ہند کا وسیع و عریض اور طویل رقبہ سات سمندر پار کے اس اجنبی قوم کے ہاتھوں میں پہونچ رہا تھا۔ جن کو مغل شہنشاہوں نے اپنا مہمان بناکر خاطر تواضع کی تھی میزبان کی کمزوری سے چالاک مہمان ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے اندر ہی اندر سرگرم تھے۔ مرکز کی کمزوری سے جو خود مختار حکومتیں قائم ہو رہی تھیں۔ اُن کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر کمپنی بہادر کی غاصبانہ پالیسی ہر محبّ وطن ہندوستانی کی نگاہ میں کانٹا بن کر کھٹک رہی تھی۔ عہد گذشتہ کی تاریخ، دورِ رفتہ کے واقعات اور انگریزوں کی مکروہ سیاسی چالیں ایک نو آموز اور نووارد طالب علم کی نظر میں سرمۂ بصیرت بن کر مستقبل کی بربادی کا نقشہ کھینچ رہی تھیں۔ ریاست روہیل کھنڈ جیسی نوعمر جمہوری ریاست اور نواب نجیب الدولہ کے بیٹے نواب صابطہ خاں کے دور میں تباہی کا منظر نگاہوں میں تازہ تھا۔ نواب صاحب کے حسّاس قلب میں جو ایک مجاہد باپ کے مجاہد فرزند تھے رہ رہ کر شعلے بھڑکتے تھے۔ یعنی عوام و خواص کی نا طاقتی و بے شعوری کو دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتے۔ جیسا کہ ابھی گذرا پھر جس آنکھوں نے مغل شہنشاہیت کا آخری جاہ و جلال و شوکت و اقبال کا نظارہ کیا تھا اس حکومت کی تباہی و بربادی اور اس پر بہارِ چمن کی تاراجی، فرنگی سامراج کی درندگی و سفاکی کو نگاہِ عبرت سے دیکھنا پڑا۔ حالات زمانہ کی بوقلمونی اور احوالِ زندگی کی گوناگونی کے مشاہدے نے اُن کی اسلامی غیرت و حمیت اور خوددار فطرت میں جوش و اشتعال کی آگ کو خوب بھڑکایا۔ اور مستقبل کے لیے لائحہ عمل بنانے کی دعوت دی۔

عملی زندگی کا آغاز

اپنی تعلیمی دور کے اختتام ۱۲۷۷ھ میں یہ اکیس سالہ نوجوان جب دہلی سے اپنے وطن قنوج پہونچا تو اس کو معاشی نقطۂ نظر سے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ چونکہ پورے خاندان کی کفالت کا بوجھ تن تنہا اُن کے کندھے پر آپڑا تھا۔ لیکن وطن میں معاش کے سارے دروازے بند اور معشیت کی راہیں تنگ تھیں۔ چار و ناچار وطن کو چھوڑ کر ہجرت کی راہ پر قدم رکھنا پڑا۔ دارالاقبال بھوپال اس وقت بیرونی شرفا اور علماء و فضلا کی پذیرائی کے لیے اپنی آغوش کھولے ہوا تھا۔ اس کی سُن گُن ملتے پر رخت سفر باندھا اور پریشان حال خاندان کا ایک مسافر بھوپال پہونچکر سب سے پہلے مسجد ابراہیم پورہ میں فروکش ہوا۔ جو ہمیشہ سے دینی طبقہ کی پناہ گاہ رہی تھی۔ پھر برسوں موتی مسجد کے بالائی کمرہ میں ٹھہرے رہے۔ کچھ دن قیام کے بعد منشی جمال الدین مدارالمہام کے ذریعہ سے دربار میں رسائی ہوئی اور منشی گیری کی خدمت معمولی مشاہرہ پر سپرد ہوئی۔ دو سال تک وقت گذاری کی۔ لیکن جیساکہ والد مرحوم (جو نواب نور الحسن خلف نواب صدیق الحسن کے ہمنشیں تھے) فرمایا کہ اچانک سرکار انگریزی کی طرف سے وارنٹ گرفتاری اور حکم جاری ہوا۔ راتوں رات سرزمین بھوپال کو خیرباد کہکر وطن واپس ہونا پڑا۔ یقینی بات ہے کہ جب حکومت برطانیہ کی خفیہ پولیس نے اِن کا ریکارڈ فراہم کیا ہو گیا اُن کے والد بزرگوار کا تعلق تحریک جہاد کی شرکت روز روشن کی طرح ثابت ہوا تو ایسے باغی سرکار کی وفادار ریاست میں کیونکر گزر ہو سکتا تھا۔ مسئلہ قلیان کشی (حقہ) کا اختلاف تو ہمارے نزدیک ایک بہانہ ہے۔ جو نواب صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ پھر وطن پہونچکر تلاش معاش میں ۱۲۸۳ھ کانپور آئے۔

یہی وہ زمانہ تھا کہ پورا ملک کمپنی بہادر کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے بارودخانہ بنا ہوا تھا۔ ایک فتیلہ دکھانے کی دیر تھی۔ اس خطرناک ماحول کو دیکھ کر گھر بیٹھے رہے

۱۲۷۳ھ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے ملک وطول وعرض میں ایک آگ لگادی تھی، نواب فرخ آباد بھی دوسرے آزادی پسند محب وطن رئیسوں کی طرح اس کافر ظالم طاقت (فرنگی سامراج) کے خلاف میدان جہاد میں کود پڑے۔ پورا شہر مسمار کھیتاں برباد اور بڑے بڑے بہادر قتل کر دئیے گئے۔ اس لیے قنوج سے بھاگ کر بلگرام میں پناہ لی۔ خود نواب صاحب بھی باغیوں کی زد میں آگئے تھے۔ مگر خدا نے حفاظت کی۔

"بھوپال آمد"

اب دوبارہ معاش کے لیے بھوپال پہونچے۔ لیکن پہلے کی طرح نہ صرف ناکامی بلکہ شہر بدر کر دینے کا حکم سابقہ الزام کی وجہ سے صادر ہوا مجبوراً ٹونک کا رُخ کیا۔ اسی دوران مدار المہام صاحب مرحوم نے اُن کی طرف سے صلح وصفائی کر کے ریاست کی طرف سے مدعو کیا۔ بھوپال کا یہ داخلہ ۱۲۷۶ھ ۱۸۵۹ء میں اُن کے مستقبل کی ترقی کا سنگِ بنیاد بنا۔ اور تاریخ نگاری پر بمشاہرہ پچھتّر روپیہ تقرر ہوا۔ مدار المہام نے اُن کی لوح پیشانی سے مستقبل کی تابانی کے خط کو پڑھ لیا تھا۔ اور درحقیقت وہی نواب صاحب کی داخلہ کی رکاوٹوں کے دور کرنے کا سبب بنے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی بیوہ بیٹی (آصفیہ بیگم) کا نکاح ثانی نواب صاحب سے کر کے مردہ سنت کو زندہ کیا بلکہ خوش آئند مستقبل کی بنیاد رکھدی۔ مدار المہام کا یہ رشتہ ہی بام ترقی پر چڑھنے کا نواب صاحب کے لیے زینہ بن گیا۔

"سفر حجاز"

نواب صاحب مرحوم کو سفر حجاز کا بیحد شوق دل میں موجزن تھا۔ اس کے لیے سکندر جہاں بیگم کی خدمت میں استدعا کی لیکن اُن کے سانحہ ارتحال ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء میں پیش آجانے کی صورت میں یہ تمنا پوری نہ ہوسکی۔ جب شاہجہاں بیگم نے تخت نشیں ہوئیں تو اُن کی درخواست منظوری ہوئی۔ بادبانی جہاز فتح سلطان سے روانہ ہوکر بندرگاہ

حدیدہ پر اترے۔ یہیں سب سے پہلے قاضی شیخ حسین عیسٰی، شیخ علی عبداللہ منشی شارح بخاری وغیرہ علماء کے فیض صحبت سے اور شیخ عبدالوہاب نجدی کی تحریک سے روشناس ہوئے۔ جب جدّہ کے لیے روانہ ہوئے تو راستہ میں جہاز ایک پہاڑ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ بہت سے لوگوں نے شیخ عبدالقادرؒ کی دہائی دینا شروع کی دل پر چوٹ لگی۔ لکھتے ہیں کہ میں نے اپنے دل میں کہا یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ ایسے شدید مصیبت کے وقت تو مشرک بھی خدائے وحدہٗ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لیکن معاً خیال میں آیا کہ سچ ہے وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ الخ بہر حال زیارت حرمین شریف میں نے مشرف ہو کر اور وہابی تحریک کا ایک ہلکا سا نقش لے کر بھوپال ۱۲۸۶ھ میں مراجعت فرما ہوئے۔

"دورِ ارتقاء"

یہ مبارک سفر اُن کے لیے ترقیات کا دروازہ ثابت ہوا۔ چونکہ تاریخ نگاری شعبہ سے منتقل کر کے اُن کو تعلیمات کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ مدارس سلیمانیہ کا اہتمام اُن کے سپرد ہوا۔ نواب صاحب کی عبقریت اور ان کی غیر معمولی صلاحیت و قابلیت کے دوست و دشمن دونوں قائل ہیں۔ جب وہ ریاست کے ڈائرکٹر تعلیمات (منتظم مدارس سلیمانیہ) ہوتے تو اُن کو والیۂ ریاست نواب شاہجہاں بیگم سے قربت کا موقع حاصل ہوا۔ نواب صاحب معنوی کمالات کے ساتھ صوری و ظاہری محاسن سے بھی آراستہ و پیراستہ تھے۔ وہ ایک خوبرو طرح دار نوجوان اور عالم و فاضل انسان تھے اپنی غیر معمولی صلاحیت کا سکہ تو پہلے ہی والیۂ کے دل پر بٹھا چکے تھے۔ اب محاسن ظاہری سے بھی اُن کے دل کو موہ لیا۔ اس سلسلہ میں جو جتن کرنے اور جس جس طرح ڈورے ڈالنے پڑے اُن کی ایک فضول داستان ہے جو درخور تحریر نہیں۔ بہر حال ان کی صوری و معنوی خوبیوں پر والیۂ ریاست فریفتہ و شیفتہ ہو گئیں جس کے نتیجہ میں چند دنوں میں میر دبیری کے اہم عہدہ اور امیر الانشائی کے غیر معمولی منصب پر

۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء میں فائز ہوئے اور پھر گورنمنٹ کی تحریر منظوری پر اُن کا عقد والیہ کے ساتھ ہوا۔ اور امیر الملک والاجاہ کا خطاب ملا (تاج الاقبال صفحہ ۲۷) پھر زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ نواب صاحب نے بیگم صاحبہ کے دل و دماغ پر ایسا قبضہ کیا کہ اندرونی طور پر نظام ریاست کی باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں آگئی۔

"تحریک جہاد کا منصوبہ"

اب اُن کی ذہنی منصوبہ کے مطابق انگریزوں کے خلاف تحریک جہاد برپا کرنے کی صورت میں پیدا ہوتی دکھائی دی۔ ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء کو دربار عام میں گورنمنٹ برطانیہ نے اُن کے اعزازات کو تسلیم کر لیا۔ نواب سلطان جہاں بیگم نے لکھا ہے کہ نواب صاحب سفر کلکتہ میں پوری کوشش کی کہ وہ مختار ریاست تسلیم کئے جائیں اور اختیارات حکمرانی اُن کے ہاتھ میں آئیں۔ اس نے مدعا کو حاصل کرنے کے لیے سرکار کے پردہ نشیں ہونے کو قرار دیا مگر کامیابی نہ ہوئی (تزک سلطانی [۱۲۱]) خود بقول نواب صاحب کے ایک مرتبہ والیہ ریاست نے حین حیات مختار ریاست بنانے کی تحریک حکومت انگلشیہ سے کی (ابقاء المنن صفحہ ۱۱۲) اب بقول سرکار عالیہ روز بروز اُن کا قدم عروج و ترقی کی طرف بڑھتا گیا۔ اپنے حسن تدبیر سے ابتداً پرانے کارکنان ریاست کی گرفت کو (جن کے پنجہ میں عنان حکومت تھی) ڈھیلا کرنا شروع کیا رفتہ رفتہ ایسا دباؤ ڈالا اور سکہ جمایا کہ سب کو نیچا دکھا دیا اہل کاران قدیم کو الّا ماشاء اللہ باقی نہ رہنے دیا (الکہ بھوپال صفحہ ۲)

"اِنقلابی اقدامات"

اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ نواب صاحب جس خفیہ تحریک جہاد کو جاری رکھنے کا منصوبہ بنا کر آگے بڑھ رہے تھے اس کے لیے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو نواب صاحب کے ہم خیال (ہم مشرب) اور اس راہ قربانی میں ہر طرح مخلص و وفادار

اور جاں نثار ہوں۔ اس لیے تحریک جہاد کے خیالی خاکہ کو عملی جامہ بھرنے کے لئے دو امر کی ضرورت تھی۔

(۱) ایک طرف پرانے وفاداران ریاست کو کلیدی عہدوں سے باہر نکالنا۔

(۲) اور دوسری طرف اِن محرم راز افراد کو اُن جگہوں پر لاکر بٹھانا جو اس تحریک کے مخلص و وفادار اور ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہوں۔

اس راستہ میں سب سے بڑا پتھر برطانوی حکومت کا جاسوسی فولادی نظام تھا۔ جو ملک کے گوشہ گوشہ میں تار برقی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اس سے نبرد آزما ہونے اور اس تحریک کو اُن دسترس سے بچانے کے لئے جس ہوشیاری و بیداری کی ضرورت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ مشہور ہے کہ ۵۷ء کے بعد دیو بند کے ایک بزرگ نماز تہجد کے اندھیرے میں جب انگریزوں کے خلاف دعا مانگتے تو پہلے بالاخانہ سے گلی اور ہر طرف خوب دیکھ لیتے کہ کوئی سی آئی ڈی تو نہیں ہے۔ تب وہ ہاتھ اٹھاتے اور بد دعا کرتے۔ ۵۷ء میں انگریزوں کی سفاکی و درندگی و وحشتناک مظالم نے ایسے خوف و دہشت کا نقشہ ہندوستانیوں کے دلوں میں بیٹھا تھا کہ اُن کی مخالفت کا ادنیٰ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ارادہ بغاوت کی تو ہلکی سی پرچھائیں بھی کسی کے صفحہ خیال میں نہ ابھر سکتی تھی۔ مگر اس سرزمین ہند کے آغوش میں پلنے والے ابھی ایسے دلاور بہادر اور جری بلند حوصلہ فرزند موجود تھے جو انگریزی اقتدار کی جبر و قہر یانی ظلم و ستم رانی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور اعلان کلمۃ الحق سے ذرہ برابر نہ چوکتے تھے۔ یہ وہی ولی اللہ علمی خاندان کے بقیۃ السلف مجاہدین تھے۔ جنھوں نے معرکہ بالاکوٹ میں سرحد کی زمین کو اپنے خونِ شہادت سے لالہ زار بنایا تھا۔ اور ابھی تازہ تازہ ۵۷ء کے خونیں دریا کو پیر کر کے نکلے اور بکمال سرخ روئی میدان جہاد کے لیے تیار تھے۔ اور جنھوں نے فرنگی سامراج کے ظلم و ستم کے آگے اپنی گردن کہیں نہ جھکائی تھی۔ اور برٹش گورنمنٹ کی فرعونیت کی گردن کو خم کرنے کا عزم محکم اپنے سینوں میں رکھتے تھے یہ تھے ولی اللہ تحریک کے اخلاف، دیوبند کے اکابر حضرت الانام مولینا محمد قاسم نانوتوی

اور قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی اور خود نواب صدیق الحسن بھی انھیں اسلاف کی یادگار تھے - اس لیے نواب صاحب نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے لئے مولانا محمد قاسم نانوتوی رح کو بھوپال تشریف آوری کی دعوت دی جیساکہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رح نے ایک محفل ارشاد فرمایا کہ ریاست بھوپال میں نواب صدیق حسن صاحب خاں نے ایک بڑے مدرسہ کی بنیاد ڈالی تھی - اور چاہا تھا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رح کو اس کا مہتمم اور مولانا محمد یعقوب صاحب رح کو صدر مدرس بنا دیں - مولانا نانوتوی رح کی تنخواہ تین سو ۳۰۰ روپیہ اور مولانا محمد یعقوب صاحب رح کی ۲۰۰ روپیہ ماہوار تجویز ہو کر اُن سے درخواست کی گئی دونوں میں سے کسی کا ارادہ جانے کا نہ ہوا - مولانا قاسم نانوتوی رح نے یہ جواب لکھدیا کہ میں اس وقت مطبع مجتبائی میں تصحیح کی خدمت انجام دے رہا ہوں - جس پر مجھے دس روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے - جو میری ضرورت سے زیادہ ہے - پانچ روپیہ میں میرا مع اہل وعیال کے خرچ پورا ہو جاتا ہے - باقی پانچ کی فکر رہتی ہے کہ اسے کہاں خرچ کروں، خدا ان طالب علموں کا بھلا کرے یہ میری اپنی فکر کفالت کر لیتے ہیں - ان پر خرچ کر کے سبکدوش ہو جاتا ہوں - آپ نے تین سو روپیہ تنخواہ لکھی ہے - اگر میں اس کو قبول کروں تو دو سو ۲۹۵ پچانوے کی فکر میرے سر پر پڑے گی جو میرے لیے ناقابلِ تحمّل ہے - مولانا محمد یعقوب صاحب رح نے فرمایا کہ جو بات لکھنے کی تھی وہ آپ نے لکھدی اب میں کیا لکھوں - فرمایا کہ میں لکھتا ہوں کہ میں اس شرط پر آتا ہوں - کہ تین سو تنخواہ ماہانہ ہوگی اور کوئی پابندی مجھ پر عائد نہ ہوگی - جب چاہوں گا وطن آجایا کروں گا دونوں تحریریں جب پہونچی تو اُن سے وہی سمجھا گیا جو لکھنے والے کا مقصود تھا -
(محاسن حکیم الامت صفحہ ۳۳)

ایسے پر آشوب خطرناک دور میں برطانوی سامراج کے خلاف لب کشائی ایک کٹھن کام تھا - حکومت کے تختہ الٹنے کا ارادہ کا منصوبہ بنانا غیر معمولی الوالعزمی و بلند حوصلگی کی نشانی تھی -

نواب صاحب کی یہ خفیہ تحریک جہاد اُن کی جواں مردی، بلند ہمتی، اور غیر معمولی جرائت وہمت کی آئینہ دار تھی - چنانچہ ایک طرف اندرونِ ریاست انکی کارروائیاں نہایت مستعدی وسرگرمی سے انجام دی جارہی تھیں اور دوسری طرف بیرونی سرگرمیاں خفیہ جاری تھیں - اور تیسری طرف تصنیف وتالیف کی گرم بازاری اور ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو کر اپنی تحریک کو آگے بڑھانے میں شبانہ روز لگے ہوئے تھے - انکی پولٹیکل کارروائی سے حکام کا دم بند تھا۔ اسی زمانہ میں بقول نواب حسن علی صاحب خاں والاجاہ کی پبلک زندگی کا آغاز ہوا یہی وہ زمانہ ہے جس نے اُن کی عملی مذہبی اخلاقی وہ عملی طاقتوں کو منظر عام پر لا کر نمایاں کیا اور اُن کے متضاد اور جامع کارناموں سے ایک عالم کو روشناس کیا " آگے چل کر نواب صاحب لکھتے ہیں " سچ تو یہ ہے کہ ایک بڑے سے بڑے ذہن وفطین موصوف بہ صفت امانت اور ایک عالم باعمل اور علامہ عصر کا فضل وکمال اور ایک کاملِ فن ادیب کے بے نظیر انشاء پردازی اور ایک تقدس مآب ریاض عارف باللہ کی صداقت وحق پرستی اور ایک سپہ سالار اعظم کی جبارت وکارروائی اس وقت تک کبھی منظر عام پر نہیں آسکتی جب تک کہ اس کی طاقتوں کے سامنے میدان فراخ یادا دو اس کے عزائم کے آگے فضائے بسیط اور اس کی جدوجہد علمی وعملی کے مقابل ایک جولانگاہ عریض اور اس کے دست کرم کے لئے ایک عظیم الشان خزانہ موجود نہ ہو۔

اسباب کے فقدان اور وسائل کی نایابی سے کوئی بڑے سے بڑا انسان کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکتا - بقول علی حزیں ؎

پائے بستند ورہِ سعی نشانم دادند دست وبازو بشکستند وکمانم دادند

خوش قسمتی سے قدرت نے یہ تمام ذرائع والاجاہ کے لیے مہیّا کر دیئے - جس سے انھوں نے خود بھی فائدہ اٹھایا - اور ملک وملّت کو عظیم الشان منفعت پہچانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی - (مآثر صدیقی صفحہ ۹۶-۹۸) ان کی حکمت عملی اور کمال سیاست دانی کا یہ شاہکار ہے کہ اسی دوران میں وہ شاہجہان بیگم کے ساتھ سفر بمبئی وکلکتہ ودہلی

میں دربار شریک رہ کر برطانیہ کے اعلیٰ حکام کی نظروں میں خطابات سے سرفراز کئے گئے۔ اور جنگ روم و روس میں امداد نصرت کی بنا پر خلیفہ معظم ترکی کی طرف سے تمغہ مجیدی دوم ۱۲۵۵ھ اُن کو دیا گیا۔ جیسا کہ تزکِ سلطانی میں ہے" دلّی دربار میں نواب صاحب ممدوح کے لیے سترہ فیر سلامی کے لیے مقرر کئے گئے۔ جب برطانوی حکومت کے دل پر اپنی وفاداری کا سکہ" بٹھا دیا۔ اندرونِ ریاست اکھاڑ پچھاڑ کے عمل کو جاری کیا اور پارٹی بندی کے اصول پر اپنے گروہ کو ریاست کے اہم منصب پر فائز کرنا اور ان کو جملہ امور ملکی و انتظامی پر حاوی ہونا شروع کیا۔ محمد حسن، مہتمم پیشی تحقیقات کے ذریعہ سے سخت گیر احکام جاری کرا کر ریاست تہلکہ مچ گیا۔ سختی بند دلبست سے عام رعایا پریشان اور خانماں، ویران ایک خلقت سرگرداں و نالاں ہو گئی (الکہ بھوپال، صفحہ ۷) بھوپال کے قدیم شرفاء کے قدم اکھڑ گئے، پرانے ارباب عناصب کی مٹی خراب ہوتی نظر آنے لگی۔ جاسوسوں کا ایک وسیع جال بچھا دیا گیا۔ دفتر ایجنسی و ریزیڈنٹی زر خرید غلام بن کر رہ گیا۔ بقول سلطان جہاں بیگم انھوں نے کرد و پیش ایسے لوگوں کو جمع کیا تھا جو ان کے ہم خیال اور ان کی کارروائیوں کے معاون تھے۔ اور اس مداخلت کی وجہ سے تقریباً تمام بڑے بڑے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئے تھے جن کو ضرورت زمانہ کا احساس تھا اور نہ رعایا و ریاست سے ہمدردی تھی انگریزوں کے جبر و استبداد کے دور میں اُن کے خلاف کسی تحریک کا نام لب پر لانا ایک سنگین جرم تھا۔ (تزک سلطانی ص ۲۳۶) ہم نے اس لئے ہم نے نواب صاحب کے مخالف لوگوں کی تحریروں کے ذریعہ صورت حال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اس لیے کہ اس تحریک کا پس منظر سامنے آ جائے۔ اور اُن زخموں کی کھٹک کا احساس ہو سکے جو اب بھر چکے تھے۔ سلطان جہاں بیگم بھی جو بعد میں والیۂ بھوپال ہوئیں اُن کے تیرِ ستم کا ایک زخم خوردہ تھیں۔ نواب صاحب نے شروع میں ہی اس امر کی پوری پوری کوشش کی کہ اُن کا نکاح اپنے بیٹے علی حسن خاں صاحب کے ساتھ ہو جائے لیکن قدسیہ بیگم اور دیگر قدیم ارکانِ ریاست کی مخالفت کی

وجہ سے یہ بیل پروان نہ چڑھ سکی۔ جب اس کے اندر اُن کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا تو پھر نواب صاحب نے ماں اور بیٹی کے درمیان نفرت وعداوت کی ایسی خلیج حائل کردی کہ وہ اُن کی ماں شاہجہاں بیگم کے مرتے دم تک باقی رہی کہ بیٹی نہ ماں سے مل سکی اور نہ اُن کو ماں کے پاس حاضری کی اجازت مل سکی۔

تزک سلطانی میں سلطان جہاں بیگم نے اپنی ماں شاہجہاں بیگم سے بستر مرگ پر ملاقات کی کوشش کا جو دلدوز وجگر خراش نقشہ کھینچا ہے۔ اس کو پڑھ کر دل پگھل جاتا ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ نواب صاحب نے بیٹی کی طرف سے ماں پر وہ کون سا جادو کیا تھا، یا کون سا منتر پھونکا تھا کہ وہ آخر وقت اپنی اکلوتی لڑکی سے ملنے کی روادار نہیں ہوئیں۔ اس سے اندازہ لگایا جائے کہ جب ولیعہد سلطنت کے ساتھ بے دخلی کا معاملہ اس قدر سخت رہا تو پھر دوسرے قدیمی وفادارانِ ریاست کا کیا حشر ہوگا۔ نواب صاحب کے تیشۂ سیاست نے پرانے بھوپال کے باشندوں کو اس طرح صاف کردیا تھا کہ تیرا راقدہ بھی خاندان خانماں و برباد ہوکر یا تو گوشہ نشیں ہوکر بیٹھ گئے۔ یا دیہات وقصبات میں پناہ گزیں بن گئے تھے۔ ریاست کے ہر محکمہ، ہر شعبہ میں تخفیف کا کلہاڑا اس تیزی سے چلا گیا تھا کہ جنگل کا جنگل صاف ہوگیا۔ بقول سحر بھوپالی ؎

بے جرم کی گردن تہہ خنجر ہے نظر میں ۔ اب تک وہی ہنگامۂ محشر ہے نظر میں

یہ انقلابی اقدامات غالبًا اپنے منصوبہ کو عجلت پسندانہ طور پر بروئے کار لانے کے لئے نواب صاحب کو کرنے پڑے ہوں گے۔ لیکن افسوس کہ اسی عجلت پسندی اُن کے سارے منصوبہ پر پانی پھر گیا۔

"باغیانہ لٹریچر اور اس کی اشاعت"

تحریک جہاد کے لیے یہ کاروائیاں اندرون ریاست زمین ہموار کرنے کے لئے کی جارہی تھیں۔ لیکن برطانوی حکومت جس کے رقبہ سلطنت میں اس وقت

سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ اس کو اکھاڑ پھینکنا کوئی بچوں کا کھیل نہ تھا۔ اس لیے ضرورت تھی کہ پورے ملک میں اُس کے لیے فضا کو ساز گار بنایا جائے۔ خزانہ ریاست پر قابض ہونے کی بنا پر اُن کے لیے نشر و اشاعت کا وسیع میدان ہاتھ میں تھا۔ مطبع سکندری پہلے قائم تھا اب مطبع شاہجہانی اور مطبع صدیقی مزید قائم کر دیئے گئے تھے۔ دہلی و لکھنؤ کے ماہر بن کتابت کو جمع کرا لیا گیا۔ نواب صاحب اپنی زود نویسی و کثرت نگاری میں قدماء کی یادگار تھے۔ بقول انھوں نے نہایت ہوشیاری سے ہندوستان کے وسیع و عریض علاقوں میں مخفی طور پر جہاد کی تبلیغ شروع کر دی: اپنی کتاب ہدایۃ السائل مطبوعہ ۱۲۹۲ھ میں صفحہ ۹۰ تا ۱۰۳ پر ضرورت جہاد پر نہایت شد و مد سے ترغیب دی گئی۔

مجموعہ خطبہ میں انہوں نے حضرت شاہ اسماعیلؒ کا وہ خطبہ شامل کیا جس میں شاہ صاحبؒ نے انگریزوں کے خلاف عربی میں جہاد کی ترغیب دی ہے (الکہ بھوپال صفحہ ۴۲) اور بقول سلطان جہاں بیگم انہوں نے وقتاً فوقتاً متعدد کتابیں لکھیں جو مختلف مضامین پر تھیں۔ انہیں کتابوں میں مجموعہ خطب، ہدایۃ السائل، ترجمان وہابیہ، اقتراب الساعۃ وغیرہ بھی تھیں۔ جن میں مذہبی پیرایہ میں خلاف سیاستِ ملک مضامین تھے۔ اور یہ کہ انہوں نے اپنے گرد و پیش ایسے لوگوں کو جمع کیا تھا جو اُن کے ہم خیال اور اُن کی کارروائیوں کے معاون تھے۔ اور اسی مداخلت کی وجہ سے تقریباً تمام بڑے بڑے سرکاری عہدے ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئے تھے جن کو ضرورت زمانہ کا احساس تھا اور نہ رعایا سے ہمدردی (تزک سلطانی صفحہ ۲۳۶) نواب سلطان جہاں بیگم نے ڈھکے چھپے الفاظ میں جس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس سے زیادہ وہ اشارہ نہ کر سکتی تھیں انہوں نے نواب صاحب کی بے پناہ صلاحیت کو تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب صدیق الحسن خاں صاحب ایک ذی علم و ذہین شخص تھے" نواب صاحب کے صاحبزادے شمس العلماء نواب علی حسن خاں نے "سیرت والاجاہ" میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے۔ جس کے اندر نواب صاحب، حالات زمانہ کی حالت، تحریک جہاد کے داغ دھبوں کو دور کرنے کی پوری پوری

کوشش کی ہے۔ مگر وہ اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور رہوتے ہیں۔

"نواب والاجاہ اپنی جامعیت کے شوق اور وسعتِ معلومات کے لحاظ سے مسئلہ جہاد کے متعلق علامہ سید حسن بن جلال یمنی کے رسالہ ہا بیان اور سید عبداللہ بن سید عبدالباری کے رسالہ "سیف" کا ترجمہ مع دیگر اقوالِ مقتدمین یکجا کر دیا ہے۔ اور بعض مقامات پر اُن کو حوالہ بھی دیا ہے۔ (مآثر صدیقی ۔ صفحہ) نواب صاحب کے حریفوں کے جو اشادات جو ابھی نقل کیے گئے ہیں۔ اس حقیقت واقعہ کی نشان دہی کرتے ہیں کہ نواب صاحب نے انگریزوں کے خلاف جو باغیانہ لٹریچر ملک بھر میں پھیلایا تھا۔ اور پچھلے بزرگوں کی کتابوں کے بین السطور میں اپنے شرربار قلم سے جو شعلہ آفریں خیالات کو وسیع پیمانہ پر عام پر کیا تھا۔ اس کا عشر عشیر بھی گورنمنٹ تک نہ پہونچ سکا۔ کیونکہ آگے آ رہا ہے کہ بہت سی کتابوں کو جو ملک کے گوشہ گوشہ میں تقسیم کی گئی تھیں اُن کو تلف کرا دیا گیا تھا۔ جہاد حق کے لیے جو مستقل رسائل مطبوع ہو کر عوام تک پہونچا دئے گئے۔ اُن کا بہت سا حصہ حکومت برطانیہ کی دسترس سے باہر رہا۔ اگرچہ انگریزوں کی وحشیانہ دہشت گردی سے زیادہ تر لوگ سہمے اور ڈرے ہوتے تھے لیکن ہمارا ملک باطل کے خلاف کسی زمانہ میں جان پر کھیل جانے والوں منچلوں سے خالی نہیں رہا۔ جو ۱۸۵۷ء کی شکست خوردگی پر جھنجھلائے ہوتے بیٹھے اور اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

نواب صاحب کے خلاف گورنمنٹ کی وارننگ

نواب صاحب کا یہ باغیانہ لٹریچر برٹش گورنمنٹ کے نوٹس میں آیا اور محکمہ خفیہ کی رپورٹ نواب صاحب کے خلاف حکام بالا تک پہونچی۔ چونکہ ان کتابوں کی اشاعت کا دور وہ زمانہ تھا۔ جبکہ حکومت برطانیہ اپنی افواج قاہرہ کے ساتھ مہدی سوڈانی کے مقابلہ میں سرگرم پیکار تھی افریقہ کے میدانوں میں سوڈانی مجاہدوں نے برطانیہ کا ناک دم کر رکھا تھا اور اُن کی فوجوں کے دانت کھٹے کر دئے تھے۔ اس لئے اس کو سب سے زیادہ اگر کہیں خطرہ تھا تو وہ مسلمان قوم سے تھا۔ بغاوت کی ذرا سی بُو بھی

اُس کے لیے پریشان کن تھی ۔ پھر اس کا بھی قوی امکان ہے کہ نواب صاحب کے مخالفوں نے گورنمنٹ کے کان بھرے ہوں ۔ ایشیائی اقوام کی خانہ جنگی ، اور برادر کشی سے ہی مغربی اقوام کے لیے اقتدار پرستی کی راہیں کھولیں ۔ بہر حال سب سے پہلے کتاب مجموعۂ خطب کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا ۔ جس کے اندر حضرت شیخ شہیدؒ کے انگریزوں کے خلاف خطبہ کا ترجمہ پیش کیا گیا جو پورے ملک میں مفت تقسیم کیا گیا تھا پھر دوسری کتابیں جن کے اندر مسئلہ جہاد پر نواب صاحب نے اپنے دلی جذبات کو ظاہر کیا تھا ۔ اور جو باطل کے خلاف جہاد نہ کرے یا جہاد کی نیت نہ رکھے منافقین میں شمار کئے جانے کو بتایا تھا ۔ غرض چھوٹے بڑے جو رسالے ہاتھ لگ سکے ان کو گورنمنٹ کے ملاحظہ میں گذارا ۔ گورنمنٹ کے محکمۂ خارجہ نے اِن کتابوں کو سرلیپل گریفن ایجنٹ گورنر جنرل کے پاس ملاحظہ کے لیے بھیجدیا ۔ سر لیپل گریفن نے کرنل میتری کے ذریعہ نواب صاحب کو اِس قسم کی تالیف و تصنیف پر وارننگ دی اور احتیاط رکھنے کی ہدایت صادر کی ۔ اب نواب صاحب نے ان مضامین کو مستقلاً رسائل کی شکل میں چھاپنے کے بجائے اسی دوسری تصانیف میں ان مباحث کو چھیڑا ۔ جو شخص کسی نشہ و شوق میں سرشار ہوتا ہے اس کا نشہ اس قسم کی ترشی سے کیوں کر اتر سکتا ہے ؟ یہ امر مسلم ہے کہ انسان کے خصائل و عادات کا بڑا حصہ موروثی ہوتا ہے ۔ اُس کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کا قالب نسلی و خاندانی روایات سے تشکیل پاتا ہے ۔ اور اس کی شخصیت کی تکمیل میں خاندانی ، وارثتی خصوصیات کا زبردست دخل ہوتا ہے ۔ ان کی کتاب (ہدایت المومنین) وہ پہلی کتاب ہے ۔ جس پر سب سے پہلے گورنمنٹ نے نوٹس لیا تھا ۔ پھر دوسری کتابیں اس کے ملاحظہ میں لائی گئیں ۔ جس پر اُن کو تنبیہ کی گئی ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُن کے دل و دماغ پر انگریزی حکومت کے خلاف باغیانہ جذبات جلوہ فرما تھے ۔ جس ملّت کی محبت جس وطن کی حمیّت اور جس جذبہ حریّت سے سرشار تھے اس قسم کی دھمکیوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے ۔ اس لیے جنرل ڈیلی ایجنٹ گورنر جنرل کو (جن کے نام سے اندور کا ڈیلی کالج تھا) اور جو نواب زادوں اور راجکماروں کو برطانوی

وفاداری کے رنگ میں قائم کیا گیا، تحقیقات کا حکم دیا گیا۔ لیکن نواب صاحب کے کارندوں کے آگے اُن کی ایک نہ چلی اور وہ فردِ جرم لگانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ ریزیڈنسی کے اہلکار افسر نواب صاحب مٹھی میں تھے۔ مگر حکومت برطانیہ چونکہ مسلمانوں کو نمبر ایک کا مخالف و دشمن اپنی اندرونی پالیسی میں قرار دے چکی تھی اور ان کی طرف خوف زدہ تھی۔ اس لیے محکمۂ خفیہ برابر نواب صاحب کے خلاف اندر ہی اندر متحرک رہا۔ یہاں تک ۱۸۸۴ء میں سر لیپل گریفن جب افغانستان کی تحریک آزادی کو کچل کر اور کابل کے سارے معاملات کو بزعم خود طے کر کے اندور ایجنٹ ہو کر آیا تو اس نے نواب صاحب کی تحریک کے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور نہایت سرگرمی سے تحقیقات کا جال بچھا دیا۔ ہر طرف بھوپال و بیرون بھوپال اُس کے کارپرداز خفیہ لٹریچر فراہم کرنے اور نواب صاحب کے حریفوں سے راز حاصل کرنے میں پھیل گئے۔ لیکن جس طرح مستعدی سے گورنمنٹ کے محکمہ نے اپنا کام شروع کیا تو نواب صاحب کا خفیہ عملہ بھی اُس کے تعاقب میں ہر جگہ لگ گیا۔ اور نہایت ہوشیاری سے اُس کے مدافعت میں مصروف ہو گیا۔ چنانچہ باغیانہ لٹریچر سے لبریز کتابوں کے جو نسخے ہندوستان میں تقسیم کئے گئے وہ نہایت سرعت سے تلف کرا دئے گئے۔ وہ کاغذات جو گورنمنٹ برطانیہ کے وزارت ہند کے ملاحظہ کے لیے انگلستان بھیجے جاتے رہے وہ شملہ کے دفتر گورنمنٹ سے اڑا دیئے گئے۔ الکہ بھوپال (صفحے) نواب صاحب کے کمال سیاست وانی، بیدار مغزی و ہوشیاری کا حیرت انگیز کارنامہ وہ ہے جو والد صاحب مرحوم (سید صابر علی) نے راقم السطور کو بچپن میں سنایا تھا کہ نواب صاحب کی جاسوسی نظام کا حیرت ناک کرشمہ یہ تھا کہ نواب صاحب کے خلاف (جو مثل ان پر فرد بغاوت عائد کرنے مواد پر مشتمل تھی) پوری رازداری و احتیاط پسندی کے ساتھ بحفاظت تمام لندن بھیجی جا رہی تھی اور جہاز میں رکھی بھی جا چکی تھی۔ جہاز کے روانہ ہونے سے پہلے ساحل ہند پر ہی نذر آتش کر دی گئی۔ اور گورنمنٹ کو چراغ پا ہونا اور کف افسوس ملنا پڑا۔ کہاں ایک چھوٹی سی ریاست کا معمولی حکمراں اور کہاں سلطنت برطانیہ اپنے سارے جاہ و حشم اور طاقت و دولت کے ساتھ ان دونوں

کا مقابلہ چیونٹی اور ہاتھی کا معاملہ تھا۔ مگر جیسا مشہور ہے کہ جب خدا چاہتا ہے تو ہاتھی کو
چیونٹی سے ختم کرا دیتا ہے۔ معمولی چڑیاں ہاتھی کو ہلاک کر دیتی ہے۔ مگر ابھی ہندوستان
کی بدقسمتی و بدبختی کے دن باقی تھے۔ اس لیے نواب صاحب کی ان تمام کوششوں کا تیر
بھی نشانہ پر نہ بیٹھ سکا۔ بہر حال تحریک کے ان خطرناک مرحلوں میں انہوں نے جس
ہوشمندی و دانشمندی کا ثبوت دیا اس سے نواب صاحب کی غیر معمولی ذہانت و لیری
کا ثبوت ملتا ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے اندر ان کی وفادار اہلیہ نواب
شاہجہاں بیگم کی امداد و پشت پناہی کا بڑا دخل ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ان پر خطر و
دشوار گذار مراحل سے گذر گئے۔ انہوں نے نواب صاحب کی امداد و تعاون میں کوئی
کسر اٹھا نہ رکھی۔ اور خود اپنے لیئے اُن کی وفاداری میں ہر خطرہ کو مول لیا۔ یہ واقعہ پچھلی
نسلوں کے زبان زد خاص و عام تھا کہ "تاج محل بھوپال کا انگریزی فوجوں کا محاصرہ"
جب سر لیپل گریفن کی فہمائش اور انتباہ سے بھی نواب صاحب کے رویہ میں فرق نہیں
آیا تو حسب اشارہ حکومت اس نے نرمی کی بجائے گرمی اختیار کی اور ایک سخت اقدام
اُٹھایا۔ سیہور چھاؤنی سے (جو انگریزی افواج کا ٹھکانا تھا) ایک رجمنٹ ہر قسم کی
سے مسلح راتوں رات روانہ ہوئی رات ہی تاج محل کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا اور
بیگم صاحبہ کو نواب صاحب کو انگریزوں کی حراست میں دینے کا مطالبہ کیا۔ نواب
شاہجہاں بیگم نے کمانڈر افواج کو باریاب کر کے اور صورت حال کو معلوم کر کے پردہ
کے اندر سے اپنی جوتی پھینک کر فرمایا اس کا یہ جواب ہے۔ اور کہا اگر میں نے اپنی رعایا
کو اشارہ کر دیا تو تم میں سے کسی کی ایک بوٹی بھی نہ ملے گی۔ بعد میں جو کچھ ہوگا میں دیکھ
لوں گی۔ یہ میرے ناموس کا معاملہ ہے۔ اُن کے اس سخت گیر رویہ سے کمانڈر حواس
ٹھکانے ہو گئے اور منہ کی کھانی پڑی۔ فی الحال معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ چنانچہ نواب
صاحب کو ... بیگم صاحبہ کی موجودگی میں اس کے نتائج بد سے آگاہ کیا گیا۔ اور آہنی
کاروائیاں سرگرمی سے عمل میں لائی گئیں۔ چنانچہ چند ہفتہ گذرتے پر سر لیپل گریفن
نے اس کاروائی کا اسطرح انتقام لیا کہ ایک خصوصی دربار منعقد کیا اور ۲۴ ذیقعدہ

۳۰۲ا ھ ۱۸۸۵ء کو نواب صاحب کی معزولی اور نوابی کے خطاب وغیرہ کی تسلوبی حکومتی فیصلہ برسرِ خاص و عام صادر کیا (تزکِ سلطانی صفحہ ۲۳) اس فیصلہ سے پوری ریاست میں تہلکہ مچ گیا۔ نواب صاحب کے لائے ہوئے آدمیوں، بڑے بڑے عہدداروں اور افسروں کو بیک جنبشِ قلم الگ کر دیا گیا۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ جس کے متعلق نواب صاحب کے ساتھ تقرب یا تعلق کا ثبوت ملا وہ ملازمت سے سبکدوش یا خارج البلاد کر دئے گئے۔ غرض گھر گھر کہرام اور خاندان صف ماتم بچھ گئی۔ شہر بھوپال میں ۱۸۵۷ء میں ایک چھوٹی سی قیامت برپا ہو گئی۔ گرینفن گردی کا رسوائے عالم دور بھوپال میں ابھی تک زبانوں پر تھا اس وقت یہ عالم تھا بقول نواب علی حسن خاں" یا تو جب اقبال یاور اور تقدیر موافق تھی کو کرنل کنیکبڈ پولٹیکل ایجنٹ گورنر جنرل نے اسلام کا تحفہ بھیجا تھا۔ اور میکنڈ آئلا کمانڈر انچیف افواج ہند نے ان کی عقلمندی و خیر خواہی کی شہادت دی تھی۔ اور جب برا وقت آیا تو بھوپال محشرستانِ آشوب بنا ہوا تھا۔ نواب صاحب سے بڑھ کر کوئی غیر وفادار و بدخواہِ ملک و ملت نہ تھا۔ ہر طرف سے دارو گیر کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں" سچ یہ ہے کہ اس ستم آباد بستی میں اور سیاست کدۂ ظلم و طغیان میں حق و صداقت کی پرستش دیانت و امانت ایسا جرمِ عظیم ہے ناقابلِ معافی ہے۔ یہ وہ وقت تھا کہ دستِ ستم دراز ہو چکا تھا۔ تیغ بے داد بے نیام ہو چکی تھی ایک آلِ رسول، جگر گوشہ بتول وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ اللہ کی قربان گاہِ آزمائش میں فیصلہ سر و تن کا منتظر کھڑا تھا اور وہ وقت قریب آچکا تھا کہ یہ صدائے سرمدی بلند ہوے

عمریست کہ آں جلوہ منصور کہن شد، من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

کبار گاہ مثبت ایزدی نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا تیغ بے داد خمیدہ ہو کر سربسجود ہو گئی۔

طغیان ناز بیں کہ جگر گوشہ خلیل = آمد بزیر تیغ و شہیدش نمی کند

اس ہنگامہ پر آشوب میں والاجاہ مرحوم کا نہ کوئی غمگسار تھا نہ کوئی معاون و صلاح کار صرف خدائے حافظ حقیقی کی حفاظت و نصرت اور رئیسہ عالیہ کی سچی رفاقت پست پناہ

تھی۔ مآثر صدیقی صفحہ ۱۶۵ تا ۱۶۸) اور جیسا کہ اُن کے حریف نے بجا طور پر صحیح کہا۔ اور اقبال رتبہ بر سرکار ہوا۔ صرف نواب کی معزولی کا حکم صادر ہوا گرینفن نے دربار کیا اور حکم معزولی سنایا (الکہ بھوپال صفحہ)

نوابی سے معزولی و برطرفی

نواب صاحب پر گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے جو فردِ جرم ترغیب جہاد یا دعوت بغاوت، یہ ایسا سنگین جرم تھا جس کی سزا قتل و گردن زنی یا شہادت تھی۔ جیسا کہ نواب علی حسن خاں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔ "فرنگی سامراج کی تیغ انتقام حرکت میں آ گئی تھی اور سر کے جدا ہونے میں زیادہ دیر نہ تھی۔ لیکن مشیت ایزدی نے سیاسی مصالح کی بنا پر اس سخت اقدام سے روک دیا۔

(۱) سب سے پہلے تو یہ کہ نواب صاحب کی کمال مستعدی عملہ کی ہوشیار سے جرم بغاوت کی مثل گورنمنٹ تک پہونچنے نہ دیا۔ راستہ میں آگ لگادی گئی تھی۔

(۲) دوسرے یہ کہ ہنگامہ ۵۷ء کے زخم اہل ہند کے دلوں پر ابھی تازہ تھے ملکہ کے عفو عام کے اِن زخموں پر مرہم رکھا گیا تھا۔ اب برطانوی حکومت اپنی سخت گیر پالیسی کو جس نے ۵۷ھ کے ہنگامہ کو جنم دیا تھا۔ اب خیر آباد کہہ کر نرم پالیسی پر گامزن ہونا چاہتی تھیں تاکہ یہاں کے باشندوں کے دل میں اُس کے لیے گنجائش پیدا ہو سکے۔

(۳) اِدھر ریاست بھوپال نے ۵۷ء میں دیگر ریاستوں کے مقابلہ میں انگریزوں کی بڑی حد تک حمایت کی تھی اور انگریزی افواج کے لیے سہولتیں فراہم کی تھیں اِس لیے اُس نے نواب صاحب کو بیگم صاحبہ کی خاطر بے دست و پا بنا دینے کو کافی سمجھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں وزارت کا عہدہ یا ریاست کا نظام کرنل وارڈ کے سپرد کر کے تمام حالات پر قابو پا لیا اور نواب صاحب کو خانہ نشیں ہونے پر مجبور کر دیا۔

"تحریک کی ناکامی کے اسباب"

نواب صاحب کا یہ قومی و ملکی کارنامہ اور زندگی کا حادثہ جہاں ہمارے اندر

ولولہ انگیز ملی جذبات اور قومی احساسات پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے وہیں اس کی ناکامی ایک سبق آموز واقعہ ہے۔

(۱) نواب صاحب کے ریاست کے اقتدار اعلیٰ پر قابض ہو جانے کی وجہ سے جہاں مذکورہ تحریک کے لیے اسباب و وسائل بہ آسانی پیدا ہو گئے وہیں درباری سازشوں سے کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جس سے مغربی سامراج نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا۔

(۲) پھر اتنی زبردست تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہونچانے کے لیے جس قدر وفادار مردان کار کی ضرورت تھی۔ افسوس کہ وہ مہیا نہ ہو سکے۔ ریاست کے قدیم وظیفہ خواروں اور وفاداروں کو جس تیزی سے قلع قمع کیا گیا اُس نے بھی پوری ریاست میں ان کی مخالفت اور برہمی کا ماحول پیدا کر دیا۔ کیا تعجب ہے کہ گھر کے بھیدی نے اس لنکا کو ڈھایا ہو۔

(۳) اسی طرح ایک عظیم سلطنت (برطانیہ) کو اُکھاڑنے کے جس ساز و سامان اور رائے عامّہ کو ہموار کرنے کا کام جس نشر و اشاعت کے ذرائع سے ہو سکتا تھا وہ دشمن کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے کہ ۱۸۵۷ء کی ٹھوکر سے برطانوی سامراج بہت چاق و چوبند ہو گیا تھا۔ وسیع پیمانے پر مخلص افراد اور نشر و اشاعت کے ذرائع میسّر نہ آ سکے۔ بہرحال ریاست کے تیرہ و تار اور زنگ فضایں جو شمع حریّت و آزادی روشن کرنا چاہی تھی وہ مخالفتوں، دشمن کی ریشہ دوانیوں کی آندھیوں میں زیادہ دیر تک نہ جل سکی۔ اس عظیم مقصد کے جن صبر آزما مراحل سے گذرنا اور امتحانات کی بھٹی میں تپ کر اور نکھر کر سونا بن نا مقدر ہو سکتا تھا احوال زمانہ نے موقع نہ دیا۔ جن اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لیے مدت مدیدہ درکار تھی اس کو اتنی مختصر مدّت میں حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔

زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ نواب صاحب کی اس تحریک نے ابتدائی مرحلہ میں ہی دم توڑ دیا۔ ملّت اسلامیہ کے مرض مزمن (اختلافات باہمی) نے اس بیمار طبیب حاذق کی تشخیص و علاج سے پہلے ہی بستر علالت پر دراز کر دیا اور اس کے مرض نے اپنی گرفت میں لے لیا۔

نواب صاحب اپنے زمانہ کے متعلق کس قدر دل سوزی سے لکھتے ہیں۔ ؎

فارسی (اصل عبارت)

دنیا از جور و ستم پر گشتہ و تعصب و عدل
محو گشتہ ، ہو رے سیم و زر ہر یکے
بر کینہ و عداوت دیگر بر داشتہ

و اقامت شعائر اسلام سخت تر از صبر
بر اجگر گزیدہ نہ در بر کتے
فائدہ و نہ در عمل اخلاصے
و نہ در عقیدہ صحتے و رنہ در سلوک ابرے
و نہ در سلوک ابقائے و نہ در عوام صلاحیتے

و نہ در خواص شعاع انسانیت۔

اردو (عبارت کا ترجمہ)

دنیا ظلم و ستم سے بھر گئی ہے
اور عدل و انصاف مٹ چکا ہے
مال و دولت کی خواہش نے ایک دوسرے
کو عداوت و کینہ پر آمادہ رکھا ہے۔
شعائر اسلام کا قیام شعلوں کے
پٹنے سے سخت ہے۔
نہ علم میں برکت باقی رہی، نہ عمل میں کوئی
اخلاص نہ عقیدہ صحت رہی
اور نہ طریقہ سلوک و معرفت میں اثر
نہ بادشاہوں میں انصاف
نہ عوام میں صلاحیت اور نہ خواص میں
انسانیت کی کرن باقی رہی

ظہر الفساد فی البر و البحر
(انقضاء جنود الاحرار صفحہ ۱۲۰)

غرض اس مختصر سی مدت میں جو عظیم شخصیت ترقیات کی منزلوں کی طرف چڑھتی چلی گئی اور صبح نورانی نوید کامرانی و شادمانی لے کر طلوع ہوتی تھی اور ہر شام محبت و مسرت کا پیغام لے کر آتی تھی۔ ۲۷ اگست ۱۸۸۵ء / ۱۳۰۲ھ کی شام اس طرح آئی اور ان کے سر پر بلائے ناگہانی بن کر چھائی کہ شادن و شوکت کی ساری بلندیاں، پستیوں میں تبدیلی ہو چکی تھیں اقتدار و اختیار کی وسیع جولان گاہ ایک کنج قفس میں محدود ہو کر رہ گئی۔ اعزازات و خطابات کے سارے نقش و نگار صحیفۂ حیات سے مٹ چکے تھے۔ بلند عزائم اور عالیشان منصوبے سب خاک میں مل چکے تھے۔ ایک بلند پایہ مفکر و مدبر کے قلب و دماغ پر اس سانحہ کا کیا اثر ہو گا؟ اور وہ ذات جس کی

تمام عمر سن شعور سے آخر لمحۂ حیات تک باطل طاقت کی بیخ کنی کے لیے وقف رہی ہو۔
اپنی مسلسل مساعی اور متواتر کوششوں کے محل کے ڈھ جانے سے اُس پر کیا اثر ہوا ہوگا۔
اسی ناکامی کے داغ اس کے لوحِ دل پر کس قدر گہرا ہوگا۔ جس مقصد عظیم (انگریزی
اقتدار کے خاتمہ) کے لیے سارے اختیارات واقتدارات حاصل کئے تھے۔ جب وہ اعلیٰ
مقصد ہی زیر زمین دفن ہوگیا تو اس کے جذبات قلبی کا کیا عالم ہوا ہوگا؟ چنانچہ ایک
جگہ لکھتے ہیں "میں خطاب نوابی کو عقاب رب الارباب سمجھتا ہوں ۔ والا جاہی کو ایک
سبب ہلاکت یوم الحساب"

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں "بیوقوف لوگ خیال کرتے ہوں گے کہ دنیا میں
ان عوارض کی وجہ سے ایک طرح کی خفت مجھ کو لاحق ہوئی اگر خدا نخواستہ کام سے علاحدگی
اور انتزاع خطاب جو ایک امر اضافی تھا نہ وصف ذاتی اور نہ مابہ الفخراتِ بندگانِ شکم
اور خدام دینار ودرہم کے نزدیک ایک وصحت و ذلت ہے تو میرے لیے اس کے
جواب میں یہ فقرہ کسی عالم عاقل کی کفایت کرتا ہے "ذلیل الدنیا خیر من ذلیل الآخرہ
(مآثر صدیقی صفحہ ۱۲۳) اس ہنگامہ شور وشر کے بعد نواب صاحب کی پوری توجہات کا رخ تصنیف
وتالیف کی طرف ہوگئی۔ اور وہ کامل یکسوئی کے ساتھ قرآن وحدیث کی خدمت اور
علم وفنون کی اشاعت میں ہمہ تن لگ گئے۔ بقیہ پانچ سال اسی مبارک مشغلہ میں
گذرے ۔ ایک عبقری شخصیت کے لیے خاموش زندگی گذارنا ممکن نہیں ہے۔ ایک
میدان (سیاست) کی شکست نے اس کے لیے دوسری جولان گاہِ عمل کی دعوت
دی۔ اپنے ہم خیال علماء کو بلاکر تصنیف وتالیف کا ہنگامہ کردیا۔ اُن کی آخری
زندگی ہمارے نزدیک سنہری زندگی ہے۔ جس نے اسلام کے پچھلے بزرگوں کی یادیں تازہ
کردیں۔ ہزارہا نایاب کتابیں ان متنقدمیں معرض اشاعت میں آئیں اور خود نواب
صاحب اور ان کے ارباب وکمال رفقاء اور فضلاء کی تصانیف سے بھوپال ایک
مستند مرکزِ علم بن گیا۔ خدا نے اس شہر میں سے اہل بھوپال کے لیے خیر کی صورت
پیدا کی کہ سیاست کے بجائے ان کا رخ دیانت کی طرف ہوگیا۔ اور ملتِ اسلامیہ

کے لیے انہوں نے ایک عظیم ذخیرہ اپنے پیچھے چھوڑا۔ اور ریاست بھوپال کو عالم اسلام میں متعارف کرا دیا۔ جس کی تفصیل ان کی عملی خدمات کے عنوان میں کی گئی ہے۔

"وفات صدیق الحسن"

آخر وہ وقت آگیا جو ہر ذی روح کے لیے مقدر ہے۔ اس عرصہ میں الزامِ بغاوت کا ہنگامہ سرد، اور ان کی مخالفتِ جوش ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ بیمار رہ کر مرض استقاء میں ۱۳۰۷ھ ۱۸۹۰ء میں بوقت تہجد وفات پائی (ماثر صدیقی صفحہ۲۱)

فہرست فرمانروایان بھوپال مع عہد حکومت

نمبر شمار	نام	عہد
۱	سردار دوست محمد خاں بانیٔ ریاست	سنہ ۱۱۲۰ھ تا سنہ ۱۱۵۰ھ
۲	نواب یار محمد خاں	سنہ ۱۱۵۳ھ تا سنہ ۱۱۶۷ھ
۳	نواب حیات محمد خاں	سنہ ۱۱۹۲ھ تا سنہ ۱۲۴۳ھ
۴	نواب فیض بہادر شاہ	سنہ ۱۱۶۷ھ تا سنہ ۱۱۹۱ھ
۵	نواب غوث محمد خاں	سنہ ۱۲۲۳ھ تا سنہ ۱۲۴۰ھ
۶	وزیر محمد خاں خود مختاری	سنہ ۱۲ھ تا سنہ ۱۲۳۱ھ
۷	نواب نظر محمد خاں	سنہ ۱۲۳۱ھ تا سنہ ۱۲۳۵ھ
۸	نواب قدسیہ بیگم	سنہ ۱۲۳۵ھ تا سنہ ۱۲۵۳ھ
۹	جہانگیر محمد خاں	سنہ ۱۲۵۳ھ تا سنہ ۱۲۶۰ھ
۱۰	نواب سکندر جہاں بیگم	سنہ ۱۲۷۶ تا سنہ ۱۲۸۵
۱۱	نواب شاہجہاں بیگم	سنہ ۱۲۸۵ھ ۱۸۶۸ء تا سنہ ۱۳۱۹ ۱۹۰۱
۱۲	نواب سلطان جہاں بیگم	سنہ ۱۳۱۹ھ ۱۹۰۱ء تا سنہ ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۰ء
۱۳	نواب حمید اللہ خاں	سنہ ۱۹۲۴ء تا سنہ ۱۹۴۹ء

سراج الہند شاہ عبدالعزیز اور بھوپال

اس تحریک کے با قاعدہ امام شاہ عبدالعزیز نے ولی اللٰہی دعوت اور اسکے اصول و دفعات کو جو بڑے شاہ صاحبؒ کی کتابوں میں دقیق و پیچیدہ انداز میں بکھرے ہوئے تھے عوام تک پہنچایا ابھی تک خواص اہل علم ہی اس دعوت سے آشنا ہوئے تھے لیکن سراج الہند نے عوامی روایات اور مسلمات کی شکل میں ان اصول کو عام کیا سراج الہند نابغتہ العصر شخصیت تھی جن کو تحریر و تقریر میں یکساں عبور تھا۔ ان کی تقریر میں ایسی لذت و چاشنی تھی کہ ہر قوم و ملت اور ہر طبقہ کا آدمی اس سے لطف لیتا اور اثر پذیر ہوتا وہی شیرینی ان کی تحریر میں بھی پائی جاتی ہے جس کی تفسیر فتح العزیز گواہ ہے کیوں کہ اس گئی گذری حالت میں بھی دہلی کو مرکزیت حاصل تھی اس لیے شاہ صاحبؒ کے یہ افکار و خیالات شمال سے جنوب تک پھیل گئے شاہ صاحبؒ وہ پہلے انقلابی عالم ہیں جنھوں ۱۸۰۳ء میں ہندوستان کے دار الحرب ہونے کا فتویٰ جاری کیا (فتاوی عزیزی مجتبائی ص ۱۸۷-۱۷۰)

جبکہ برطانوی جنرل لیک کی فوجیں ۱۸۰۳ء میں دہلی کے اندر د رانہ داخل ہوئیں اس وقت ہندوستان کا بادشاہ شاہ عالم مادھولال سندھیا کی ماتحتی میں وقت گذار رہا تھا اس کے کچھ دن بعد یہ مغل شہنشاہ دو لاکھ سالانہ کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا جس کے اندر طے پایا کہ خلق خدا کی ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا۔

(شاندار ماضی ص ۶۴ جلد دوم)

اس لیے ہمارے نزدیک شاہ صاحبؒ کا یہ فتویٰ اصل واقعہ حقیقۃ الامری کا اعلان تھا چنانچہ کمپنی بہادر نے انگریز رزینڈنٹ مقرر کر کے دھیرے دھیرے سارے اختیارات شاہی چھین لیے اور حکومت شاہ عالم از دہلی تا پالم کا مقولہ

ضرب المثل ہوگیا۔

شاہ صاحبؒ کا یہ فتویٰ درحقیقت فرنگی سامراج سے اعلانِ جنگ تھا ولی اللٰہی پارٹی کو اس کے خلاف میدانِ جہاد میں کودنا پڑا شاہ صاحبؒ رحلت فرما چکے تھے اس جماعت کے ارکان شیخ الاسلام مولانا عبدالحئی امیر المومنین سید احمد شہید، مولانا اسماعیل شہید اور شاہ محمد اسحٰق دہلوی تھے اس جہاد کا اصل نشانہ فرنگی سامراج تھا لیکن اب پورا ملک برطانوی شکنجے میں کس چکا تھا اس لیے اندرونِ ملک دعوتِ جہاد کا برپا کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور تھا اس لیے اصول ہجرت پر عمل کر کے سرحد آزاد کے علاقہ کو (جو ہمیشہ سے آزادی پسندوں اور مجاہدوں کا گہوارہ رہا ہے) اختیار کیا سید صاحبؒ کا اصل نشانہ دعوتِ جہاد کا کیا تھا اس کی حقیقت ان کے خطوط سے کھلتی ہے غلام حیدر خاں کو ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

"ملک ہندوستان کا بڑا حصہ غیر ملکیوں کے قبضہ میں چلا گیا ہے اور انھوں نے ہر جگہ پر ظلم وزیادتی پر کمر باندھی ہے ہندوستان کے حاکموں کی حکومت برباد ہوگئی کسی کو ان سے مقابلہ کرنے کی تاب نہیں بلکہ ان کو ہر ایک اپنا آقا سمجھنے لگا ہے چونکہ بڑے بڑے اہل حکومت ان سے مقابلہ کرنے کا خیال ترک کر کے بیٹھ گئے اس لیے چند کمزور بے حقیقت لوگوں نے اس کا بیڑا اٹھایا۔"

(سیرت سید احمد شہید ص ۳۵۷ جلد دوم)

والی چترال کے ایک خط میں ہے،

"تقدیر سے چند سال سے ہندوستان کی سلطنت وحکومت کا یہ حال ہوگیا ہے کہ عیسائیوں اور مشرکوں نے ہندوستان کے اکثر حصہ پر غلبہ حاصل کر لیا ہے اور ظلم بیداد شروع کر رکھی ہے کفر وشرک کے رسوم کا غلبہ ہوگیا اور شعائر اسلام اٹھ گئے یہ حال دیکھ کر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا، ہجرت کا شوق دامن گیر ہوا، دل میں غیرت ایمانی اور

دل میں جہاد کا جوش و خروش ہے"۔ (سیرت صہ ۳۵۷ جلد دوم)

سید احمد شہیدؒ کے خطوط میں جو مہاجروں اور سکھ ذمہ داروں کے نام ہیں ان کے اندر بار بار یہ مضمون دہرایا گیا ہے:

"خدا گواہ ہے ہمارا منتہا رنہ دولت جمع کرنا ہے اور نہ اپنی حکومت قائم کرنا ہمارا منتہا یہ ہے کہ بعید الوطن بے گانے (غیر ملکی فرنگی) جو بادشاہ بن کر آئے ہیں اور وہ ملوک زمین و زماں ہو گئے ہیں ان کو وطن سے نکال دیں"۔ (شاندار ماضی صہ ۲۱۷)

بہر حال سید احمد شہیدؒ نے اپنے قافلے کے ساتھ اس آزاد علاقے میں بقول مولانا سندھی ہندوستان کی پہلی حکومت موقفہ (ڈویژنل گورنمنٹ) ۱۰ر جنوری ۱۸۲۷ء ۱۲۴۲ھ میں قائم کر دی جس کے امیر سید احمد شہید اور ہر دو بزرگ وزیر ہوئے لیکن ہندوستان کی بد قسمتی راہ میں حائل ہو گئی مہاراجہ رنجیت سنگھ جو شاہ زمان والی کابل کے نائب السلطنت ہونے کی حیثیت سے پنجاب کا گورنر تھا مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خود مختار بن بیٹھا اور پھر انگریز بہادر کی ریشہ دوانیوں میں آ کر اس علاقہ کے مسلمانوں کو چھیڑ چھاڑ اور پھر دست درازی شروع کر دی لہٰذا مجاہدین کی سرگرمیوں کا رخ جو فرنگی سامراج کی طرف مڑتا سکھوں کی طرف پھر گیا اور اپنوں کی غداری سے معرکۂ بالاکوٹ پر ۲۷ر ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ ۱۸۳۱ء میں اس تحریک کا پہلا مرحلہ ختم ہوا۔ بہر حال سراج الہند کے متوسلین نے شاہ صاحبؒ کے انقلابی پروگرام کو عملی جامہ پہنایا۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ ہندوستانی انقلابی عالم کی اصلاح و ارشادات کے اثرات ہندوستان سے باہر حجاز مقدس اور پھر اسلامی دار الخلافہ قسطنطنیہ تک شاہ غلام علی نقشبندی (جو سراج الہند کے اصحاب میں سے تھے) کے خلیفہ خالد کردی کے واسطے سے پہنچے انکو ترکی علماء نے شاہ صاحبؒ کو استنبول آنے کی دعوت دی (تحریک شاہ ولی اللہ صہ ۸۵)

اس لیے شاہ صاحبؒ وہ پہلے ہندوستانی عالم ہیں جنھوں نے فرنگی سامراج کے خلاف اعلانِ جنگ کیا اور اس وقت ہمارے ملک کو انگریزوں کے پنجے سے رہائی کے لیے سوچا جب کہ کسی کے شان وگمان میں نہ آسکتا تھا یہی وجہ ہے کہ ان کو بھی اپنے پدر بزرگوار شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی طرح برطانوی سامراج کی خفیہ سازشوں کے نتیجے میں ایسے جاں گسل اور لرزہ خیز مظالم سے گذرنا پڑا کہ جس کو سن کر اس بوڑھے مردِ مجاہد کی عزیمت وحوصلے کے آگے سرِ عقیدت جھک جاتا ہے کھانے میں ان کو زہر دیا گیا پورے بدن پر چھپکلی کی مالش کرا کے جسم کو مبروص وداغدار کیا گیا دوبار ان کو وطن دہلی سے پاپیادہ شہر بدر ہونے پر مجبور کیا گیا ہزارہا طوفان ان کے سرِ مبارک سے گذرے لیکن وہ ایمان واستقامت کی چٹان اپنی جگہ سے نہ ہلا اور نہ اپنے موقف سے ٹلا اس دور میں جب کہ شاہ صاحبؒ ان امتحانات سے گذر رہے تھے۔ دیوانی چھوٹے خاں نے بھوپال تشریف لانے کی دعوت دی جس کو اپنے بلند نصب العین کی خاطر قبول نہ فرمایا لیکن ولی اللہی دعوت کی سلسلہ زریں کی جو کڑی بھوپال سے اس وقت قائم ہوئی پھر وہ ٹوٹ نہ سکی اور پھر مفتی الٰہی بخش صاحب اور شاہ صاحب کے دوسرے شاگردوں کی آمد سے بھوپال ولی اللہی دعوت کا گویا مرکز بن گیا۔

ولی اللّٰہی دعوت کا دوسرا دور اور بھوپال

سانحۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء میں امیر شہید کی شہادت نے ولی اللّٰہی دعوت کے متوسلین کے دلوں کو خون اور جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا لیکن ان مجاہدینِ راہِ عزیمت نے ہمت نہ ہاری اور جس مقصد عالی کے لیے گھر بار چھوڑ کر غریب الدیار اور بے وطن ہوئے تھے انھوں نے نئے عزم و حوصلے سے پھر نیا منصوبہ تیار کیا اور نقشہ جہاد بنایا اس وقت جماعت دو حصوں میں بٹ گئی۔ دہلوی جس کے امام سراج الہند کے نواسے شاہ اسحق دہلوی تھے اور دوسری صادق پوری جماعت جس کے امیر مولانا ولایت علی پھر مولانا عنایت علی ہوئے صادق پوری جماعت امیر شہید کی شہادت کے منکر اور دوبارہ ان کے ظہور کی معتقد تھی اس جماعت نے امام ناصر حازمی کے واسطے سے امام شوکانی اور امام عبدالوہاب نجدی سے رابطہ قائم کیا اس لیے مسلکِ سلفیت (توحیدِ کامل اور بدعات سے کامل احتراز) کو اختیار کیا۔

اس موقع پر اسلامی ہند کی درخشاں تاریخ کے قربانیوں سے روشن اور جاں فروشوں کے رنگین باب سید احمد شہید کی تحریک جہاد اور ان کے خلیفہ مولانا ولایت علی کے عظیم کارنامے کا اجمالی تذکرہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتے تاکہ ناظرین کی نگاہوں میں اس کا ہلکا سا خاکہ آسکے اسلامی ہند کی تاریخ کے آسمان پر سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد کہکشاں کی طرح چمکتی ہوئی نظر آتی ہے جس کے گردوں کا ہر ستارہ راہِ حق کے مسافروں کے لیے ہدایت کا منارہ ہے حضرت سید شہید کو قدرت نے مسلمانانِ ہند کے لیے اپنے دور میں مجاہدہ و عمل کا ایک آفتاب بنا کر

پیدا کیا تھا شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز نے اپنے زبان و قلم سے جس دعوتی و انقلابی پروگرام کا خاکہ بنایا تھا اس کے اندر عملی رنگ بھرنے کی سعادت سید احمد شہید کے حصہ میں آئی سید صاحب اور علم الٰہی خاندان شروع ہی سے شاہ ولی اللہ سے وابستہ تھا شاہ ابو سعید مجددیؒ شاہ صاحب کے چہیتے شاگرد تھے جن کو مرض الموت میں شاہ صاحب نے یاد فرمایا۔ (مکتوب شاہ ولی اللہ)

حضرت سید شہید (ولادت ۱۲۰۱ھ / ۱۷۸۶ء) اپنے وطن رائے بریلی سے ابتدائی تعلیم کے بعد جب دہلی پہنچے تو سراج الہند نے تعلیم روحانی کے لیے شاہ عبدالقادرؒ کے سپرد کیا ان کی پیشانی کو دیکھ کر اس حقیقت کو پڑھ لیا کہ قدرت ان سے ایک عظیم کام لے گی چنانچہ بعد تکمیل باطنی سراج الہند نے اپنی دستار مبارک ان کے سر پر باندھ کر خطہ دوآبہ (یوپی) کی اصلاح و ارشاد کے لیے روانہ فرمایا سید والا گوہر کا جس خطہ میں نقش قدم پڑا وہاں دین و ملت کی سوکھی کھیتوں میں زندگی اور سرسبزی و شادابی کے آثار پیدا ہوئے ہزارہا بندگانِ خدا راہِ راست سے بھٹک گئے تھے شریعت کے روشن راستہ پر لگ گئے جو عاملِ شریعت تھے ان کو حاملِ طریقت و معرفت بنا دیا غرض سید صاحب کا یہ تبلیغی و اصلاحی دورہ خدا کی رحمت کا ایک بادل تھا جہاں جہاں وہ برسا زندگی کی لہر دوڑ گئی پھر سفر حج میں شمالی ہند کے بعد بہار و بنگال کی سرزمین کو سید صاحب کی اصلاحی و تربیتی فیوض نے سیراب کر دیا۔ حج سے واپسی کے بعد وہ زمین تیار ہو گئی جس کے لیے محنت کی گئی تھی مجاہدہ و ریاضت کے بیج ڈال دینے کے بعد فصل تیار ہو کر کھڑی ہو گئی حضرت سید شہید کا قافلہ گوہر مقصود حاصل کرنے کے لیے سرحدِ آزاد پہنچا اور وہاں تحریک جہاد کا آغاز فرمایا مرکزی حکومت کی کمزوری نے عرصہ دراز سے سکھوں کو کامل تسلط بخش دیا تھا انھوں نے اہلِ اسلام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر زندگیوں کو اجیرن کر رکھا تھا اس لئے قدرتی طور پر ان ہی سے مڈبھیڑ ہوئی مجاہدین کی بے سروسامانی کے باوجود ان کی اخلاص مندی نے کامیابی کے

جھنڈے لہرادئے اور اس علاقہ میں اسلامی نظام قائم ہو کر اسلام کی ابتدائی صدی کے جاں نثاروں یعنی صحابہ کرام کی یادوں کو تازہ کر دیا باطل رسم وروایات کا قلع قمع ہو کر حقیقی اسلام کا چہرہ اس خطہ میں جلوہ افروز ہوا لیکن اس انقلاب حال سے سرحد کے سرداروں اور خانوں کو اپنی چودھراہٹ مٹی میں ملتی ہوئی نظر آئی اس لیے سید صاحب کی فتوحات سے ڈر کر انھوں نے سکھ سرداروں سے ساز باز کر کے اندر ہی اندر بے وفائی و غداری کا کھیل کھیلا اور مجاہدین کو نقصان پہنچایا اور سید صاحب کے مقرر کردہ قاضیوں کو ایک ہی رات میں ذبح کر کے نظام اسلامی کو بھی ذبح کر دیا سید صاحب نے مرکز اصمت کو چھوڑ کر دوسرا مرکز تجویز کیا لیکن سانحہ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء نے سالہا سال کی محنتوں سے لگاتے ہوئے چمن کو تاراج کر دیا سید شہیدؒ کی شہادت پر تحریک کا پہلا دور ختم ہوا سید صاحبؒ نے اپنی شہادت سے پہلے اس تحریک کو ملک میں پھیلانے کے لیے خصوصی خلفار کو ہندوستان روانہ کیا تھا۔ مولانا سید اولاد حسن والد ماجد نواب صدیق حسن کو یوپی کے لیے مولانا سید علی رامپوری کو جنوبی ہند مدراس کے لیے اور مولانا ولایت علیؒ کو حیدر آباد دکن کے لیے نامزد فرمایا چنانچہ مولانا ولایت علی نے اس سانحہ کے بعد از سر نو کمان سنبھالی اور سید شہیدؒ کے چھوڑے ہوئے کام کو نئے سرے سے شروع فرمایا مولانا ولایت علی کی شخصیت تحریک[1] جہاد کے سلسلہ میں سید شہیدؒ کی ایک زندہ کرامت تھی وہ خود رئیس زادے مولوی فتح علی رئیس پٹنہ کے بیٹے اور رفیع الدین حسین خان صوبہ بہار کے آخری گورنر کے نواسے بے حد ذہین و ذکی عیش و عشرت کی فضا کے پروردہ ایک من چلے اور بانکے نوجوان تھے جنھوں نے سید صاحب سے طالب علمی کے زمانے میں اپنے منطقی استاد مولانا اشرف فرنگی محلی کی معیت میں ملاقات کی تھی اور سید صاحب کی تقریریں ان کی دل کی دنیا کو ہی بدل دیا تھا سید صاحب

[1] مولانا ولایت علی صادق پوری۔

کی سفرِ حج سے واپسی پر ان کا استقبال کرتے اپنے بھائی عنایت علی کے ساتھ پٹنہ سے منگیر تک پا پیادہ آئے تھے اور جب سید صاحبؒ پٹنہ پہنچے تو مولانا اور ان کے خاندان نے سید صاحبؒ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر اپنی زندگی کا سودا راہِ حق کے لیے کیا چنانچہ معرکۂ جہاد میں سب سے پہلے ان کے چچازاد بھائی باقر علی شہید ہوئے ابتدا میں جب رئیسانہ شان سے سید صاحبؒ کے یہاں پہنچے تو لوگوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ قافلے کے لیے بار ہوں گے لیکن سید صاحب نے یہ پیشین گوئی فرمائی کہ وہ راہِ صدق وصفا میں قدیم لوگوں سے بھی بازی لے جائیں گے چنانچہ چند دن کے فیضِ صحبت نے ظاہری شکل کی تبدیلی کے ساتھ ان کے اندر ایسا باطنی انقلاب پیدا کیا کہ وہ ناز پروردہ ، رئیس راہِ جہاد میں ایک محنتی اور جفاکش مزدور بن گیا جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اپنے ہاتھوں سے کھانا پکاتے گارا بنا کر مکان بناتے شاہ اسماعیل شہیدؒ سے سند حدیث لے کر ان کے مجاہدانہ رنگ میں ایسے رنگ گئے کہ ان کے نائب ہو گئے توحیدِ خالص کی دعوت اور باطنی اصلاح و تربیت ان کی زندگی کا روشن عنوان بن گئے وہ سید صاحبؒ کے قافلے کے ساتھ آزاد سرحد پہنچ کر فریضۂ جہاد کی عملی تربیت بھی حاصل کر لی جب مولانا ارشاد و جہاد دونوں میدانوں کے شہہ سوار بن گئے تو سید صاحب نے سب سے پہلے ان کو حیدر آباد دکن کے لیے نامزد فرمایا عرض کیا کہ بندہ تو زندگی کا نذرانہ بارگاہِ حق میں پیش کرنے کے لیے حاضر ہوا تھا آپ پھر وطن واپس کر رہے ہیں فرمایا مولانا ہم آپ کو تخم کر کے اٹھاتے ہیں ان کے سر پر اپنا عمامہ رکھ کر ارشاد فرمایا کہ کلمہ حق کے اظہار میں کسی کا خوف نہ کرنا اور خلقِ خدا کو حق کی طرف بلاتے رہنا کہ اسی فرض کی ادائگی میں خیر و برکت ہے مولانا ولایت علی جب حیدر آباد دکن پہنچے جو لکھنؤ کے اجڑ جانے کے بعد عیش و عشرت کی پناہ گاہ بن گئی تھی تو ان کی صدائے حق میں عوام ہی کے دلوں میں گھر نہیں کیا بلکہ امراء کے عشرت کدوں میں اس آواز نے ایک زلزلہ برپا کر دیا نواب مبارز الدولہ جو نظام ناصر الدولہ کا چھوٹا بھائی تھا بڑے حضرت

کا مرید ہوا اور اس کی دنیا ہی بدل گئی مولوی زین العابدین اور محمد عثمان جو ان کے مقرب تھے اور جن کو دریافت احوال کے لیے بھیجا گیا تھا وہ ایسے مرید و گرویدہ ہوئے کہ سرحد پہنچ کر راہِ حق کی شہادت حاصل کی اس چار سال کی مدت میں مولانا کے ارشاد و ہدایت سے دکن میں روحانی انقلاب برپا ہوا جب سید صاحبؒ کی خبر شہادت پہنچی تو مولانا چودہ حلقے دکن میں قائم کر کے اور دس ہزار انسانوں کو راہ جہاد پر لگا کر حیدر آباد کا کام اپنے خلفار کو سونپ کر روانہ ہوئے راستہ میں برہان پور، جبل پور وغیرہ میں تخم ہدایت بکھیرتے ہوئے اور چراغ ہدایت روشن کرتے ہوئے دو برس میں پٹنہ پہنچے اور کمر ہمت باندھ کر صادق پور کو دعوت جہاد کا مرکز پورے ملک کو چند حلقوں میں بانٹ کر خلفار کے ذمہ دعوتی کام سونپا وہ پہلے انقلابی مولوی ہیں جنھوں نے مطبع قائم کرا کے اور حضرت شاہ اسحٰق دہلوی سے رابطہ قائم کر کے موضح القرآن ترجمہ شاہ عبدالقادر اور مولانا شہید وغیرہ کے سو رسائل چھاپ دئے اور دعوتی لٹریچر کو ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دیا۔ مولانا محمد علی رام پوری نے مدراس میں کامیابی حاصل کی اور خان بہادر نواب تہور جنگ کو حلقہ ارادت میں لے کر تحریک سے وابستہ کیا اور مرکز سے جوڑ پیدا کیا۔ بڑے حضرت مولانا ولایت علی مجاہدین کے قافلے پہ در پے سرحد روانہ کرتے ہوئے خود بھی استھانہ (مرکز جہاد) جا پہنچے اور دوبارہ اسلامی حکومت قائم کر کے تحریک کا آغاز کیا لیکن برطانوی سامراج بھی آزاد سرحد کی اس نئی ابھرتی ہوئی طاقت سے غافل و بے خبر نہ تھا اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے مر جانے کے بعد سکھ قوم کو اپنے ساتھ ملا چکا تھا چنانچہ اس نے آزاد سرحد کے قبائلی سرداروں کو اپنے روپہلی اور سنہری جال میں گرفتار کر کے مولانا کے خلاف لا کھڑا کیا اور کچھ معرکہ آرائیوں کے بعد مجاہدین کو زک پہنچا کر مولانا کو اپنے وطن صادق پور واپس ہونے پر مجبور کیا مولانا نے وطن پہنچ کر تھوڑے دنوں بعد چولا بدلا اور بظاہر جاگیر کی درستی، محلات و باغات کی مرمت و آراستگی میں بھلاوا دینے کے لیے لگ گئے

لیکن اندر ہی اندر جہاد کے لیے تیاریاں جاری رکھیں اور راز داری کے ساتھ مرکزی نظام قائم کر کے اور اپنا دامن جھاڑ کے چل کھڑے ہوئے لکھنؤ و دہلی ہوتے ہوئے اور مغل بادشاہوں سے ملتے ہوئے مرکز جہاد استھانہ پر پہنچ گئے اور پھر وطن کی طرف پیچھے مڑ کر نہ دیکھا سرحد پہنچ کر سابقہ تجربات کی بناء پر مولانا نے سرحد کے مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دینے سے پہلے اصلاحی و تربیتی کام شروع کیا اس حقیقت کے پیش نظر کہ جب تک یہاں کے مسلمانوں کو دعوتی رنگ میں نہ رنگا جائے برطانوی سامراج سے ٹکر لینا مضر ہے چھوٹے حضرت مولانا عنایت علی جو ایک گرم جوش مجاہد تھے اس رائے سے متفق نہ ہو کر انگریزوں کے خلاف جہاد کا سلسلہ جاری کرنا چاہتے تھے لیکن مولانا کے اخلاص نے اس جھگڑے کو آگے نہ بڑھنے دیا آخر سید شہید کا سچا جانشین اصلاح و تربیت کا فریضہ انجام دیتا ہوا ۵ر نومبر ۱۸۵۳ء کو مولائے حقیقی سے جا ملا اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا عنایت علی خلیفہ ہوئے جنھوں نے اپنے پروگرام کے مطابق برطانوی سامراج کے خلاف جہاد کا بگل بجا دیا اور جس قبیلے یا سردار سے انگریزوں کے خلاف میدان میں اترنے کی امید ہوتی ان سے ہاتھ ملایا لیکن سرحد کے سردار چڑھتے سورج کے پجاری تھے جس کا پلہ بھاری نظر آتا اس کے پلڑے میں اپنی طاقت ڈال دیتے اور نفع حاصل کرتے اس نفاق پرور ماحول میں ایمانی فضاؤں کا قائم رکھنا اور معرکۂ جہاد کو فتح یابی کی منزل تک پہنچانا ایک کٹھن معاملہ تھا۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ چھوٹے حضرت نے برطانوی سامراج کو تگنی کا ناچ نچایا سر ولیم ہنٹر نے اس طرح اس کا اعتراف کیا ہے۔

"اس دوران مذہبی دیوانوں نے سرحدی قبائل کو انگریزوں کے خلاف اکسایا جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۶۰ء ہم علیحدہ علیحدہ مہمیں بھیجنے پر مجبور ہوئے باقاعدہ فوج کی تعداد ۳۵ ہزار تھی چھپن ۵۶ سے ساٹھ تک مہموں کی گنتی بیس تک

پہنچ گئی تھی اور باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار تک ہو گئی فوج اور پولس اس کے علاوہ تھی۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۳۸-۳۹)

آخر ۱۸۵۷ء کے ہندوستان پر کامل تسلط کے بعد برطانوی سامراج نے مجاہدین کے مراکز کو مکمل تباہ و برباد کرنے کا منصوبہ بنایا اور یکے بعد دیگرے سرحد کے غداروں کی مدد سے "پنجتار" "منگل تھانہ" اور آخر میں " اسمٰھانہ" کو تہس نہس کر کے اینٹ سے اینٹ بجادی لیکن مجاہدین نے اپنی شکست نہ مانی مولانا عنایت علی نے معرکۂ جہاد قائم رکھتے ہوئے اور فرنگی سامراج سے لڑتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں انتقال فرمایا۔

اس تحریک کے کٹر دشمن ڈبلو ڈبلو ہنٹر کی زبان قلم سے جو بے ساختہ تحسین آمیز کلمات ابل پڑے ہیں وہ اس تحریک کی صداقت کی روشن سند ہے۔

جن لوگوں نے تحریک کی دعوت پر لبیک کہا انھوں نے اپنی ساری زندگی اور قوتیں اس مقصد کے لیے وقف کر دیں وہ اپنے آپ کو بالکل بھول چکے تھے انھیں کوئی چیز یاد تھی تو وہ تحریک اور اس کی دعوت تھی ان کی زندگیاں بیداغ تھیں وہ انگریز حکومت کو کافر حکومت قرار دیتے اور اسے تباہ کرنے میں سرگرم عمل رہتے وہابی وہ ہے جو کسی سے نہ ڈرے اور نہ اصول کے خلاف کسی کی رعایت کرے اس کی زندگی کا راستہ صاف ہے کسی قسم کی تہدید یا تشدد (سختی و دھمکی)، اس کو اپنی راہ سے منحرف نہیں کر سکتی یہ لوگ اپنے عقیدوں کے مطابق بڑے پاک طینت تھے انھوں نے بغاوت میں حصہ لیا تو کسی ادنیٰ مقصد کے لیے نہیں۔

تحریک کاروں کے متعلق ہنٹر کی زبان قلم سے جو تحسینی کلمات بے اختیارانہ صادر ہوئے وہ قابل دید ہیں وہ لکھتا ہے:

"مقامی مبلغین بعض اوقات خطرناک آتش فشاں ثابت ہوئے ہیں مگر میرے لیے ناممکن ہے کہ میں ان کا نام ادب سے نہ لوں ان میں سے اکثر خدا ترس نوجوانوں کی زندگی شروع کرتے ہیں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ وہابی مبلغ سب سے زیادہ روحانیت رکھنے والے، سب سے زیادہ بے غرض اور بے لوث ہوتے ہیں اور وہ نہایت دلیری سے عوام الناس میں تبلیغ کرتے ہیں ان کا سیاسی و مذہبی نصب العین انقلاب پسندوں کی امید و بیم کے عین مطابق ہے اور ان میں ہزاروں اشخاص ایسے ہیں جو فی الواقع بڑے ہی متقی ہیں اور نفس کشی کو اپنی زندگی کا نصب العین تصور کرتے ہیں یہی افراد اصل میں تمام جماعت کی برتری کا باعث ہوتے ہیں اور ان ہی کی برکت ہے کہ اس جماعت کو دنیادار لوگوں کی اکثریت بے حد عزت و تقدس کی نظر سے دیکھتی ہے۔"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان)

ریاست بھوپال کا ولی اللہی تحریک کے اس دوسرے دور سے بھی خصوصی تعلق رہا ہے اس لیے کہ ریاست کو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام پر پہنچانے والی عظیم شخصیت منشی جمال الدین مدار المہام کا اسی جماعت سے تعلق تھا انھوں نے سانحہ بالاکوٹ کے بعد شیخ المحدثین شاہ عبدالقیوم محدث بھوپال (نبیرہ شاہ عبدالعزیز) کو دعوت دے کر بھوپال کو ان کے قیام سے عزت بخشی اور بھوپال ولی اللہی سلسلہ کی سنہری کڑی بن گیا حضرت شاہ اسحاق دہلوی کی ہجرت کے بعد ان کے قائمقام مولانا مملوک علی اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی ہوئے استاد الاساتذہ مولانا مملوک علی جس طرح منشی جمال الدین مدار المہام کے اُستاد بانی دار العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے بھی استاد تھے بلکہ یہی مولانا مملوک علی سرسید احمد خاں بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ کے بھی

استاد تھے اس تحریک کا تیسرا دور ۱۸۵۷ء کی جہاد آزادی کا دور ہے جس کے اندر سید الطائفہ حاجی امداد اللہ امیر جہاد اور مولانا نانوتوی، مولانا گنگوہی جنرل و کرنل کی حیثیت سے اس معرکہ میں مردانہ وار شریک ہوئے تھانہ بھون سے تحصیل شاملی تک میدان جہاد بنا لیکن ان بزرگوں کی دہلی تک پہنچنے سے پہلے ہی پانسہ پلٹ گیا اس تیسرے دور ۱۸۵۷ء میں بھی بھوپال ملک سے پیچھے نہیں رہا جس کی تفصیل دوسرے باب میں آرہی ہے۔

جہاد ۱۸۵۷ء کے بعد ولی اللہی جماعت نے میدان جنگ بدل دیا اور اسلامی درسگاہوں کے قلعوں میں بیٹھ کر فرنگی سامراج کے خلاف جہاد کا ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا اس لیے کہ برطانوی سامراج نے ملک کے ہر گوشہ میں اپنے فولادی پنجے گاڑ دئے تھے امام نانوتوی کے بعد ان کے سچے جانشین مولانا محمود الحسن آخری امام تھے۔

دعوتِ جہاد کی ناکامی کے وجوہ واسباب

ولی اللہی جماعت نے آغاز کار اصلاحی و انقلابی دونوں طریقوں سے اپنے دائرہ کار کو آگے بڑھایا اگرچہ اس کی روح دعوت اسلامی کی طرح اصلاحی ہے لیکن مخالف طاقتوں کی وجہ سے اس کو انقلابی جماعت (مجاہدین) بن کر میدان میں آنا پڑا اور اپنی ملت کے تحفظ کی خاطر بے سروسامانی کے باوجود سامراج سے ٹکر لینا پڑا اس لیے ایک سوال دل میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ولی اللہی جماعت جس نے اپنی دعوت میں معاش ومعاد، دین ودنیا، مادیت وروحانیت دونوں کو سمویا تھا اس کی انقلابی تحریک شکست سے کیوں دوچار ہوئی جبکہ خالص مادی معاشی بنیادوں پر اٹھائی ہوئی اشتراکی تحریک نہ صرف روس میں کامیاب ہوئی بلکہ آدھی دنیا پر اس نے اپنے اثرات ڈال رکھے۔

(۱) اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اس دعوت کو شاہ عبدالعزیز کے بعد ان جیسا جامع علم وعمل مقبول خاص وعام قائد میسر نہ آسکا ان کے جانشین کچھ علم وفضل کی راہ میں بڑھے ہوئے تھے تو عملی میدان میں پیچھے تھے اور جو عملی میدان کے شہسوار تھے وہ علم وفضل میں اس درجہ بلند پایہ نہ تھے سراج الہند جیسی جامعیت وکاملیت اور نابغیت ہر فرق وطبقہ میں ہر دلعزیزی اور خداداد مقبولیت پھر کسی کو حاصل نہ ہوسکی امیر سید احمد شہید نے دعوت جہاد کو ایک مرحلہ پر پہنچا کر جام شہادت نوش فرمایا اور شاہ محمد اسحٰق تعلیمی وتربیتی نظام کے ذریعہ اپنے شاگردوں کی ایک عظیم جماعت پیدا کر کے راہِ ہجرت پر گامزن ہوئے لیکن جن دو بازوؤں (علماء ومجاہدین)

کے مل جانے سے دعوت کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتی یہ صورت حال برقرار نہ رہ سکی۔

(۲) دوسری وجہ اس دعوت کی منزل مقصود تک نہ پہنچنے کی تاریخ اسلام کا پرانا قضیہ نامرضیہ ایرانی و تورانی (شیعہ وسنی) کی کشمکش ہے جس نے ہر ہر مرحلہ پر ملی اجتماعیت کو نقصان پہنچا اور فرنگی سامراج کی متحدہ طاقت کا مسلمانان ہند متفق ہو کر مقابلہ نہ کر سکے جس طرح بغداد میں ہلاکو خاں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے میں مسلمانوں کے دو صفوں میں بٹ جانا اس کا سبب بنا یہی حال دہلی کا ہوا جس طرح شیعہ وزیر اعظم ابن علقمی نے در پردہ غنیم (ہلاکو) سے سازباز کرلی اور محقق طوسی کے اشارے پر ہلاکو کو بغداد کے تاراج کرنے کی جرأت ہوئی یہی حالت یہاں بھی پیدا ہوئی امیر الامرا نجیب الدولہ (جو دعوت ولی اللہی کا مخلص کارکن اور شاہ صاحبؒ کا مرید تھا) اور نواب آصف جاہ بانی حکومت دکن اور حافظ الملک رحمت خاں ایک طرف تھے اور سید حسین علی اور ان کے سادات بارہ جو آخری دور میں بادشاہ گر بن گئے تھے وہ بادشاہ کو دوسری سمت میں لے جانا چاہتے تھے برطانوی سامراج نے حالات کی نبض پر ہاتھ رکھ کر مریض کی اندرونی کمزوریوں کو جانچ لیا اور پھر اس سے فائدہ اٹھایا چنانچہ نجف علی شیعی کوتوال کے ایما پر مرزا مظہر جانِ جاناں جیسے پاک باطن صوفی بزرگ کا سانحہ شہادت پیش آیا اور شاہ عبد العزیز صاحبؒ کی جلاوطنی عمل میں آئی اس کے بعد لکھنؤ کے نواب شجاع الدولہ کو حافظ الملک بانی سلطنت روہیل کھنڈ اور نواب نجیب الدولہ سے ٹکرا کر مغل حکومت کے دو بازوؤں کو توڑ دیا گیا ایسے مخالفانہ ماحول اور معاندانہ فضا میں شاہ صاحبؒ اور ان کی جماعت کو اپنی مدافعت کے لیے مجبور ہونا پڑا شیعہ سنی علماء میں مناظرتی لٹریچر کا تبادلہ ہوتا رہا دانایان فرنگ کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے دست و گریباں کر کے اپنی طاقت کو مضبوط بنایا اور اپنی ڈپلومیسی کے جال میں اب آدھے ملک کو کس لیا کیوں کہ ولی اللہی دعوتِ جہاد کا اصل

نشانہ برطانوی سامراج تھا اس لیے مجاہدین کو سکھوں سے بھڑا دیا غرض سقوط بغداد کی کہانی سقوط دہلی کی شکل میں دوبارہ دہرائی گئی ان حوصلہ فرسا حالات میں بھی مجاہدین حریت کے تحریکات کے قائم رہنے کو ولی اللہی دعوت کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے۔

(۳) ہمارے نزدیک مشرقی اقوام کی مغربی سامراج کے مقابلہ میں ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہزاروں سال حکومت یا بادشاہت کرتے کرتے ایشیائی قومیں عیش پرستیوں اور غفلت شعاریوں میں پڑ کر اپنی جوان قوتوں کو ضائع کر چکی اور بڑھاپے کا شکار ہو چکی تھیں صدیوں کی شہنشاہیت کی مطلق العنانی نے خواص و عوام کے عملی قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا وہ ایجاد سامانی اور سائنسی انکشافات کی تازہ قوتوں سے قطعاً نابلد و بے بہرہ اور ان کے استعمال سے قاصر تھے تہذیب و تمدن کے زوال پذیر اقتدار سے چپٹی ہوئی اور زوال آمادہ آثار کو سینے سے لگائی ہوئی تھیں وہ منگولین قبیلے جو مشرف با اسلام ہونے کے بعد ترک مغل کھلائے شجاعت و بہادری کا مذاق اور فنون لطیفہ سے دلچسپی کا ذوق تو ان کی فطرت میں پیوست تھا لیکن اندلس کے عربوں کے سائنسی ذوق سے یکسر محروم تھے اسپین کے اندر عرب علماء، ابن رشد، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن الہیثم، زہراوی کے ہاتھوں جس سائنس کا آغاز ہوا تھا یورپ کے محققین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں "کوپرنیکس، گلیلیو، بن تھم، نیوٹن، مل اور ڈارون جیسے زبردست فلسفہ اور سائنس کے امام پیدا ہوئے یونان روما کی مردہ تہذیب نے مغرب کی سرزمین میں نیا جنم لیا یورپ کے ان تمام طالبان علم نے عربوں کے سرزمین علم و ہنر اندلس کے مشہور عالم درس گاہوں قرطبہ غرناطہ، اشبیلیا اور سسلی کے سیلرنو میں پہنچ کر سائنسی علوم سے نئی زندگی و توانائی حاصل کی اور سترھویں صدی نہ آنے پائی تھی کہ یورپ ایک مرد جواں اور سیاست ڈپلومیسی کا طاقتور پہلوان بن کر ایشیائی قوموں کے میدان میں خم ٹھونک کر آ گیا اور جدید سائنسی مہلک ایجادات کے ذریعہ

میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا جس کے آگے مشرقی قوموں اور مشہور عالم بہادر ترکوں کے شمشیر زن بازو شل ہو گئے ان نئی توپوں، مشین گنوں اور مہلک ہتھیاروں نے پرانی روایتی بہادری کے افسانوں کو قصّہ پارینہ کر دیا مغرب نے پورے مشرق پر دھاوا بول دیا اور ایک ایک کر کے تمام ملکوں پر اپنے جھنڈے لہرا دئے ایشیا کے سربراہوں، بادشاہوں، سرداروں کو آپس کی لڑائی ہی سے فرصت نہ تھی کہ ان بیرونی طاقتوں کا متفق ہو کر مقابلہ کرتے مغربی سامراج نے ان ملکوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک صدی ہی میں مشرق کی سرزمین کا مالک و مختار بن بیٹھا اور ایشیا کے صدیوں کے محفوظ خزانوں اور مال و دولت کے ذخیروں کو خوانِ یغما کی طرح لوٹ کر مشرقی ممالک کو مفلس و قلاش اور کنگال بنا دیا ہندوستان جو سونے کی چڑیا سمجھی جاتی تھی وہ ان ظالم صیادوں کے ہاتھوں پڑ کر بے بال و پر ہو کر رہ گئی۔ ایشیا کا خون نچوڑ کر اس کو ضعیف و نحیف اور کمزور بنا دیا اور یورپ ایک مردِ تنومند بن گیا یہاں کی دولت نے یورپ کے کارخانوں کو فروغ دیا اور انگلستان میں اسکی بدولت صنعتی انقلاب آگیا۔

ظاہر ہے کہ ان پر خطر و پر آشوب حالات میں ولی اللہی دعوت کے علم بردار جماعت اپنے ملی وجود کی حفاظت اور دشمن کی ریشہ دوانیوں سے مدافعت پر ہی توجہ کر سکتی تھی چنانچہ وہ اپنے قومی، ملی فریضہ کو قائم رکھتے ہوئے نہضہ ثانیہ کی طرف بڑھنے کے قابل ہوئے۔

(۴) ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ ولی اللہی دعوت کا آغاز جس وقت ہوا تھا اس وقت ہندوستان جدید نشر و اشاعت (مطبع یا چھاپہ خانہ سے) محروم تھا مارکس اور اینگلس کی کامیابی میں جہاں ان کی ذاتی حیثیت کو دخل ہے وہاں پریس کی طاقت جو ان کے ہاتھ آگئی تھی اس کا بھی زبردست عمل دخل ہے جس نے لاکھوں انسانوں کو ان کے خیالات و نظریات کو بآسانی پہنچا کر متاثر کیا شاہ صاحبؒ کی تحریک اس دوسری طاقت (پریس) سے محروم رہی اس لیے ان کی دعوت

علمی حلقوں تک محدود رہی عوام کے لیے نشر واشاعت کے جو ذرائع تھے وہ (۱) یا تو وعظ و نصیحت کے حلقے تھے یا دینی تعلیمی ادارے (۲)، اس لیے ولی اللٰہی دعوت نے ایک طرف دشمن کے حملوں سے حفاظت و مدافعت کا فرض انجام دیا اور دوسری طرف تعمیر ملک و ملت بلکہ تعمیر انسانیت اصلی نصب العین کو اپنے سامنے رکھا اور ارشاد و ہدایت کے لیے عوام میں تربیت نفس، تزکیہ اخلاق اور اصلاح معاشرت کے لیے ادارے، خانقاہیں قائم کیں اور دوسری طرف خواص کے طبقہ میں اسلامی علوم و فنون کو باقی رکھنے اور ان کو نئے ماحول میں رہنمائی کا فرض انجام دینے میں تعلیمی درس گاہوں کا جال بچھا دیا ریاست بھوپال کو یہ خصوصی فخر حاصل ہے کہ وہ آغاز کار ہی سے سراج الہند شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے قابل اعتماد شاگردوں کے علمی فیوض و برکات کا مرکز بن گئی۔

ولی اللہی دعوت اور بھوپال

حضرت شاہ ولی اللہ کے سنہری سلسلے کی ایک اہم کڑی ریاست بھوپال روز اول سے ہی رہی ہے بھوپال سے حضرت شاہ صاحب کا قیام ریاست سے پہلے ایک قدیمی رشتہ تو یہ ہے کہ حضرت حکیم الہند کے جد امجد وجیہہ الدین کی شہادتگاہ اور ان کا مزار دوراہہ (بھوپال) میں ہے دوسرا خود حضرت شاہ صاحب سے ایک روحانی رشتہ (جس سے اکثر لوگ نابلد وناواقف ہیں) یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے براہ راست شاگرد مولانا مولوی ضیاء الدین بھوپالی ہیں جو حضرت شاہ ابواللیث نقشبندی (خلف وخلیفہ شاہ ابوسعید مجددی رائے بریلوی) کے خلیفہ بھی ہیں جن کا مزار بھوپال میں ضیاالدین ٹیکری پر واقع ہے جو اب ایک محلہ بن کر احمد آباد کہلاتا ہے۔

مولانا مولوی شاہ ضیاء الدین بھوپالی

مولانا مولوی شاہ ضیاء الدینؒ قاضیانِ دوراہہ کے ممتاز عالم و فاضل بزرگ تھے ان کا نسبی سلسلہ میرٹھ کے فاروقی اور ننھیالی سلسلہ صدیقی خاندان سے ملتا ہے قاضی سراج الدین ٹاٹ پوش ان کے مورث اعلی تھے جن کے آباء واجداد کو عالمگیرؒ کی طرف سے اس علاقہ میں منصب قضا کا اعزاز دیا گیا تھا ان کے والد قاضی نجم الدین اور ان کے نانا بھوپال کے نامور مفتی خاندان کے مورث اعلی

مفتی خیر اللہ صدیقی تھے مولوی صاحب نے جن والدہ ماجدہ کی آغوش میں پرورش
پائی وہ ایک نہایت پرہیزگار خاتون تھیں مشہور ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کو
بے وضو کبھی دودھ نہیں پلایا مولوی صاحب تقریباً ۱۱۲۱ھ میں پیدا ہوئے اور
ابتدائی تعلیم کے بعد اپنے حقیقی ماموں شاہ عبد الغفور سے علوم ظاہری بھی تحصیل کیے
جو ایک جید عالم اور باکمال درویش تھے شعر و ادب کا ذوق ان کے فیض تربیت سے
مولوی صاحب میں منتقل ہوا مزید تکمیل کے لیے مرکز العلوم دہلی پہنچے اور وہاں حضرت
شاہ صاحب ان کے صاجزادگان عظام قاری عبد المجید المعروف بصوبہ ہند اور
مولانا فضل امام خیر آبادی سے علوم معقول و منقول کا درس لیا شاہ ابو اللیث
نقشبندی سے تکمیل باطنی کی اور پھر مراجعت فرمائے وطن (بھوپال) ہو کر حضرت
شاہ رؤف احمد مجددی سے روحانی تکمیل کی اور ریاست کے خوص و عوام میں
یکساں مقبول ہوئے نواب غوث محمد خاں (جو ان کے معتقد تھے) اپنے صاجزادوں
نواب معز محمد خاں، فوجدار محمد خاں کی تعلیم و تربیت سپرد کی سات گاؤں جاگیر
میں دئے گئے، مولوی صاحب گاؤں گاؤں پہنچ کر اشاعتِ اسلام اور رفاہِ عام
کے کام انجام دئے اور ولی اللہی دعوت کے فیوض و برکات کو پورے خطہ مالوہ میں
عام کرتے قدرت کی طرف سے ان کو عمر دراز ملی نواب قدسیہ بیگم (جو ولیہ صفت
اور درویش صفت عورت تھیں) نے جامع مسجد بھوپال کا سنگ بنیاد ان مادر زاد
ولی سے رکھوایا ان کی زندگی عالمانہ درویشانہ اور متوکلانہ رہی ہر سائل ہر ضرورتمند
کی حاجت روائی فرماتے وہ ایک متبع شریعت شیخ طریقت اور عالم فاضل بزرگ تھے
تصوف و حقائق میں ان کا پایہ بہت بلند تھا ایک مثنوی عناصر ضیار کے نام سے
مولانا روم کی مثنوی کے رنگ میں لکھی تھی جس پر شاہ عبد القادر اور شاہ رفیع الدین
کی تقریظات تھیں ۶ محرم ۱۲۵۱ھ ایک سو بیس کی عمر میں شاہ ولی اللہؒ کے
اس شاگرد رشید نے داعی اجل کو لبیک کہا اور وہ ٹیکری جو ان کی چلہ کشی کا
مرکز تھی وہیں ان کا مزار بنا نواب سلطان جہاں بیگم نے اپنے شوہر احمد علی خاں

(عرف سلطان دولا) کی عقیدت مندی کی بنا پر احمد آباد کے نام سے اس خطہ کو آباد کر دیا۔

مفتی الٰہی بخش کاندھلوی بھوپال میں

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی ذات جامع صفات ہمارے ملک میں سند الکل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ کا عمومی فیض شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے ذریعہ پھیلا۔ سراج الہند۔ شاہ عبد العزیز کا بھوپال سے خصوصی تعلق اس طرح سے ہے کہ جب دار السلطنت دہلی بخف علی شیعی کو توال کے ہاتھوں آپ کو طرح طرح کے مظالم کا شکار ہونا پڑا۔ تو اس وقت نواب حیات محمد خاں (نبیرہ سردار دوست محمد خاں) کے دیوان چھوٹے خاں نے حضرت شاہ صاحب کو بھوپال آنے کی دعوت دی اور بارہ ۱۲ ہزار کی جاگیر کی پیش کش کی۔ جب پر شاہ صاحبؒ نے معذوری ظاہر فرمائی ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحب جس انقلابی و اصلاحی دعوت کے امام و قائد تھے وہ دار السلطنت دہلی کو چھوڑ کر کیوں کر انجام پا سکتا تھا؟ اس لیے شاہ صاحب نے اپنے خصوصی شاگردوں کو پورے ملک میں پھیلا دیا تھا ولی اللہی دعوت کے مرکزوں میں سے ایک مرکز نجیب آباد بھی تھا۔ نواب نجیب الدولہ جو شاہ ولی اللہ کا مرید تھا۔ اس کے اور نواب حافظ الملک رحمت خاں۔ المتوفی ۱۱۸۸ھ کے ذریعہ شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو ۱۱۷۴ھ میں بلایا تھا۔ انھیں نجیب الدولہ دعوت ولی اللہی کو پھیلانے کے لیے ایک مدرسہ نجیب آباد میں قائم کیا تھا۔ جن کی علم دوستی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ جو شاہ صاحب نے فرمایا

"نزد نجیب الدولہ دولہ نہ صد ۹۰۰ عالم بود۔ ادنی پنج روپیہ و اعلیٰ پنج صد۔ روپیہ می یافت۔

(ملفوظات شاہ عبد العزیز ص ۸۱)

یعنی نجیب الدولہ دولہ کے یہاں نو سو ۹۰۰ عالم تھے جن کی تنخواہ ادنیٰ پانچ روپیہ سے

پانچ سو روپیہ تک تھی۔ اسی مدرسہ میں مفتی الٰہی بخش صاحب کو سراج الہند نے بھیجا تھا۔ جہاں ان کے فتاوئ اور فیصلے چلتے تھے۔ نواب نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد ۱۱۸۴ھ نواب ضابطہ خاں (جوان کا لڑکا تھا) کے دور میں حضرت مفتی صاحب کا سکہ ان دیار میں چلتا رہا۔ لیکن جب ۱۱۸۶ھ میں نواب کو شکست ہوئی۔ اور دعوت علم کا کارخانہ ہی درہم برہم ہوگیا تو ۱۲۰۵ھ میں مفتی صاحب دیوان چھوٹے خاں کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے حضرت مفتی صاحب کا نسب امام رازی کے واسطے سے صدیق اکبرؓ تک پہنچتا ہے ان کا خاندان ایک عرصہ سے علم و فضل کا خاندان تھا۔ ان کے جد امجد قطب الدین اور نانا شیخ محمد عالم فاضل لوگوں میں سے تھے ان کے والد شیخ اسلام کے دو صاحب زادے مفتی الٰہی بخش اور مولانا محمود بخش ہوئے۔ مؤخر الذکر کے صاحب زادے مولانا مظفر حسین المتوفی ۱۲۸۳ھ جو تقویٰ و طہارت اور اتباع سنت میں یکتائے روزگار تھے۔ مفتی صاحب کی ولادت ۱۱۶۳ھ کاندھلہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد تکمیل کے لیے حضرت سراج الہند کی صحبت، بابرکت میں دہلی پہنچے ایک مدت تک شاہ صاحبؒ سے ظاہری و باطنی تکمیل فرمائی پھر شاہ صاحب کے ایماء اولاً نجیب آباد پھر بھوپال کو اپنی دینی و علمی خدمات کا مرکز بنایا اور ایک عرصہ تک ان اجڑے دیار کو اپنے علمی و عملی کمالات سے معمور فرمایا۔

شیم الطیب فی ذکر فضائل کی تصنیف ۱۲۲۹ھ میں شہر بھوپال میں ہوئی۔ یہ ان ہی کی یادگار ہے دیوان چھوٹے خاں کے انتقال ۱۲۰۹ھ کے بعد ریاست خانہ جنگی اور پھر فرنگی سامراج کی۔ سیاسی ڈپلومیسی کی شکار ہو چکی تھی اس لیے حضرت مفتی صاحب اپنے وطن چلے گئے۔ اور اپنی علمی تصانیف سے ایک عالم کو فیضیاب کرتے رہے۔

حضرت مفتی صاحب کا ولی اللہی دعوت جہاد کے ساتھ تعلق کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ جب ۱۲۲۴ھ میں حضرت امیر سید احمد شہید نے شاہ عبدالعزیز

صاحب کے ایماء پر دوآبہ (شمالی یوپی) کا دورہ فرمایا تو حضرت مفتی صاحب نے شیخ طریقت ہونے کے باوجود ایک جواں سال، و باکمال اور مجاہد حضرت سید شہید سے تجدید بیعت فرمائی۔ حضرت مفتی صاحب نے ۱۲۴۵ھ میں کاندھلہ میں وفات پائی۔ ان کا پورا گھرانہ سراج الہند کے مخلصین پر مشتمل رہا۔ عربی فارسی میں تقریباً چالیس کتابیں یادگار چھوڑیں جس کے اندر خاتمہ مثنوی معنوی کی زیادہ شہرت ہوئی اور خاتم مثنوی کے لقب سے وہ مشہور ہوئے۔

شاہ رؤف احمد مجددی

حضرت سراج الہند کے براہ راست شاگردوں میں سے جن بزرگوں نے بھوپال کو اپنی تشریف آوری سے مشرف فرمایا ان میں شاہ رؤف احمد مجددی بھی ہیں جو خانوادۂ مجددیہ کے چشم و چراغ، عالم شریعت، شیخ طریقت، علوم ظاہری، معارف باطنی اور شعر و ادب کے ماہر استاد تھے وہ حضرت مجدد صاحب کے چھوٹے صاحبزادے شاہ محمد یحیٰی کی اولاد میں ہیں ان کے والد ماجد شاہ شعور احمد پہلے ہی انتقال کر چکے تھے اس لیے اپنے جد امجد شیخ محمد مستقیم کی آغوشِ عاطفت میں ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ سن ولادت ۱۲۰۱ھ ہے بچپن سے حضرت شاہ ابوسعید مجددی ولادت ۱۱۹۶ھ وفات ۱۲۴۹ھ یہ ان کے خالہ زاد بھائی تھے۔ رفیق درس اور شریک تعلیم و تربیت رہے ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ میں معقولات اور پھر مرکز العلوم دہلی میں جملہ علوم و فنون کی تکمیل فرمائی۔ حضرت سراج الہند سے سندِ حدیث حاصل کی اور شاہ غلام علی نقشبندی سے تکمیل باطنی کر کے خلافت حاصل کی اس سے پہلے رامپور میں حضرت شاہ درگاہی خلیفہ شیخ جمال اللہ سے تعلیم لی تھی پھر حضرت شاہ غلام علی نقشبندی اپنے مرشد کے حکم سے شہر بھوپال ۱۲۳۳ھ تشریف لاکر اپنا مرکزِ اصلاح و ہدایت بنایا۔ ولی اللہی دعوت کے اصول پر ارکان ریاست سے بے تعلق رہ کر عوام سے ربط و ضبط پیدا کیا خواص علماء

اور طالبان معرفت کی رجوعات حضرت کی طرف بے حد ہوئی میاں فوجدار محمد خاں اور میاں معز محمد خاں ان کے ہاتھ پر بعیت ہوئے جنھوں نے خانقاہ مجددیہ تعمیر کرائی ۔ جہاں مقامی و بیرونی تشنگان معرفت حاضر ہو کر اپنی اصلاح کرتے ۔ چنانچہ شاہ ابوسعید مجددی کی ہجرت ۱۲۹۶ھ کے بعد مقبولیت کے دروازے اور کھل گئے ۔ ہندوسندھ بلخ و بخارا تک کے لوگ آ کر حلقہ ارادت میں داخل ہوئے ۔ یہ خطہ جو اقتدار کے شور وشر اور فنون کا آماج گاہ بنا ہوا تھا ۔ حضرت صاحب کی توجہات سے تھوڑے ہی عرصہ میں ایمان و عرفان کی تجلی گاہ بن گیا ۔ حضرت صاحب کی شان استغنار و بے نیازی نے عوام کے ساتھ ارکان ریاست کے دلوں کو فتح کر لیا ۔ آخر میں جاذبۂ الٰہی نے ان کو اپنی طرف کھینچا زیارت حرمین شریفین کا مبارک عزم لے کر عازم سفر ہوئے اور یہی سفر سفرِ آخرت ثابت ہوا ۔ جب ان کا جہاز یمن کی بندرگاہِ لیث کے قریب پہنچا تو ۱۲۴۹ھ میں جہاز ہی میں انتقال فرمایا اور وہیں ان کا مزار بنا حضرت صاحب کے صاحبزادے شاہ خطیب احمد جو اپنے والد بزرگوار کے ہم کاب تھے ۔ بعد فراغتِ حج خانقاہ مجددیہ بھوپال رونق افروز ہو کر ارشاد و ہدایت میں لگ گئے اور اس سرچشمہ ہدایت سے روحانی فیض کا دریا جاری رہا ۔ آخر میں اس فرشتہ صورت و بزرگ سیرت درویش نے ۱۲۶۶ھ میں پیغام اجل کو لبیک کہا اور اپنے خلف و خلیفہ حضرت شاہ ابو احمد مجددی کو یادگار چھوڑا ۔ حضرت شاہ ابو احمد جو عالم و فاضل اور معرفت و روحانیت میں کامل بزرگ ہستی تھی جنھوں نے نہ صرف خانقاہ کو معمور و آباد رکھا ۔ بلکہ اس کی رونق میں چار چاند لگائے ۔ وہ حضرت صاحب ایک جدی بزرگ اور صاحب با اثر شخصیت تھیں ۔ نواب صدیق الحسن خاں سے ہمیشہ ان کی چشمک رہتی تھی مگر ہمیشہ حضرت صاحب ہی کا پلہ بھاری رہتا تھا ۔ حضرت صاحب اپنے بزرگوں کی شانِ استغنار کے ساتھ اپنے فیوض کو عام فرماتے ہوئے ۱۳۴۲ھ / ۱۹۲۳ء میں انتقال فرمایا ۔

اسی خاندان کی آخری یادگار شاہ محمد یعقوب مجددی ہوئے جن کی ذات

گرامی سے خانقاہ کو مزید رونق حاصل ہوئی۔ اور اصلاح وہدایت کا چشمہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ وہ شانِ جمالی کی حامل بزرگ ہستی ایک عرصہ تک ہمارے سروں پر سایہ فگن رہ کر اور اپنے فیوض و برکات کو پھیلاتے ہوئے ۱۹۷۱ء سنہ اپنے ہزاروں معتقدوں کو داغ مفارقت دے کر عالم آخرت کو سدھارے اس طرح سرزمین بھوپال مجددی فیوض و برکات کے ساتھ ولی اللہی دعوت و ارشاد سے دو صدی تک مستفید ہوتی رہی۔

منشی جمال الدین۔ مدار المہام بھوپال

جیسا کہ لکھا جا چکا ریاست بھوپال آغاز کار ہی سے ولی اللہی دعوت سے جُڑ چکی تھی۔ حضرت مفتی الٰہی بخش بھوپال سے جب ولی اللہی دعوت کے ایک مرکز نجیب آباد کو خیر باد کہا اور بھوپال کو اپنی تشریف آوری سے رونق بخشی تو گویا وہ مرکز وہاں سے اٹھ کر بھوپال آگیا۔ لیکن پنڈارہ گردی، مرہٹہ گردی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے معاہدات کے ذریعہ ریاستوں کی جکڑ بندی نے صورت حال کو بدل دیا۔ رسوائے عالم کمپنی کی سامراجی پالیسی نے ریاست کو پابندیوں کی زنجیروں میں باندھ دیا۔ امیر الدولہ بانی ریاست ٹونک جیسے بلند حوصلہ و شیر دل مجاہد کو ایک محدود کٹھرے میں بند کر دیا جس کی وجہ سے امیر سید شہید کو ان کی رفاقت سے الگ ہونا پڑا۔ غالباً ان ہی وجوہ سے مفتی الٰہی بخش نے بھی بھوپال کو الوداع کہا پھر ریاست جب نوابوں کے دور کے بعد بیگماتی عہد کی دہلیز تک پہنچی تو وہ اپنے رقبہ کے اعتبار سے مختصر اور زنگ اور نظم ونسق کے اعتبار سے کمزور ہو چکی تھی۔ نواب سکندر جہاں بیگم پہلی رئیسہ ہیں جنھوں نے ریاست کو قواعد و ضوابط کی ایک کڑی میں پرو دیا لیکن اسی کے ساتھ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ حکومتی امور میں نظم و انتظام اور ملکی انتظامات میں قاعدوں اور ضابطوں کی نفاذ پذیری ریاست کی سرسبزی اور خوشحالی اور

اندرونی ریاست دینی وتعلیمی ترقیات کا سہرا حضرت مدار المہام کے سر ہے۔
منشی جمال الدین صاحب مدار المہام شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کے صحبت یافتہ اور مولانا مملوک علیؒ اور سراج الہندؒ کے دوسرے شاگردوں سے فیض یاب ہوئے تھے۔ مدار المہام نے دہلی کے قریب موضع کوتانہ میں ۱۲۱۶ھ میں ایک خوش حال گھرانہ میں آنکھیں کھولیں لیکن والد ماجد کے انتقال کی وجہ سے اپنے والد کے شناسا کے بھائی کے یہاں دہلی میں آکر مقیم ہوگئے دہلی کے زوال پذیر معاشرہ کے گرداب میں پھنس کر لہو ولعب میں لگ گئے لیکن شاہ صاحبؒ کے وعظ میں پابندی سے شریک ہوتے رہے جب ان کے والد کے دوست کا سہارا نہ رہا تو غربت و پریشاں حالی کا شکار ہوئے۔ ایک ایک ساتھی نے منھ موڑ لیا اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا اس وقت شاہ عبد العزیزؒ نے دست گیری و رہنمائی فرمائی اور اس گندہ ماحول سے نکال کر پاکیزہ تعلیمی فضا میں پہنچا دیا جس سے ان کی زندگی کی کایا پلٹ ہوگئی اور ان کے جوہر فطرت سے جو ان کی طبیعت میں پنہاں تھا۔ نیکی وتقویٰ شعاری کی راہ پر لگا دیا۔ لیکن دہلی میں رہ کر کیا کرتے اس صورت حال نے دعوت سفر دی۔ اولاً اندور پہنچ کر ریزیڈنسی کی طوعاً وکرہاً ملازمت کی جو راس نہ آئی ان کے پاس مولانا سلام اللہ شاگرد شاہ رفیع الدین کے نام سے سفارشی خط تھا جو بھوپال میں اعلیٰ منصب پر فائز تھے اس کو لے کر بھوپال پہنچے۔ اولاً بیگم قدسیہ کے یہاں پھر سکندر جہاں بیگم کی خدمت میں درخواست۔ مولوی سلام اللہ صاحب کے اس سفارشی جملہ کے ساتھ تھی کہ یہ (مدار المہام) ایسی تلوار ہیں جن کی بھوپال سے لندن تک کوئی کاٹ نہ کر سکے گا۔ تیر نشانہ پر بیٹھا۔ ریاست میں معمولی ملازمت سے لے کر اعلیٰ عہدہ مدار المہامی تک ۱۲۶۸ھ میں پہنچ گئے ان کی نیکی و پرہیزگاری، رئیسہ کے ساتھ وفاداری، غیر معمولی دلیری ودلاوری، سخاوت وفیاضی اور اعلیٰ درجہ کی صلاحیت انتظامی نے ایک پسماندہ وغیر منتظم ریاست کو ترقی یافتہ حکومت میں تبدیل کر دیا۔

ولی اللٰہی دعوت کے پہلے مدبر و منتظم

ہمارے نزدیک مدار المہام وہ پہلے مدبر و منتظم عالم تھے جنھوں نے ریاست بھوپال کو ولی اللٰہی دعوت ارشاد کا باقاعدہ مرکز بنایا ولی اللٰہی دعوت کا پہلا اصول حکمت قرآنی کا عوام سے تعارف و روشناسی ہے۔ حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے قرآن کا ترجمہ فتح الرحمٰن کے نام سے کیا اور ان کے سچے جانشینوں شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبد القادرؒ نے اردو ترجمے فرمائے اور عام مسلمانوں میں فہم قرآنی کا دروازہ کھولا۔ شاہ عبد العزیزؒ نے فتح العزیز لکھی اور ہفتہ میں دو دن قرآنی تفسیر کا سلسلہ عوام کے لیے جاری فرمایا۔ شاہ صاحبؒ کی تفسیر کی مقبولیت نے دعوت ولی اللٰہی کو پورے ملک میں غیر شعوری طور پر پھیلا دیا چنانچہ مدار المہام صاحب نے بھی سب سے پہلے ترجمہ قرآن کا سلسلہ عوام میں شروع فرمایا اور خواص۔ خصوصاً ارکان ریاست میں بہ نفس نفیس قرآنی تعلیم جاری کی۔

جس طرح شیخ الاسلام مولانا عبد الحیؒ نے والد ماجد شاہ عبد القیومؒ (محدث بھوپال پر) لغات القرآن لکھ کر قرآن کے مشکل الفاظ کو یاد کرنے کے لیے آسان بنا دیا تھا اسی طرح مدار المہام صاحب نے بھی اس جیسی لغات قرآنی "الکوکب الدری" کے نام سے تصنیف فرمائی۔ خدا کی وہ کتاب جو انسانی زندگی کا ایک دستور العمل ہے اس کو تلاوت کتاب کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا اور ایک بند کتاب سمجھی جاتی تھی۔ الکوکب الدری کو ایک کنجی بنا کر عوام کے ہاتھ میں دیدی۔ اور ریاست میں قرآن فہمی کا مذاق پیدا کیا۔

مدار المہام صاحبؒ کا عظیم کارنامہ

بھوپال بلکہ کل ہندوستان کے لیے مدار المہامؒ کا یہ قابل فخر تاریخی کارنامہ یادگار زمانہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا فارسی ترجمہ

فتح الرحمٰن اور شاہ عبدالقادرؒ کی موضح القرآن اردو ترجمہ تفسیری نوٹ کے ساتھ طبع کرایا۔

چونکہ رؤسا بھوپال سرحد پٹھان تھے اور جو خاندان ان کے ساتھ آئے تھے ان کی اکثریت بھی پٹھانوں اور افغانوں پر مشتمل تھی اس لیے قرآن حکیم کا پشتو زبان میں ترجمہ کرایا اس سے بڑھ کر ان کا ایک خصوصی کارنامہ یہ ہے کہ جب وہ حج کے لیے گئے دیار مقدسہ پہنچے جہاں ترکی خلافت کا ہلالی پرچم لہرا رہا تھا تو ترکوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور صدیوں سے خادم حرمین شریفین ہونے کے باوجود ان کو حکمت قرآنی سے ناآشنا پایا تو ایک بہت بڑے ترکی عالم احمد عثمانیؒ سے نواب سکندر جہاں بیگم کو توجہ دلا کر قرآن کا ترکی زبان میں ترجمہ کرایا اور دوبارہ دارالخلافت قسطنطنیہ تک دعوت ولی اللہی کو پہنچانے کے لیے شاہ صاحبؒ کا فارسی ترجمہ فتح الرحمٰن کو مولانا ضمیر الدینؒ حیدرآبادی سے ترکی زبان میں منتقل کرایا اور ان تراجم کو پورے عالم اسلام میں ہدیتہً بھیجا۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ کی معرکتہ الآرا کتاب حجۃ اللہ البالغہ کو پہلی مرتبہ طبع کرا کر تمام عالم اسلام میں تحفتہً پیش کرنے کا شرف اسی بزرگوار شخصیت مدارالمہام کو حاصل ہے۔ ایسے ہی مخدوم علی مہائمی کی تفسیر تبصیر الرحمٰن کی طباعت کا فخر بھی ان کو حاصل ہے۔ اس لیے ہم نے مدارالمہام صاحبؒ کا تعارف ولی اللہی دعوت سے ایک عظیم رکن کی حیثیت سے کرایا ہے البتہ جب مدارالمہام صاحبؒ یمن اور حجاز پہنچے اور یمن کے علمی خاندان کے فرد قاضی زین العابدین کو اور بعد میں شیخ حسین عربؒ محدث بھوپال کو لے کر آئے تو اس دعوت کے ساتھ نجدی دعوت امام محمد ابن عبدالوہابؒ اور امام شوکانیؒ سے قریب ہو کر سلفی مسلک پر عمل پیرا ہوئے۔ یہ امر مخفی نہ رہے کہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب "تقویتہ الایمان" اور شیخ عبدالوہاب نجدی کی "کتاب التوحید" میں بنیادی امور کے اندر موافقت اور مشارکت پائی جاتی ہے لیکن شاہ شہیدؒ کا نقطہ نظر ان سے مختلف ہے وہ اپنے جد امجد شاہ ولی اللہؒ کے

پیرو کار ہیں حادثہ بالاکوٹ ۱۲۴۶ھ کے بعد ولی اللہی جماعت دو طبقوں میں بٹ گئی
(۱) مجاہدین سرحد میں مولانا ولایت علی صادق پوری نے جن کے معتقدین کی اکثریت
بہار اور بنگال میں تھی از سر نو بیعت جہاد لے کر دعوت کا کام شروع کر دیا تھا۔
یہ جماعت صادق پوری کہلاتی ہے۔ امیر شہید کی شہادت کے بعد یہ جماعت
ان کے دوبارہ ظہور کا عقیدہ رکھتی تھی۔ مولانا نذیر حسین اور نواب صدیق الحسن خاں
بھی اسی پارٹی سے تھے۔ دوسری دہلوی جماعت شاہ محمد اسحاق کو اپنا امام
مانتی تھی۔ بہر حال مدار المہام کا اعتماد دونوں جماعتوں پر یکساں تھا۔

ولی اللہی دعوت کے سلسلہ میں مدار المہام کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ
ولی اللہی اصول پر بھوپال میں انھوں نے ایک مدرسہ قائم فرمایا اس سے پہلے
یہاں کے علمار و فضلار مسجدوں اور اپنے گھروں میں تعلیم دیتے تھے جس طرح
دہلی میں شاہ صاحب کے والد بزرگوار نے مدرسہ رحیمیہ قائم کیا تھا جس کی مقبولیت
کی بنار پر محمد شاہ بادشاہ نے ایک مستقل عمارت دار البقا کے نام سے جامع مسجد
کے جنوب میں بنوائی تھی جس کے اندر شاہ صاحب کے خاندان کے لوگ شاہ
اسحاق صاحب درس دیتے رہے پھر حضرت مولانا مملوک علی کے شاگردوں
مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے ہاتھوں دوبارہ دیوبند
میں اسی مدرسہ کا احیار ہوا۔ اس سے پہلے بھوپال میں مدرسہ جمالیہ مدار المہام نے
قائم کیا تھا جو بعد میں نواب صدیق الحسن خاں کے مدرسہ صدیقیہ میں ضم ہو گیا
جس کی آخری یادگار برٹے باغ کے شمال کی جانب کا دروازہ اپنے بانیوں کی مرثیہ
خوانی کے لیے اب بھی کھڑا ہوا ہے۔ اس مدرسہ کے اندر دو سو بیرونی طلبہ درس
پاتے تھے جن کے وظائف اس دور میں پانچ ہزار پانچ سو روپیہ تھے اور ماہ رمضان
میں افطار و سحری وغیرہ کا باقاعدہ انتظام تھا۔

(مآثر صدیقی ص۱۰۱)

اس دعوتی و علمی و تبلیغی خدمت کے ساتھ مدار المہام صاحب نے باہر کے عالم

کامل فضلار کو دعوت دے کر بھوپال بلایا۔ یمن کے علمار حدیث کو خود لے کر آئے۔
چنانچہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے آخری شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی۔
صاحب منتہی الکلام اور حضرت شاہ صاحبؒ کے نواسے اور شاہ اسحاقؒ کے داماد
حضرت مولانا شاہ عبدالقیومؒ محدث بھوپال وغیرہ کی آمد سے ریاست ان کی
بدولت مشرف ہوئی۔ حضرت مدارالمہام صاحب دینی خدمات کو انجام دیتے ہوئے
اور راعی اور رعایا میں یکساں مقبولیت حاصل کر کے ۱۲۹۹ھ میں انتقال فرما کر پوری
ریاست کو سوگوار بنا کر چلے گئے۔

ملک المناظرین مولانا حیدر علی فیض آبادی

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ دہلوی کے آخری شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی
سکندر جہاں بیگم کی دعوت پر بھوپال تشریف لائے اور ان کی خواہش پر تفسیر
فتح العزیز کی تکمیل کا آغاز بھوپال میں کیا۔ چار پانچ پاروں کی تفسیر لکھنے پائے تھے
کہ حیدر آباد کی دعوت پر یہاں سے تشریف لے گئے مولانا حیدر علی کے پردادا
شیخ عبدالقادر دہلوی جو ایک شیخ و فاضل تھے دہلی چھوڑ کر فیض آباد پہنچے ان
کے صاحبزادے شیخ ذاکر اور ان کے پوتے شیخ محمد حسن یہ سب کے سب راہِ
معرفت کے پیش رو اور ان کاملین طریقت میں تھے۔ مولانا حیدر علیؒ
شیخ محمد حسن کے صاحبزادے ہیں ابتدائی تعلیم وطن میں شیعی علمار سے حاصل کر کے
مرکز العلوم دہلی پہنچے اور سراج الہند سے سند حاصل کی۔ شاہ رفیع الدین شاہ دہلوی
اور مولانا رشید الدین سے خصوصی استفادہ کیا۔ شیخ رشید الدین دہلوی کا رنگ
تحریر سراج الہند کا نمونہ اور تردید شیعیت میں اپنے استاذ کی نظیر تھے۔ وہی رنگ
مولانا حیدر علی کے حصے میں آیا۔ مولانا حیدر علی نے دہلی کے بعد رامپور و لکھنؤ کے
متعدد علمار سے بھی کسب فیض کیا اور نوجوانی ہی میں اپنی تصنیف و تالیف کی
بنا پر شہرت حاصل کر لی ولی اللہی حکمت کے شارح شاہ عبدالعزیزؒ نے بڑے

شاہ صاحب کے قرآنی حکمت کے اصول جو فتح الرحمٰن، الفوز الکبیر، خیر کثیر وغیرہ کتابوں میں خصوصی اصطلاحات کے پردہ میں چھپا دئے تھے جو عوام تو عوام خواص کی دست رس سے باہر تھے۔ سراج الہند نے فتح العزیز میں اول و آخر پاروں کی قرآنی تفسیر میں ان کو کھول دیا۔

ولی اللہی دعوت کا جب آغاز ہوا اس وقت مغلیہ سلطنت کا چراغ باد مخالفت کے جھونکوں سے ٹمٹمارہا تھا جس کے اندر اندرونی شیعہ و سنّی کی آویزش کو بڑا دخل تھا۔ اس لیے بڑے شاہ صاحبؒ نے ایک طرف ازالۃ الخفار اور سراج الہند نے تحفہ اثنا عشریہ تصنیف کر کے مخالفوں کو لاجواب کر دیا تھا لیکن فتنہ کا یہ شعلہ رہ رہ کر بھڑکتا تھا اس لیے شیخ رشید الدین صاحب اور ان کے خصوصی شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی نے اس سلسلہ میں ایک بڑا کتب خانہ ملت کے کاشانہ کو باد سموم سے بچانے کے لیے تیار کیا اور دوسری طرف فتح العزیز کی تکمیل کی۔ مولانا حیدر علی نے اپنی تصنیف کا رخ پھیر دیا۔ سکندر جہاں بیگم فتح العزیز کے اسلوب بیان، طریقہ تحقیق اور حسن استدلال کی دل سے عاشق تھیں اس لیے ان کی دلی تمنا تھی کہ اگر تفسیر اس رنگ میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو اسلام کی بڑی خدمت ہوگی ان کی نظر مولانا حیدر علی پر پڑی اور مولانا کو ۱۲۶۲ھ ۱۸۴۶ء میں پانچ سو روپیہ کا وظیفہ مقرر کر کے بھوپال بلایا۔ علمار کی ایک جماعت کو ان کی مدد کے لیے مقرر کیا۔ مولانا موصوف نے بھوپال کی سرزمین پر اس عظیم الشان کام کا آغاز فرمایا اور والمحصنات تک چار ضخیم جلدیں کر دیں۔ ابھی یہ عظیم کارنامہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا تھا کہ حیدر آباد کی طلبی پر بھوپال کو الوداع کہنا پڑا لیکن اس عظیم کام کو جس کا بھوپال میں آغاز کیا تھا حیدر آباد ورامپور و بنارس میں انجام تک پہنچا کر دم لیا۔ افسوس کہ وہ تفسیر شائع نہ ہو سکی۔ نواب محمد علی خاں والیٔ ٹونک کے کتب خانہ بنارس سے ٹونک منتقل ہو گئی۔ بھوپال کے چار تفسیری پارے ندوۃ العلمار کے کتب خانہ میں دئے گئے بہر حال مولانا حیدر علی حیدر آباد سے رامپور پہنچے اور

سنہ ۱۲۹۹ میں وہیں رحلت فرمائی مولانا کی تصانیف بے شمار ہیں جن میں زیادہ تر شیعیت کی تردید میں ہیں ان میں "التنبیہ لاہل الخوص لاعتراضہم علی حدیث الخوض" جس نے منتہی الکلام کے نام سے شہرت حاصل کی۔

حضرت مولانا شاہ عبدالقیوم صاحب محدث بھوپال

ریاست بھوپال کی مذہبی و دینی ترقی میں ولی اللہی سلسلہ کے علمار و فضلار کا آغاز ریاست سے ہاتھ رہا لیکن خود اس خاندان عالی کی کسی شخصیت کی تشریف آوری کا شرف اس حصہ کو نہ حاصل ہو سکا تھا ریاست کی خوش بختی و خوش نصیبی سے شاہ عبدالقیوم صاحبؒ کی تشریف آوری سے یہ شرف بھی حاصل ہو گیا شاہ عبدالقیوم حضرت سراج الہند کے نواسے اور حضرت شاہ اسحٰق کے داماد اور شیخ الاسلام مولانا عبدالحیی کے نور نظر تھے ان کے جد امجد مولانا شاہ نوراللہ حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہی کے خصوصی شاگردوں میں سے تھے جو حکمت ولی اللہی کے زبردست عالم اور خود سراج الہند کے استاد بھی تھے درسیات میں ان سے بڑھ کر کوئی ماہر اور حنفی فقہ میں ان سے بلند پایہ کوئی فقیہ نہ تھا۔

(ابجد العلوم صہ ۹۱۵ ج ۱)

مولانا شاہ عبدالقیوم سنہ ۱۲۳۱ء میں پیدا ہوئے سراج الہند نے غلام نقی تاریخی نام رکھا بچپن میں اپنے والد سے ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن کی سعادت حاصل کی پھر سب سے زیادہ فیض ظاہری و باطنی اپنے خسر شاہ محمد اسحٰق اور ان کے بھائی شاہ یعقوبؒ سے حاصل کیا اور خرقہ خلافت پایا بچپن میں سید احمد شہید سے تبرکاً بیعت کی تھی اور ان کی صحبت مبارک ابتدار سے انتہار تک رہی سید احمد شہید کے دورۂ اصلاح اور سفر حج سے لے کر معرکۂ بالاکوٹ تک رفاقت رہی اور ہمیشہ ان پر نگاہِ شفقت فرماتے رہے سانحۂ بالاکوٹ کے بعد پہلے ٹونک پھر حرمین شریفین چلے گئے واپسی پر سکندر جہاں بیگم نے مدارالمہام کے مشورہ پر قیام بھوپال کی دعوت دی اور کچھ

دلوں تک منصب افتاء کو زینت دی پھر آزادانہ درس حدیث کے خاندانی سلسلہ کو شہر بھوپال میں جاری فرمایا چنانچہ تشنگانِ حدیث سند عالی حاصل کرنے کے لیے ہند و بیرونِ ہند سے آکر اس چشمۂ صافی سے سیرآب ہوتے تھے۔ حسبِ روایاتِ خاندانی درس قرآن مسجد حقیقت خاں اور مسجد امراؤ دولہا میں ہفتہ میں دوبار دیتے تھے ہزارہا مخلوقِ خدا ان کے ظاہری و باطنی فیوض و برکات سے بہرہ مند ہوئی حضرت اسحٰق کی ہجرت کے بعد ان کی ذات مرجع خواص و عوام بن گئی جس نے بھوپال کو مرکز حدیث بنا دیا ریاستی ملازمت عہدۂ افتاء سے سبکدوشی کا لطیفہ یہ ہے کہ ایک بار عید کی نماز کا نظارہ کرنے کے لیے انگریز رزیڈنٹ نے بیگم صاحبہ سے خواہش کا اظہار کیا چنانچہ اس کے لیے سرکاری انتظام عمل میں آیا شاہ عبدالقیوم صاحب نمازِ عید کے لیے عیدہ گاہ پہنچے جب وقت مقررہ آپہنچا تو حضرت نے صف بندی کا اعلان کیا اس عرصہ میں بیگم صاحبہ کی طرف سے پیغام پہنچا کہ ابھی رزیڈنٹ بہادر نہیں پہنچے ہیں اس لیے کچھ دیر توقف کیا جائے مولانا نے فوراً کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کہ جس کو سکندر جہاں بیگم کی نماز پڑھنا ہو وہ انتظار کرے اور جس کو خدا کی نماز پڑھنا ہو وہ شریک نماز ہو جائے اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کر دی سرکاری حلقوں میں سناٹا چھا گیا لیکن ان کو کون روک سکتا تھا نماز ہو گئی لیکن مولانا کو عہدۂ افتاء سے سبکدوش کر دیا گیا مگر سابقہ احترام و اعزاز میں کوئی فرق نہ آنے دیا گیا ظاہر ہے کہ مولانا کے اس مجاہدانہ طرز عمل نے انگریز بہادر کے دل میں اس بات کو بٹھا دیا گیا ہو گا کہ رسی کے جل جانے کے بعد ابھی تک بل باقی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ عید گاہ پہنچنے میں تاخیر کسی آزمائش کی وجہ سے کی گئی ہو بہر حال رزیڈنٹ کی خفیہ ہدایت پر مولانا کو اس عہدہ سے الگ کر دیا گیا لیکن جس طرح امام مالکؒ کو حکومت کی طرف سے ہتھکڑیاں ان کے لیے مزید عزت کا باعث بنیں اسی طرح مولانا کے اس عمل سے عوام کے دلوں میں مزید عظمت کا نقش قائم ہو گیا۔ ملازمتی زنجیر ٹوٹ جانے کے بعد مولانا کا دریائے فیض اور جوش میں آگیا اور شبانہ

روز علم حدیث کا فیضان اور زیادہ ہوگیا پھر ۱۲۹۹ھ میں نواب محمد علی والیٔ ٹونک کی دعوت پر بنارس پہنچے جہاں وہ نظر بند تھے اور ان کو سند حدیث عطا فرما کر لکھنؤ سے ہوتے ہوئے وطن مالوف بڑھانہ پہنچے وہیں گھوڑے سے گر کر انتقال فرمایا اور ان کا مولد ہی مدفن بنا۔

مولانا محمد یوسف صدر مجلس علمائے بھوپال

مولانا محمد یوسف شاہ عبدالقیوم کے صاحبزادے ہیں اپنے پدر بزرگوار اور قاضی محمد ایوب صاحب سے تحصیل علم فرمائی ابھی درجہ تکمیل تک نہ پہنچنے پائے تھے کہ والد ماجد کا سایہ رحمت سر سے اٹھ گیا اس لیے مرکز العلوم دہلی پہنچ کر محبوب علی دہلوی مولانا مملوک علی مفتی صدرالدین دہلوی سے معقول و منقول کی اپنی تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا سفر حرمین شریفین میں شاہ محمد یعقوب برادر شاہ محمد اسحٰق دہلوی سے خلافت حاصل کر کے ریاست کو ظاہری و باطنی فیوض پھیلانے میں سرگرم ہوگئے۔

مجلس علمائے بھوپال کے وہ پہلے صدر ہیں حنفی و سلفی مذہب کے تمام علماء ان کی طرف رجوع کرتے تھے آخر ۱۳۸۵ء میں وفات پا کر خطہ صالحین بھوپال میں دفن ہوئے۔

مولانا محمد اسماعیل

حضرت شاہ عبدالقیوم کے دوسرے صاحبزادے مولوی محمد ابراہیم کے بیٹے مولانا محمد اسماعیل ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے عم محترم مولانا محمد یوسف سے تکمیل علوم فرمائی اور ان کے داماد ہوئے اور اپنے خاندانی طریقہ کے مطابق تعلیمی سلسلہ کو ریاست میں جاری فرمایا لیکن ابھی فصل جوانی کی بہار بھی پوری طرح نہ دیکھنے پائے تھے کہ دیار حبیب مکہ معظمہ میں ۱۳۳۰ھ میں داعیٔ اجل کو

بیک کہا اور ایک صاحب زادہ حاجی احمد صاحب کو یادگار چھوڑا جو اب تک ۱۴۰۴ھ قید حیات ہیں غرض مولانا شاہ عبدالقیوم کا خاندان بھوپال میں ابھی تک موجود ہے آپ کے معنوی فرزندوں یعنی شاگردوں کا وسیع سلسلہ ہے آپ کے عزیز قریب قاضی مفتی محمد ایوبؒ پھلتی ہوئے جن کا تذکرہ آرہا ہے۔

مولانا اظہر علی مظہر صادق پوری

دعوت ولی اللہی کی عملی تحریک کا آغاز اس وقت ہوا جبکہ سراج الہند نے ولی اللہی اصول پر ایک جماعت یا پارٹی کی تشکیل دی اور امیر سید احمد شہید کو دعوت جہاد کا امیر بنا کر اولاً تو دوآبہ (شمالی یوپی) پھر بہار بنگال کے دعوتی و اصلاحی دورے کے لیے بھیجا سفر حج سے واپسی کے بعد سید امیر شہید نے جہاد کا مرکز آزاد سرحد (استھانہ اور اسمت) کو بنایا معرکۂ بالاکوٹ ۱۸۳۱ء میں امیر شہید کی شہادت پر اس تحریک کا پہلا دور ختم ہوا لیکن دعوت جہاد کا سلسلہ امیر شہید کے ارباب عزیمت مریدوں نے نہ صرف قائم و برقرار رکھا بلکہ کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک اس کو پھیلا دیا۔

مولانا ولایت علی عظیم آباد کے محلہ صادق پور کے مجاہدین کے سرخیل اور سربراہ ہیں جو سید احمد شہید کے مخلص مریدین میں سے تھے رئیسانہ ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن سید شہید کی امارت کے بعد فقیری اختیار کی انھوں نے یاغستان (آزاد سرحد) کو مرکز بنا کر جہاد کے سلسلے کو ان کے بھائی مولانا عنایت علی، شاہ احمد حسین اور ان کے بعد مولانا احمد اللہ اور مولانا یحییٰ علی اس دعوت کے ارکان تھے فرنگی سامراج کی دہشت ناک کامیابی ۵۷ء کے بعد ان سرحدی مجاہدین اور ان کے مخلص معاونین پر رسوائے عالم مقدمات بغاوت قائم کر کے ہزاروں کو دار پر لٹکایا اور ہزاروں کو کالے پانی بھیج کر دوامی قید و بند میں مبتلا کیا ان بزرگوں کے جاں گسل امتحانات اور صبر و استقامت کی ایک طویل داستان ہے

جو تاریخ آزادی ہند کا جھومر ہے لیکن ان عظیم قربانیوں اور راہ حق میں جاں نثاریوں کو ہماری تاریخ آزادی کے صفحات میں کہیں بھی جگہ نہ مل سکی بہرحال اس روشن اور رنگین داستان کا عنوان علما، صادق پور ہے جن کی مجاہدانہ کارروائیوں سے حکومت برطانیہ اس قدر مغلوب الغضب اور غصّہ سے بے قابو ہوئی کہ پورا محلہ صادق پور برباد و مسمار کر دیا بلکہ مہدی سوڈانی کے مزار کی طرح ان کے خاندان کی قبروں کو بھی کھدوا کر پھینک دیا ریاست بھوپال اس خاندان کے ایک فرد مولانا اظہر علی مظہر کی قیام گاہ بنی ایک عرصہ تک انھوں نے اس خطہ کو اپنے فیوض و برکات سے منور فرمایا۔

مولانا فرحت علی جنھیں فرحت حسین بھی کہا جاتا تھا مولانا ولایت علیؒ کے سب سے چھوٹے بھائی تھے اور چھوٹے حضرت کہلاتے تھے بڑے حضرت (مولانا ولایت علی) جب کبھی مرکز صادق پور سے باہر جاتے تو ان کو اپنا قائم مقام بناتے پھر وہ سرحد آزاد چلے گئے تو جماعت کی قیادت مستقلاً ان کے سپرد کر دی گئی۔ بڑے زاہد و عابد اور خطیب تھے۔ فنون حرب میں بھی خوب مہارت رکھتے تھے۔ اعلیٰ گھوڑ سوار، عمدہ کپتان چی، اڑتی چڑیا کو بھی مار گراتے، زبردست پیراک۔ الغرض ظاہری و باطنی اوصاف کے جلیل و جمیل پیکر تھے۔ سات برس تک جماعت کی قیادت کی اڑتالیس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ مولانا عبدالرحیم اسیر انڈمان بھی انھیں کے صاحبزادے تھے۔

مولانا کے دوسرے صاحبزادے مولانا اظہر علی ۱۲۱۶ھ میں اپنے وطن عظیم آباد میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد بنارس و لکھنؤ میں مزید تعلیم حاصل کی سند حدیث کے لیے حضرت شاہ محمد اسحٰق کی خدمت میں دہلی حاضر ہوئے صحاحِ ستہ کا درس لے کر اجازت حاصل کی اور شاہ صاحبؒ کے ہاتھ پر بیعت ہو کر خلافت پائی بعد فراغت تحریک جہاد میں حصہ لیا پھر بھوپال تشریف لا کر سلک ملازمت میں منسلک ہو کر منصبی خدمات سے ساتھ اصلاح و ارشاد کے ذریعہ بھٹکے ہوئے لوگوں

کو سیدھے راستے پر لگا رہے رسوم و بدعات کی بیخکنی فرمائی قدسیہ بیگم کے زمانے میں
ان کی آمد ہوئی نواب جہانگیر محمد خاں نے ان کی قدر شناسی فرمائی اور ان کو اپنے
عہد حکومت میں غیرت گنج محل پور گڑھی کا عامل مقرر کیا ان کے حسنِ انتظام سے
راعی و رعایا دونوں خوش رہے پیر سید معصوم قادری کی ہمشیرہ نجف خاتون سے
نکاح ہوا پھر ۱۸۵۷ء کے بعد ریاست کی ملازمت سے سبکدوش کر دئے گئے کیونکہ
وہ حضرت سید شہیدؒ کے خلیفہ و مجاز تھے اس لیے طریقہ محمدیہؐ پر بیعت لیتے تھے
ریاست کورواۓ پٹھاری میں حلقہ ارادت وسیع ہوا پھر جناب غلام قادر (برادر
منشی حسین خاں) رئیس ساگر کے ہمراہ حج فرمایا اور مریدین کے اصرار پر بھوپال
واپس ہو کر اصلاح و ہدایت میں لگ گئے نواب شاہجہاں بیگم نے ان کا منصب
مقرر فرمایا آخر وہ مرد مجاہد جس کو معرکۂ بالاکوٹ میں شہدا کی ہمرکابی کا شرف
حاصل ہوا اور باغ سید سلطان میں چھولہ روڑ میں دفن ہوئے

مولوی یعقوب علی خاں بانس بریلی

مولوی یعقوب علی خاں بانس بریلی کے رئیسوں میں سے تھے اپنے مقامی اربابِ
علم و فضل سے تحصیل علمی کر کے شاہ محمد اسحٰق محدث دہلویؒ سے سند حدیث حاصل کی پھر
اپنے وطن واپس ہو کر تعلیمی سلسلہ کو جاری کیا۔ نواب شاہجہاں بیگم نے ان کی تعلیمی
انتظامی صلاحیت کی شہرت کو سن کر ۱۳۰۱ء میں بھوپال مدعو کیا اور محکمۂ عدالت کا
مشہر مقرر فرمایا اس وقت جملہ عدالتی فیصلے شرع شریف کے احکام کے مطابق
ہوتے تھے مولوی صاحبؒ کی نیکی و پرہیزگاری اور تقویٰ شعاری کا یہ عالم تھا کہ انھوں
نے کبھی سودی ڈگری پر دستخط نہیں کیے۔ مشہور ادیب و شاعر امجد علی اشہری کو ایسے مقدمات
سپرد کیے جاتے تھے ۱۳۰۲ء میں صدر المہام ریاست ہوئے آخر میں ۱۳۰۵ء میں کرنل
وارڈ کے زمانے میں ان کو صدر الصدور بنانا چاہا لیکن مستعفی ہو کر چلے گئے مولوی صاحب
اپنے استاد شاہ اسحٰق کے تقویٰ و طہارت میں نمونہ تھے وطن پہنچ کر وہی تعلیمی مشاغل
اختیار فرمائے اور وہیں انتقال فرمایا۔

تحریک شیخ الہند اور بھوپال

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن محدث دارالعلوم دیوبند کی تحریکِ جہاد ولی اللّٰہی تحریک کی آخری کڑی ہے جس کو حضرت شیخ نے برطانوی سامراج کے کامل تسلط اور غلبہ اور پورے ملک پر اقتدار حاصل ہو جانے کی وجہ سے ایسی راز داری سے جاری فرمایا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی ۔ شیخ نے اپنے بزرگوں کی طرح اپنے آپ کو گوشۂ گمنامی میں رکھا اس لئے کہ شیخ ارباب سیاست سے نہ تھے بلکہ وہ اہل دیانت میں سے تھے۔ ارباب سیاست کا طرۂ امتیاز کام برائے نام ہے لیکن سچے دیندار حضرات اپنے دامن عمل کو شہرت و نام و آوری کے داغ دھبے سے پاک و صاف رکھتے ہیں ان کا ہر عمل خدا کے واسطے اور ہر کام رضائے الٰہی کے لئے ہوتا ہے چونکہ ریاست بھوپال شروع ہی سے ولی اللّٰہی تحریک دعوت کا مرکز بن چکی تھی۔ اس لئے شیخ الہند کی اس دعوت جہاد کا بھی بھوپال سے خاص تعلق رہا۔ منشی جمال الدین مدار المہام کے استاد مولانا مملوک علی تھے اس لئے ان کی خواہش تھی کہ ان کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین مدرسہ دیوبند کو ریاست میں گراں قدر مشاہرے پر بلائیں مگر مولانا نے انکار کیا اور مولانا خلیل احمد سہارنپوری ۱۲۹۲ء میں مدار المہام کے اصرار پر بھوپال آئے لیکن چند ماہ رہ کر حج کو چلے گئے (تاریخ دارالعلوم ص۳۲)

البتہ حضرت سید احمد دہلوی جو مولانا یعقوبؒ کے بعد دارالعلوم کے صدر ہوئے وہ عہد شاہ جہانی میں بھوپال آئے نواب صدیق حسن خان کی تحریک جہاد کی ناکامی اور خود نواب صاحب معزولی سے سارا معاملہ ٹھنڈا پڑ چکا تھا اس لئے وہ درس وتدریس کا ہنگامہ برپا کئے رہے۔ پھر دور سلطانی ۱۹۱۹ء میں امام نانوتوی کے شاگرد رشید نواب قاضی محی الدین خاں ریاست کے قاضی بن کر تشریف لائے جو حضرت شیخ الہند کے معتمد و ندیم اور اس تحریک کے پونے راز دار تھے قاضی صاحب ہی کے واسطے سے والیۂ بھوپال سلطان جہاں بیگم قطب عالم مولانا رشید احمد گنگوہی کی مرید ہوئی تھیں۔ (تذکرۃ الرشید)

پھر ان کے چلے جانے کے بعد مولانا گنگوہی کے چہیتے شاگرد قاضی محمد حسنؒ مرادآبادی سرکار عالیہ کی خواہش پر بھوپال تشریف لائے اور مہتمم مدرسہ وقفیہ وغیرہ ہوئے پھر قاضی یحیٰ صاحب کے انتقال کے بعد قاضی ریاست ہوئے حضرت الاستاد قاضی محمد حسن صاحب مرحوم کے بعد قاضی سید سلیمان ندوی قاضی القضاہ بھوپال ہوکر آئے اور ختم ریاست تک وہی قاضی رہے یہ ہر دو بزرگ بھی تحریک شیخ الہند کے اہم ارکان تھے (ریشمی رپورٹ)

جب شیخ الہند نے اس تحریک کے معتمد خصوصی مولانا عبیداللہ سندھی کو دہلی بھیجکر نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کرایا تو اس کے مصارف کے لئے دو بار بھوپال سے دو سو روپے ماہانہ امداد مقرر ہوئی (شیخ تحریک شیخ الہند ص۷۵)

پھر شیخ الہند کی اس تحریک سے بھوپال کا رشتہ اس وقت اور مضبوط اور مستحکم ہوگیا جب کہ بھوپال کی بین الاقوامی شخصیت مولانا برکت اللہ بھوپالی نے تحریک سے اشتراک فرمایا جس کی تفصیل باب دوم سوانح میں آرہی ہے۔

تحریک شیخ الہند کا موقف

اس سے پہلے کہ تحریک شیخ الہند کا تعارف اور بھوپال سے اس کے تعلق کو

معرض بیان میں لایا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک پر برطانوی سامراج کی قہرمانی سے قصداً جو پردہ ڈال دیا گیا تھا عوام تو کیا خواص کے سامنے تک اس کی تفصیلات نہ لائی گئی تھیں ان کا پردہ اٹھا دیا جائے۔ اور اس سے پہلے کہ اس تحریک کے چہرے سے پردہ اٹھایا جائے اس کے موقف کو واضح کرنا نہایت ضروری ہے جیسا کہ آئندہ کی تفصیل سے معلوم ہوگا کہ اس تحریک کا آغاز ۱۸۷۶ء ۱۲۹۹ھ امام نانوتوی کی زندگی ہی میں پردۂ راز میں کر دیا گیا تھا اس لئے کہ ۱۸۵۷ء کی برطانوی سامراج کی بربریت وسفاکی و پرتشدد خونریزی سے پورا ملک سہما ہوا تھا۔ مشہور ہے کہ دیوبند کے ایک بزرگ تہجد کے وقت برطانوی حکومت پر بددعا کے لئے اس وقت ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ جب تک گھر کی کھڑکی سے چاروں طرف دیکھ نہ لیتے اور یہ یقین نہ کر لیتے تھے کہ اس اندھیرے میں کوئی موجود تو نہیں ہے۔ دارالعلوم دیوبند اپنے عہد افتتاح ہی سے ہند و بیرون ہند طلباء کا گہوارہ بن گیا تھا۔ آزاد سرحد یاغستان، افغانستان بلخ و بخارا تک کے تشنگان علوم و فنون اس چشمہ علم سے سیراب ہونے کے لئے جوق در جوق آنے لگے تھے۔ شیخ کی چشم انتخاب ان طلباء کو اپنی رازداری کے لئے چھانٹ لیتی تھی جن کے اندر سیاسی فہم و فراست اور اس وقت کی سیاست سے مناسبت معلوم ہوتی پھر ان کے اندر روح جہاد پھونکتے اور اپنے مقام پر بعد فراغت دینی درسگاہ قائم کرنے کی دعوت دیتے اور برابر رابطہ قائم رکھتے اور وقتاً فوقتاً ہدایات جاری فرماتے۔ آزاد سرحد کا علاقہ شیخ کی توجہات کا خصوصی مرکز تھا اس لئے کہ بقول حضرت مدنی اس علاقہ کے اندر ابھی تک جوش جہاد کا ولولہ زندہ تھا۔ اس لئے حضرت شیخ نے اس دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کیا۔ یہ طویل المیعاد منصوبہ بیسوی صدی کے پہلی دہائی تک وسعت پذیر ہوتا رہا حضرت شیخ افغانستان و ایران و ترکی خلافت سے رابطہ قائم کر کے ایک مسلح انقلاب سے اپنے ملک کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ شیخ کی ان سیاسی سرگرمیوں کی

نوعیت اسی طرح کی تھی جو مشہور قومی نیتا سبھاش چندر بوس نے ۱۹۴۲ء میں
جاپان و جرمنی کی امداد سے ہندوستان کو آزاد کرنے کے لئے اختیار کی تھی۔
چونکہ برطانوی سامراج کی جابرانہ قوت اور فولادی نظام کی بنا پر اندرونی
بغاوت کا منصوبہ ملک میں سخت خونریزی و تباہی کا باعث ہوتا جس کے
ہولناک نتائج سے ملک گذر چکا تھا اس لئے بیرونی آزادی پسند طاقتوں کے
امداد کے بغیر کوئی منصوبہ تکمیل پذیر نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے جس طرح
نیتا جی نے ۱۹۴۲ء کی عالمگیر جنگ کے دوران ہندوستان کی سرحد امپھال
کو اپنا مرکز بنا کر آزادی کا منصوبہ تیار کیا تھا اسی طرح جنگ عظیم کے موقع پر
حضرت شیخ نے اس جیسا پروگرام بنایا مگر ملک کی بدقسمتی سے دونوں جنگوں
میں برطانوی سامراج فتح یاب ہوکر ابھرا اس لئے ہندوستان کو اپنی قسمت
کے فیصلے کے لئے مزید امتحانی مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ بہر حال شیخ کی یہ تحریک
جہاد ولی اللہی تحریک کی آخری کڑی تھی۔ جس کی ضروری تفصیل پیش
کی جارہی ہے۔

ریشمی سازش کی حقیقت

شیخ الہند کی تحریک آزادی کو فرنگی سامراج نے ریشمی سازش کا نام دیا
ہے جس نے ہندستان اور ایشیا کے آزاد ملکوں اور ان کی مال و دولت پر منظم
سازشوں کے ذریعہ غیر مہذبوں کو مہذب بنانے کے پردے میں غاصبانہ قبضہ
کیا ہے اور جس تہذیب کو مغرب نے مشرق میں درآمد کیا ہے اس نے انسانیت
کی روحانی و اخلاقی اقدار کو ملیا میٹ کرکے پوری دنیا کو بدامنی اور بے ایمانی
کا گہوارہ جنگ وجدل دغل فصل کا ٹھکانا بنا دیا ہے۔ اس مادی تہذیب نے
سچائی راست بازی، ایثار پسندی انسانی ہمدردی اور اعتماد باہمی کی ابدی و
روحانی قدروں کو جڑ سے اکھیڑ پھینکا ہے۔

خود غرضی و مفاد پرستی جو اس مادی تمدن کی جڑ بنیاد ہے اس نے انسان کو اس کی عظمت و بلندی کی چوٹیوں سے ڈھکیل کر حیوانیت کی پستیوں میں لا کھڑا کیا ہے۔ فرنگی تہذیب جن مکاریوں عیاریوں اور سازشوں کے ہاتھوں آگے بڑھی وہ تاریخ کا زبردست المیہ ہے لیکن تعجب اس پر ہے کہ جو حکومت خود سازشوں کے بل بوتے پر ہمارے سروں پر مسلط ہوئی ہے وہ ایک پاکباز جماعت کے پیشوائے روحانی کی تحریک جہاد کو ڈھٹائی سے سازش کا گھناونا نام دے رہی ہے۔

تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

بہر حال استاذ الاستاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ (جس کی طرف اس ننگ وجود کو نسبت کرتے ہوئے شرم ہوتی ہے) وہ قطب زمانہ متبحر عالم محدث وقت اور شریعت و طریقت کے پیشوا تھے جن کی پوری زندگی قال اللہ و قال الرسول میں بسر ہوئی وہ بسم اللہ کے گنبد سے زندگی کے آخری دور کو چھوڑ کر کبھی باہر نہیں آئے۔ وہ قدماء یعنی پرانے زمانے کے علماء ربانی کی آخری نشانی تھی جنھوں نے جلوت و خلوت تنہائی و محفل آرائی میں مخلوق خدا کی تعلیم و تربیت کے سوا اقتدار و شہرت نام و نمود سے کوئی سروکار نہیں رکھا نہ انھوں نے تاریخ یورپ کو ہاتھ لگایا نہ انقلاب فرانس و انگلستان کا مطالعہ کیا نہ سرسید کی طرح لندن کی سیر کی اور فرنگی قوم کو قریب سے دیکھا نہ اپنے دوسرے ہمعصروں مولانا حالی و شبلی کی طرح مغربی علوم و فنون سے شناسائی حاصل کی نہ ارباب سیاست سے تعلق رکھا اور نہ اس مقدس ہستی کا انگریزوں کی پُر فریب پالیسی اور مکارانہ ڈپلومیسی سے کوئی واسطہ رہا اس لئے بقول مولانا محمد میاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس صوفی صافی صلح کل درویش سچے عاشقِ خدا نے خارزار سیاست میں کیوں قدم رکھا جہاں ہر ہر قدم پر اس دشمن کا ہر کانٹا اپنی پیاس بجھانے کے لئے

ایک آبلہ پا کی راہ تک رہا تھا۔ ؎

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
ایک آبلہ پا وادی پرخوار میں آئے

جس وقت حضرت شیخ نے اس کانٹوں بھرے میدان میں قدم رکھا وہ وحشت و بربریت کا دور تھا جب کہ برطانوی سامراج کے قائم کردہ دار و رسن کے تختے دہلی، میرٹھ اور تھانہ بھون کی سڑکوں بازاروں میں لٹکے ہوئے تھے معرکہ ۱۸۵۷ء کی دار و گیر دیکڑ دھکڑ، کا ہنگامہ ابھی تازہ تازہ تھا دار السلطنت دہلی کا خونی دروازہ ہزارہا معصوم و بے گناہ شہیدوں کا خون پکار پکار کر انگریزوں کی سفاکی و سنگ دلی کی شہادت دے رہا تھا۔ جہاد حریت ۱۸۵۷ء میں ہزارہا خاندانوں کی خانماں بربادی اور برطانوی سامراج کی لرزہ خیز ظلم و ستم رانی کے واقعات پر پورا ملک چپ سادھے ہوئے بیٹھا ہوا تھا نامی گرامی ہندوستان کے بہادر سپوتوں کو موت کے آغوش میں سلادیا گیا تھا ان حالات کو دیکھ کر بڑے بڑے بہادروں کے پتے پانی ہو گئے تھے۔ ملک کی فضاء میں ہو حق کا عالم تھا اس وقت برطانوی سامراج سے معرکہ آرائی کا تصور کسی کے حاشیۂ خیال تک میں نہ آسکتا تھا لیکن پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ وہ خاموش مرد حق اس نازک و خطرناک دور میں انقلاب کے میدان میں کود پڑا۔ اور جہاں ہندوستان کے میدان سیاست کے شہ سواروں کے قدم بھی نہ پہونچ سکے تھے شیخ الہند نے پہلے ہی ان میدانوں کو پامال کیا کامیابی و ناکامی تو کسی اور کے ہاتھ میں ہے لیکن دلِ ناتوان کے مقابلے سے انکار نہیں کیا جاسکتا یہ سوالات ارباب سیاست کے دلوں میں کانٹا بن کر کھٹکتے رہتے ہیں۔

علماء کا سیاست سے کیا واسطہ

ان سوالات سے بڑھ کر ایک اور اہم اور ضروری سوال مزید پیدا ہوتا ہے

کہ علماء جو روحانی پیشوا، اور انسانی اخلاق کے معلم و مربی ہیں ان کو سیاست کے گندہ نالے یا گھناؤنے ماحول میں اترنے کی کیا ضرورت ہے جب کہ موجودہ دور میں مذہب کو ایک مسئلہ اور پرائیوٹ معاملہ قرار دیدیا گیا ہے اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ضروری ہے کہ اس امر پر روشنی ڈالی جائے کہ مذہب و اخلاق کا سیاست کیا تعلق ہے ان دونوں کا ایک دوسرے سے ربط بھی ہے یا زندگی کے الگ الگ دھارے ہیں جو اپنے اپنے میدانوں میں بہہ رہے ہیں۔

سب سے پہلے اس مسلمہ حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ حیاتِ انسانی جو حیاتِ اجتماعی کا دوسرا نام ہے اس کا قافلہ نظم و تنظیم کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا کیوں کہ انسان بقول فلاسفہ مدنی الطبع ہے اس لئے اجتماعی زندگی حقوق و فرائض کی ادائیگی کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔

حقوق و فرائض کا پہچاننا علمی سیاست اور ان حقوق و فرائض کو عملی زندگی میں بروئے کار لانے کا نام عملی سیاست ہے اب ہم افلاطون و ارسطو کے بعد سیاست کے بابائے آدم ابو نصر فارابی (جن کو معلم ثانی کا لقب دیا گیا ہے) کی کتاب آراء المدنیۃ الفاضلہ کا ایک اقتباس اپنے لفظوں میں پیش کرتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ حیاتِ انسانی کے لئے نظم و تنظیم ضروری ہے جس کو سیاست کہا جاتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں (۱) سیاست فاضلہ (۲) سیاست فاسقہ۔

سیاست فاضلہ اس سیاست کا نام ہے جو قوم و ملک کو نظم و ضبط کی لڑی میں پرو کر الفت و محبت پریم اور پیار کے ساتھ حکومت کو دعوت دے البتہ شر پسند عناصر کے لئے سزا کا تازیانہ ضروری ہے۔ سیاست فاضلہ انسانوں میں اتحاد باہمی حقوق شناسی باہمی تعلقات کی سازگاری کے ذریعہ تشکیل پاتی اور لوگوں میں الفت و رواداری اور باہمی خوش گواری پیدا کرتی ہے اس کے مدمقابل سیاست فاسقہ (ناپاک سیاست) انسانوں

کے نفاق وافتراق ایک دوسرے میں، پھوٹ اور شقاق پیدا کر کے باشندگانِ ملک کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر اور کبھی ایک گروہ اور کبھی دوسرے گروہ کو آگے بڑھا کر خود آگے بڑھتی ہے یہی وہ سامراج ہے جس کا پودا مغرب میں اُگا بڑھا اور پھلا پھولا پھر اس کے کڑوے پھلوں نے تمام انسانوں کو تلخ کام بنا دیا۔

اہل مشرق جو ہمیشہ سے مذہب یا دھرم کے شیدا رہے ہیں وہ بڑے زمانے تک اس زہریلی سیاست سے دامن کش رہے مگر مغرب (یوروپ) نے اس کو خوب فروغ دیا اور اٹلی کے رسوائے عالم مصنف میکیاویلی نے سیاستِ فاسقہ کے جواز کو مثبت انداز میں پیش کیا اس نے اپنی کتاب میں اقتدار پسندانہ سیاست کے لئے اخلاقی قدروں کا انکار کیا سیاست کے لئے سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ قرار دیکر انسانی ابدی قدروں کو اضافی ٹھہرایا۔ چنانچہ ان قدروں کو اقتدار پسندی کے پاؤں سے کچل دیا گیا برطانوی سامراج جس کی بدترین مثال ہے جس نے اولاً تو یہاں کے باشندوں کو ناخواندہ و جاہل بنانے کی اسکیم تیار کی پھر جب اس کے مضر اثرات ۱۹۵۷ء کی بغاوت میں محسوس کئے گئے تو اپنی تعلیمی پالیسی بدلی اور ایسی تعلیم جاری کی جس کے اندر فرقہ پرستی کا زہر شامل تھا شروع میں برادرانِ وطن (ہندوؤں) کو آگے بڑھانے اور مسلمانوں کو پیچھے ڈھکیلنے کی پالیسی اپنائی پھر جب کچھ عرصہ میں مسلمان تعلیمی میدان میں پسماندہ بنا دیئے گئے اور برادرانِ وطن آگے بڑھ گئے تو اب سامراج نے مسلمانوں کے سروں پر اپنا دستِ شفقت پھیرنا شروع کیا اور ان کو ہندوؤں سے بھڑانے کی پالیسی تیار کی تاکہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی شیطانی پالیسی سے برطانوی سامراج کا قلعہ قائم رہے۔ غرض انگریزوں نے دشمن بن کر تو مسلمانوں کو نقصان پہونچایا ہی تھا دوست بن کر بھی ان کو گہرے گڈھے میں اتار دیا فرنگی سامراج مسلمانوں نے ہر موقع پر

دشمن نمبرایک قرار دیکر کبھی معاف نہیں کیا بہر حال برطانوی سامراج کی یہ پالیسی (جو سیاست کے نام سے ہندوستان میں نافذ کی گئی تھی) براہِ راست مذہب و اخلاق سے ٹکراتی تھی اگر اس پالیسی کو تسلیم کر لیا جائے اور عملی زندگی میں اس کو جاری کرنے کی اجازت دیدی جائے تو دنیا فتنہ و فساد کا گھر اور ہر ملک خون و خرابہ کا ٹھکانہ بن کر رہ جائے گا جیسا کہ اس وقت ہے اس لئے کوئی بھی مذہبی روحانی ہمدردِ خلق شخصیت اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتی ولی اللہی دعوت کے امام ہونے کے لحاظ سے حضرت شیخ الہند نے برطانوی سامراج سے ٹکر لینے کا وہی راستہ اختیار کیا جو ان کے اکابر کا تھا اور ان کو مجبوراً خارزار سیاست میں کودنا پڑا۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ حضرت شیخ یا ان کے اکابر کی انگریز یا یوروپ سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی بلکہ جو کچھ بھی نفرت و عداوت تھی وہ ان کی مادہ پرست تہذیب اور ان کے مادی نظریۂ حیات اور استعماری پالیسی سے تھی جس کے اندر کمزور افراد پر ست درازی زور اور طاقت سے تسلط و غلبہ اور ان کے مال و ملک پر ناجائز قبضہ اور غریب اقوام کی محنت سے ناجائز نفع اندوزی جیسی مذموم کارروائیاں تھیں ان بزرگوں کو یوروپ کے عوام یا دنیا کے کسی ملک کے باشندوں سے کوئی بیر خاموش نہ تھی وہ تو پوری انسانیت سے محبت کرتے تھے اور خدا کی ساری مخلوق کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے۔ بنا بریں ہمارے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ تحریک شیخ الہند کا تعارف اس کے صحیح پیش نظر اور پس منظر میں کرایا جائے اور اس قصۂ پارینہ سے داغہائے سینہ کو تازہ کیا جائے۔

تحریک شیخ الہند کا تعارف

اس سے پہلے کہ تحریک کا تعارف کرایا جائے سب سے پہلے تو ہم کو یہ بات تسلیم نہیں کہ حضرت شیخ یوروپ کی تاریخ یا فرنگی سامراج کے ان سیاہ کارناموں

اور انگریزوں کے کالے کرتوتوں سے نا آشنا تھے جو اس نے ہندوستان اور ایشیائی قوموں کے ساتھ کئے تھے کیونکہ ان کے والد مولانا ذوالفقار علی انگریزی دور میں سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے اور ان کے آغوش شفقت میں پرورش پانے کی وجہ سے انگریزوں کی تاریخ سے کیونکر ناواقف ہو سکتے تھے مولانا ذوالفقار علی کے متعلق فرانسیسی گارسان دتاسی لکھتا ہے ،، کہ وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں انسپکٹر آف مدراس تھے۔ مسٹر بٹلر کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین وطباع ہونے کے علاوہ عربی و فارسی و مغربی علوم سے واقف تھے ۱۹۰۴ء ۱۳۲۲ھ میں انھوں نے وفات پائی (خطبات ص۲۲)

دوسری بات یہ ہے کہ تاریخ یوروپ سے پوری پوری واقفیت نہ ہونے کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ امر ظاہر ہے کہ خلافت عثمانیہ کا ہر مسلمان کا روحانی وجذباتی رشتہ تھا ہر خطیب ہر جمعہ کے خطبے میں جہاں بھی مسلمانوں کی بستی ہوتی خلیفۃ الاسلام کے لئے ضرور دعا کرتا تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ ترکی خلافت کے خلاف یوروپ کی حکومتوں کے مسلسل حملے جاری تھے۔ تاریخ خاندان عثمانیہ میں ہے ،، پندرھویں اور سولھویں صدی مغربی حکومتوں کی باہمی رقابت کی وجہ سے ترکی کے لئے مفید ثابت ہوئیں ترک ان کی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ اسی میں ان کی قوت کا راز تھا لیکن سترھویں صدی میں یوروپی حکومتیں باہمی رقابت کے باوجود ترکی حکومت کے کمزور ہونے میں سب ایک ہو گئیں اور اس نقطہ پر سب متفق ہو گئے کہ اس مرد بیمار کا جنازہ یوروپ سے نکال دیا جائے کیوں کہ یوروپ ترکی حکومت کو ایشیائی سلطنت قرار دیتا ہے اور کسی ایشیائی ملک کا تسلط یوروپ کے لئے ناقابل برداشت تھا سترہویں صدی کے آخر ۱۶۸۲ء میں پورا ہنگری ترکیہ کے ہاتھ سے نکل گیا پھر پنڈولیہ اور ٹرانسولیہ سے ترکی اقتدار ختم ہوا۔ ترکی بحری بیڑے کو وینس کے مقابلے میں

شکست ہوئی۔" (تاریخ خاندان عثمانیہ ص۲۲ جلد ۱)

غرض ترکی خلافت کے حصہ بخرہ کرنے کی اسکیم ہی تیار نہیں ہوئی - بلکہ یکے بعد دیگرے بلقانی ریاستوں کو ہضم کر لیا گیا جس کی تفصیل شیخ مدنی نے نقش حیات جلد ا میں فرمائی ہے۔ یہ تمام احوال شیخ الہند کی آنکھوں کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھے۔ تیسرے یہ کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت کے لرزہ انگیز حالات خوں چکاں واقعات بھی شیخ کی آنکھوں کے سامنے تھے اگرچہ وکٹوریہ کے اعلان معافی نے ان آتشیں جذبات جو ہر ہندوستانی کے دل میں شعلہ زن تھے اوپر سے ٹھنڈا کر دیا تھا لیکن ہر حساس ہندوستانی کے دل کی اندرونی تہوں میں خاموش چنگاریاں سلگ رہی تھیں

ان سب وجوہ سے بڑھ کر اس خطرناک دشت یا میدان جہاد میں قدم رکھنے کی اصل وجہ وہی ہے جو مولانا اسعد مدنی نے تحریر کی ہے کہ حضرت شیخ الہند حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رح کے تلمیذ رشید تھے جو صرف حلقہ درس میں شریک نہیں رہے بلکہ ایک فرزند رشید کی طرح عنفوان شباب ہی سے آپ کے جذبات ورجحانات کی تربیت بھی حجۃ الاسلام کے سایۂ عاطفت میں ہوئی ابھی عمر عزیز کے مرحلے طے ہوئے تھے ابھی حضرت نانوتوی نے دیوبند کو اپنا مستقر نہیں بنایا تھا اور ان کا قیام میرٹھ تھا کہ شیخ الہند کا خطاب پانے والا نونہال حجۃ الاسلام کے دامن سے وابستہ ہو گیا اس وابستگی نے گرویدگی کی صورت اختیار کر لی یہی گرویدگی تھی کہ حضرت حجۃ الاسلام کے ساتھ حضر میں بلکہ سفر میں بھی ساتھ رہتے اور جانفشانہ خدمت جذبۂ راحت رسانی کے اضطراب کو تسکین بخشتے۔ یہ حجۃ الاسلام وہی مولانا قاسم تھے جو چند سال پہلے ۱۸۵۷ء ۱۲۷۳ھ میں یوروپ کے خوانچہ فروش دغابازوں سے نبرد آزما ہوئے جواب اپنے مکر و فریب اور عہد شکنیوں سے جابر حکمراں اور ستم گر فرماں روا بن گئے تھے۔ اس نبرد آزمائی کا نتیجہ شکست ہوا مگر اس

شکست نے صرف اسلحہ کو کند کر دیا تھا۔ وہ جذبات کو افسردہ نہیں کر سکی بلکہ زیر خاکستر چنگاریوں کی طرح اس کی تپش تیز ہو گئی تھی اور طوفان انقلاب کے لئے ان کی حرارت اور بڑھ گئی تھی۔ تلمیذ رشید مولانا محمود الحسن کا سینہ حضرت استاد کے فیوض و افادات کا گنجینہ تھا ان جذبات کا پرتو اس پر پڑا تو وہ آتشی شیشہ بن گیا جو ہر اس آبگینہ کو سوزش و تپش کا تحفہ دینے لگا جس میں عزت نفس خودداری خود اعتمادی اور استقلال و حریت کی جھلک نظر آتی ہے غیرت ملی اور حمایت وطن کی حرارت اس کے خون میں وقار قومی کی طلب اس کے گوشہ جگر میں پیدا ہوئی گویا اس کی صدا یہ ہو گئی تھی۔ ؎

من قماش فروشی دل صد پارۂ خویشم

یہ قماش فروشی کب سے شروع ہوئی اور اس نے نصب العین کی شمع سے دلوں کے چراغدانوں کو منور کرنے کی ابتداء کس زمانے سے کی اس کا سن اور سال بتانا مشکل ہے۔ جب حجۃ الاسلام کے آفتاب سے شعاعیں لینا شروع کیں تب ہی سے ان کرنوں کا تقسیم کا سلسلہ شروع کر دیا یہ کرنیں کہاں کہاں پہونچیں اور کن کن حلقوں نے ان کرنوں کو سمیٹا اور کون کون سے حلقے ان کی تپش سے آتش دان گئے ان کی نشاندہی مشکل ہے صرف ایک حلقہ نمایاں ہوا یہ یاغستان کا حلقہ تھا یاغستان یا آزاد قبائل میں کام کب سے ہو رہا تھا ہمارے پاس اس کا صحیح جواب نہیں ہے البتہ مولانا عبید اللہ سندھی ۱۹۱۵ء میں جب وہاں پہونچے تو بقول ان کے پچاس سالہ کوششوں کا منتشر ثمرہ انکے سامنے تھا جن کو منظم کرنے کے لئے مولانا سندھی کو وہاں بھیجا گیا تھا۔

(پیش لفظ تحریک شیخ الہند ص ۸)

تحریک شیخ الہند کا آغاز

اس تحریک جہاد کا سرا پکڑنے کے لئے کہ اس کا آغاز کب سے ہوا ہم کو

جمیعۃ الانصار کی روداد سے روشنی ملتی ہے اس کا پہلا اجلاس مراد آبا میں شوال ۱۳۲۱ھ اپریل ۱۹۱۱ء میں ہوا جس کے صدر مولانا احمد حسن امروہی شاگرد رشید امام نانوتوی تھے حضرت نے خطبہ صدارت کا آغاز اس طرح فرمایا۔ بعض نئی روشنی کے شیدائی کہتے ہیں کہ جمیعۃ الانصار اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی نقل ہے لیکن یہ بات ہر گز صحیح نہیں ہے جمیعۃ الانصار کی تحریک غالباً اب سے تیس سال پہلے شروع ہو گئی تھی (بحوالہ علماء کا کردار صد ۱۸)

اس لئے اس تحریک کے آغاز کا سلسلہ انیسویں صدی سے جا ملتا ہے اس کی تائید مولانا ابو الکلام کے ایک مکتوب سے ہوتی ہے جس کا ایک حصہ یہ ہے ــــ

"۱۹۱۴ء عالم گیر جنگ کے ایام تھے ولی اللٰہی قافلے کے امیر حضرت مولانا محمود الحسن نے انتہائی نامساعد حالات میں مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجدیا ان کو وہاں مختلف ممالک کے سیاسی رہنماؤں سے مل کر کام کرنے کا موقع ملا ان میں جرمنی اور جاپانی سیاستداں چند ایسے بھی تھے جو آج بر سر اقتدار ہیں "رسالہ الرحیم جولائی ۱۹۱۵"

جمیعۃ الانصار کے ناظم مولانا عبید اللہ سندھی موتمر کی روداد میں فرماتے ہیں رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کی ۲۷ دیں شب عجیب زندگی بخش اور متبرک شب تھی جب کہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمیعۃ الانصار کے افتتاح کی درخواست کی تھی (القاسم ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ)

مولانا سندھی کون تھے

تحریک شیخ الہند کے اہم و ممتاز رکن مولانا سندھی ہیں مولانا سندھی کون تھے ہم مولوی کی زبانی نہیں ایک مسٹر کی زبان سے ان کا تعارف کراتے ہیں قاضی عبد الغفار لکھتے ہیں مولانا عبید اللہ سندھی بہت بڑے

انقلابی عالم تھے جو ہندوستان میں ایک زبردست انقلاب کی بجلیاں کڑکتی ہوئی دیکھنا چاہتے تھے ان کی سوانح حیات اس انقلاب کی تاریخ کا ایک اہم جز ہے جس کے لئے گذشتہ نصف صدی میں وطن پروروں نے اپنی جان کی بازی لگائی تھی اس زمانے میں حکیم صاحب (اجمل خاں) کی زندگی ایک سربستہ راز تھی وہ مولانا کے عزائم کے عملی معاون تھے جب تک یہ انقلابی عزائم پردے میں مستور تھے ۔بیگم صاحبہ بھوپال اور نواب وقار الملک مذہبی تعلیم کے اس جدید تخیل کے عملی تائید کرتے رہے حکیم صاحب کی سیاسی زندگی ۱۹۱۳ء سے نہیں شروع ہوئی بلکہ وہ نظارۃ المعارف مولانا سندھی کے ساتھ اس سے پیشتر آغاز کر چکے تھے مولانا سندھی غیر ملکوں کی تائید حاصل کر کے ایک عالمی محاذ قائم کرنا چاہتے تھے مولانا سندھی کی شخصیت اتحادیوں کے نزدیک اس قدر خوفناک تھی کہ اتحادیوں نے ان کے سر کی قیمت ایک لاکھ مقرر کر دی تھی۔
(حیات اجمل ص ۱۳۰-۱۳۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جمیعۃ الانصار کی بنیاد مدرسہ عربی دیوبند کے فضلاء نے اپنے مربی امام نانوتوی اور ارکان شوریٰ کی خدمت میں درخواست پیش کر کے ۱۲۹۵ھ ۱۸۷۸ء میں داغ بیل ڈالی تھی اور عطیہ یا چندہ کا نام ثمرۃ التربیت رکھا گیا حضرت شیخ الہند نے اپنے محبوب استاد کے ہاتھوں قائم کی ہوئی اس کی جماعت کو خفیہ رازداری کے ساتھ آگے بڑھایا کہ برطانوی سامراج کے کانوں میں اس کی بھنک تک نہ پہونچ سکی۔ ہندوستان سے افغانستان اور دوسری طرف برما اور جاپان تک اس کی شاخیں پھیلادیں

شیخ الہند کی برما اور چین کیلئے خفیہ سفارتیں

حضرت شیخ نے اپنے اس مقصد عالی کو حاصل کرنے کے لئے بیرونی ممالک میں اپنے خفیہ مشن بھیجنے کا ایک رازدارانہ سلسلہ شروع کیا حضرت شیخ

کی شمالی سرحدی کارروائیوں کی روئیداد کا حصہ کچھ نہ کچھ منظر عام پر آچکا ہے لیکن مشرقی ایشیا۔ (برما چین) کی مخفی سرگرمیوں پر اب تک پردہ پڑا ہوا ہے جس کو ہم یہاں اٹھانا چاہتے ہیں جس طرح شیخ نے یاغستان وافغانستان اب تک اپنی تحریک جہاد کو اپنے مخلصوں کے ذریعہ سے پھیلایا اسی طرح چین وبرما تک بھی اپنے کارکنوں کو پہونچایا چنانچہ مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی اور شوکت علی بنگالی بی۔اے کی رہنمائی میں ایک مشن چین بھیجا گیا مولانا مقبول الرحمٰن جو شیخ کے معتمد و محرم راز شاگرد تھے وہ انگریزی و چینی زبانوں سے واقف کار تھے یہ مشن چھ افراد پر مشتمل تھا جن میں ہندو مسلم دونوں تھے اس مشن نے سیرت کمیٹی کے نام سے اپنے کام کا آغاز کیا اور ایک ماہنامہ "الصین" کے نام سے ۱۹۰۵ء میں اردو چینی زبان میں جاری کیا تھا اس مشن کو چین میں جب اپنا حلقہ اثر پیدا کرنے میں کامیابی ہوئی تو مرکزی کمیٹی نے اس مشن کو برما پہونچا دیا۔ برما میں مولانا مقبول الرحمٰن سرحدی نے "الانسان" کے نام سے ایک عربی کتاب تصنیف کی جس کا ترجمہ شوکت علی بنگالی نے برمی وانگریزی میں کیا اس کتاب کے اندر ہندوستان میں برطانوی سامراج کے مظالم اور لوٹ کھسوٹ پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چنانچہ یہ مشن ۱۹۱۵ء تک اپنا کام کرتا رہا مولانا مقبول الرحمٰن اپنے اخراجات طب یونانی اور شوکت علی ایلوپیتھک علاج کے ذریعہ پورا کرتے رہے ان کے برما منتقل کئے جانے پر تین افراد چین میں رہے اور ایک رکن مزید ہدایات کے لئے ہندوستان آیا برما میں مشن کے دیگر افراد کپڑا بیچ کر اپنا کام چلاتے تھے۔ برما میں بھی اس مشن کو کامیابی ہوئی۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی تحریک مذکور کے قائد

شیخ الہند کے دوسرے مشن کے قائد مولانا برکت اللہ بھوپالی

اس طرح ہو گئے کہ حضرت شیخ مولانا ئے اس اقتصادی مضمون سے جو ارد ؤ معلی میں چھپا تھا بے حد متاثر ہوئے اور ان کو اپنے کام کا آدمی سمجھ کر رابطہ قائم فرمایا پھر اپنے اس مشن کی قیادت قبول کرنے کی دعوت دی جس کو انھوں نے بخوشی قبول کیا اس مشن کے پانچ ارکان تھے اور مولانا جاپان یونیورسٹی میں پروفیسر تھے بقیہ ارکان جاپان پہونچ کر ان کے ساتھ شامل ہو گئے

(مولانا برکت اللہ بھوپالی ص ۹۶-۹۵

شیخ الہند رح نے اس تحریک کے سلسلے میں جو رابطہ حکومت افغانستان و ترکیہ سے ہندوستان کی آزادی کے لئے قائم کیا ان کی تفصیلات باب دوم میں آرہی ہیں تاریخ حریت کے اس قصہ پارینہ یا جنگ آزادی کی اس پرانی کے مخفی واقعات کو (جن کی یادیں بھی بھولی بسری یادیں بن چکی ہیں) اس لئے ہم نے طول دیا ہے کہ جو لوگ علمائے حق کے کارناموں سے ناواقف ہیں ان کے سامنے اصل تاریخ پیش کر دی جائے تاکہ اس کے آئینہ میں ہمارے بزرگوں کے پچھلے دور میں آزادی کی راہ جو جانفروشانہ خدمات ہیں ان کی جھلکیاں سامنے آجائیں اور ان اکابر کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا اندازہ لگایا جائے جن کے دلوں میں دنیا کے عظیم سامراج سے ٹکر لینے کا حوصلہ موجود تھا جس سامراج کے حدود سلطنت میں کبھی سورج نہ غروب ہوتا تھا اور جو سامراج ملکۂ بحر بن کر دنیا کے بڑے بڑے سمندروں پر اپنی سربلندی کا جھنڈا لہرا رہا تھا جس کے وزیر اعظم (گلیڈسٹون) نے اپنی فتح و کامرانی نشۂ غرور میں برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا تھا کہ ہم اس وقت اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر آسمان ہمارے سروں پر گرنا چاہے تو ہم اس کو سنگینیوں کی نوک پر روک لیں گے

علماء سیاست میں کب آئے

سامراجی مورخوں اور ان کے طفیلیوں سے شکوہ و گلہ فضول ہے

کہ انھوں نے اسلامیان ہند کی صحیح تاریخ آزادی ہند کو قصداً قلم انداز کیا ہے اصل شکایت مسلمان تاریخ نگاروں سے ہے کہ انھوں نے اپنی ملت کے بزرگوں کی حریت و آزادی کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش نہ کی۔ ہمارے ملک کے مسلم مورخوں نے بتایا ہے کہ مولوی صاحبان اپنی بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھے ہوئے یاد الٰہی میں تھے کہ تحریک خلافت نے ان سوتوں کو جگایا (سیرت محمد علی صنا ۵۱)۔

لیکن یہ امر حقیقت سے کتنا دور ہے اس کا جواب ایک مسٹر کی زبانی بھی سنئے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں کہ حکیم اجمل خان کے متعلق خیال ہے کہ وہ ۱۹۱۴ء میں میدان سیاست میں آئے اور یہ کہ سب سے پہلے علی برادران نے ان حجرہ نشین مولویوں کو پبلک زندگی میں آنے کی دعوت دی سیاسی زندگی میں ان کا پہلا قدم علی برادران کی تحریک کا نتیجہ ہے اس سے بڑھ کر کوئی تاریخی غلطی نہیں ہو سکتی واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر انصاری شیخ الہند کے باقاعدہ مرید تھے اور ان کے بھائی لقمان الملک حکیم نابینا انصاری اور حکیم اجمل خاں اس تحریک کے پہلے سے رکن تھے۔ (حیات اجمل صد ۱۹۶)

اس میں کوئی شک نہیں کہ خلافت کی تحریک نے خواص و عام کو یکساں طور پر جھنجھوڑا اور کانگریس نے اشتراک نے ہندو مسلم عوام کو برطانوی سامراج کے مقابلے کے میدان میں شانہ بشانہ لاکر کھڑا کر دیا لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سے پہلے جو کچھ سیاست تھی محض خوشامد پرستانہ تھی جو علماء کے انقلابی مزاج سے ہم آہنگ نہ تھی اس لئے علمائے کرام اس سیاست سے دور دور رہے جیسا کہ علی گڑھ کے ابتدائی گریجویٹ مولانا طفیل احمد منگلوری نے لکھا ہے "ہندوستان کی سیاست محض چاپلوسی خوشامد پرستی اور اظہار وفاداری میں محدود ہو چکی تھی گویا مسلمانوں کا سب سے بڑا سیاستدان وہ شخص سمجھا جاتا تھا جو

حکومت مسلطہ کا سب سے بڑا وفادار ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ علماء مذہب جو طبعاً خوشامد پرستی اور چاپلوسی سے متنفر ہیں اور جو بڑے بڑے بادشاہوں کے مقابلہ میں اعلاء کلمہ حق کے عادی رہے اس سیاست سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشین ہو گئے تھے (روشن مستقبل ص ۵۲۳)

بہر حال ولی اللہی جماعت نے ۱۸۵۷ء کے گیارہ سال بعد ہی جمیعتہ الانصار کے نام سے تحریک کا آغاز کر دیا تھا چوں کہ ۱۸۵۷ء میں برطانوی سامراج کی قہرمانی نے دہلی و میرٹھ اور اس کے نواح میں ۱۲ ہزار علمائے حق کو اور دو تین لاکھ عام مسلمانوں کو پوری بے دردی سے شہید کیا اور حریت پسند مسلمانوں کے ساتھ درندگی و بربریت کا مظاہرہ کیا تھا اس لیے اس خطرناک ماحول میں از سر نو بغاوت کا پروگرام بنانا دانشمندی کے خلاف تھا البتہ آزادی خواہ بکھرے ہوئے افراد کو ایک لڑی میں پرونے کا کام دھیرے دھیرے شروع کر کے ولی اللہی جماعت ان لوگوں کو اکٹھا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

کمپنی کی تعلیمی پالیسی

حکومت برطانیہ نے ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافی ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی پالیسی کو تبدیل کر دیا ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ پالیسی اختیار کی تھی کہ ہندوستان کے پرانے نظام تعلیم کو ختم کر کے باشندگان ملک کو ناخواندہ و جاہل بنا دیا جائے۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے فکر و تدبر کے ان سوتوں کو خشک کر دیا جائے جہاں سے حقوق شناسی کے چشمے پھوٹتے ہیں یا تو مسلم بادشاہوں کے زمانہ کا یہ حال تھا کہ بقول مقریزی شہنشاہ محمد تغلق کے زمانے میں صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے تھے۔ (تعلیم ہند ص ۳)

پروفیسر میکس مولر نے مسٹر ہارڈی کو لکھا ہے کہ انگریزوں کی عملداری سے قبل عہد عالمگیری میں صرف بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے اس طرح چار سو آدمیوں کی آبادی کے لئے ایک مدرسہ ہوتا تھا (روشن مستقبل ص ۱۲۷)

کپتان الگ زنڈر اہملٹن اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ شہر ٹھٹھا (سندھ) میں مختلف علوم و فنون کے چار سو کالج تھے (تعلیم ہند ص ۳)

مشہور فرنگی مورخ سر ولیم ہنٹر نے لکھا تھا کہ قبل اس کے کہ ملک ہمارے ہاتھوں میں آئے مسلمان نہ صرف سیاسی اعتبار بلکہ ذہن و فراست کے اعتبار سے بھی بڑی وقعت رکھتے تھے ان کا نظام تعلیمی اعلیٰ درجہ کی ذہنی تربیت دے سکتا تھا مسلمانوں کا نظام تعلیم ہندوستان کے دیگر نظاموں سے بدرجہا فائق تھا (رپورٹ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۳۴ء)

بنگال سول سروس کا ایک افسر لکھتا ہے عام تعلیم اور دینی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان بدرجہا فائق ہیں) اور ہندو نسبتاً مسلمانوں کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں بقول جسٹس محمود ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر صرف یہ چاہتے تھے کہ تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کریں۔ اس لئے وہ اہل ہند کو تعلیم دینا اپنا کام نہیں سمجھتے تھے (تاریخ تعلیم میجر باسو بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۲۸)

چنانچہ اس پالیسی کا نتیجہ نصف صدی میں یہ نکلا جس کا آنر بیل ایم الفسٹن اور ایف ڈاؤن نے اپنی یادداشت ۱۸۲۳ء میں اظہار کیا ہے۔ انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف علمی ترقی کے تمام ذرائع مٹا دیئے بلکہ قوم کے اصلی علوم بھی گم ہو گئے ہیں اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار

کے فراموش ہونے کا اندیشہ ہے اس الزام کو ہمیں دور کرنا چاہئے (روشن مستقبل ص ۱۲۳)

برطانوی سامراج کی نئی تعلیمی پالیسی

برطانوی سامراج نے اپنے اوپر کے اس الزام کو دور کرنے کے لئے ایسا حربہ استعمال کیا کہ سارے ہندوستانی عموماً اور سب مسلمان خصوصاً اس وار سے ایسے گھائل ہوئے کہ اس زخم کو بھرنے میں عرصہ لگا۔ برطانوی سامراج نے دفتری زبان فارسی ۱۸۳۴ء میں بیک جنبش قلم ختم کر کے انگریزی زبان کو سرکاری زبان بنا دیا جس کے نتیجے میں ملک کے سارے عالم و فاضل اور پرانی تعلیم کے ماہر کامل ایک رات ہی میں سارے کے سارے جاہل بن کر رہ گئے۔ جس کا اعتراف سر ولیم ہنٹر نے بھی کیا ہے وہ لکھتا ہے ہم نے اپنی عملداری کی ابتدائی دور میں پچھتر سال یعنی ۱۸۲۳ء تک اپنے نظامی عہدہ دار تیار کرنے کے لئے مسلمانوں کے سابقہ نصاب تعلیم کو جاری رکھا اس دوران ہم نے اپنا سر رشتہ تعلیم قائم کر دیا تھا اور جوں ہی اس سے ایک نسل تیار ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اٹھا کر پھینک دیا جس سے مسلمان نوجوانوں پر ملازمت کے دروازے بند ہو گئے پھر اس نسل کو تیار کرنے کے لئے ہندوؤں سے کام لیا گیا چنانچہ ولیم ہنٹر لکھتے ہیں کہ مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی اہمیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی سرکاری اطلاعات کے ذریعہ خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع کر دیا جاتا ہے ان کی بے کسی کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی کسر شان سمجھتے ہیں چنانچہ ۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں کوئی دفتر ایسا ہو گا جس میں بجز چپراسی دفتری یا چھٹی رساں کے مسلمان کو نوکری مل سکے (مسلمانوں

کے افلاس کا علاج صـ۱۵۸)

اب ہم آخر میں مس مٹو کے ایک بیان برطانوی سامراج کی پیدا کردہ گھناؤنی پالیسی پر ختم کرتے ہیں۔ برطانوی سامراج جب اپنے مقصد مسلمانوں کو نیچے گرادیتے اور برادران وطن کو آگے بڑھانے کی پالیسی میں کامیاب ہوگیا تو اب اس نے اپنا چولا بدلا اور مسلمانوں کا ہمدرد بن کر اپنی تعلیمی پالیسی کو تبدیل کیا۔ چنانچہ ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کے لئے تمام صوبوں میں احکام جاری کر دیئے (تاریخ التعلیم سیّد محمود بحوالہ روشن مستقبل صـ۳۳۱)

لیکن برطانوی سامراج نے کون سی تعلیم کے جاری کرنے منصوبہ بنایا وہ لارڈ مکالے کی ان الفاظ سے آشکارا ہوتا ہے جو اس نے برطانوی پارلیمنٹ میں کہے تھے کہ ہمیں ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ہم میں اور ہماری کروڑوں رعایا کے درمیان مترجم ہو وہ ایسی جماعت ہو جو خون ورنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق رائے اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے انگلستانی ہو (تاریخ التعلیم بحوالہ روشن مستقبل صـ۱۳۷)

سرسید احمد خاں کی تعلیمی تحریک

یہی وہ زمانہ ہے جب کہ سرسید احمد خاں بانی علی گڈھ کالج نے اپنی تعلیمی تحریک حکومت کے تعاون سے جاری کی جس نے آگے چل کر مسلمانان ہند کو نئے اور پرانے تعلیم یافتہ طبقوں میں بانٹ دیا۔ اس مقام پر عام طور پر پھیلائی ہوئی ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ سرسید سارے علماء یا تمام مولویوں کے خلاف تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید نے ہمیشہ ور علماء کی مخالفت

ہیں ان کی جمود پسندی اور انگریزی تعلیم کے حرام کہنے کی وجہ سے ضرور مخالفت کی ہے لیکن کیا وہ علمائے حق کے بھی خلاف تھے ایسا ہرگز نہیں ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کو قرآن کی روشنی میں کیوں کر حرام کہا جاسکتا ہے جبکہ قرآن نے زبانوں اور رنگوں کے اختلاف کو خداوند قدوس کی نشانیوں میں سے بتایا ہے۔ (سورہ روم)

چنانچہ ولی اللہی دعوت کے پہلے امام شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے سب سے پہلے انگریزی زبان کی تعلیم کے جائز ہونے کا فتوی دیا تھا۔ (فتاوی عزیزیہ)

حقیقت حال یہ ہے کہ سرسید احمد خاں اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی ایک ہی استاد حضرت مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ سرسید مولینا مملوک علی کے متعلق لکھتے ہیں "علوم معقول منقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ان کو ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو ان تمام کتب سے گنجینہ علم خالی ہو جائے تو ان کے لوح حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے ان سب فضل و کمال پر خلق حلم احاطہ تحریر سے فزوں تر ہے،، (آثار الصنادید صہ جلد ۴)

یہ تینوں حضرات ایک ہی مکتبہ فکر سے ابتداءً تعلق رکھتے ہیں لیکن بعد میں اپنی پالیسیوں کے اعتبار سے دونوں کے راستے علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ چنانچہ مولانا نانوتوی کے وفات پر سرسید نے جو تعزیتی مضمون لکھا ہے اس سے ان کے احترام، اکرام اور باہمی تعلق کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مضمون بہت طویل ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا محمد قاسمؒ ایک فرشتہ صفت عالم تھے ان کے اندر سادگی و تقوی شعاری محمد اسحاق دہلویؒ کے نمونہ پر تھے اسلام کے بہی خواہ اور مسلمانوں کے سچے ہمدرد ایسے اشخاص صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور مدرسہ دیوبند سے مسلمانوں میں مذہبی تعلیم کا انھوں نے انتظام کیا ان کی وفات پر جتنا بھی غم کیا جائے کم ہے (علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ ۲۲ اپریل ۱۹۸۰ء

بہر حال امام نانوتوی اور قطب گنگوہی نے ولی اللہی فکر و حکمت کے لحاظ سے برطانوی حکومت کے لئے ایسی پالیسی بنائی اور سر سید مرحوم نے مصلحت زمانہ کے آگے سپر ڈالدی اور حکومت سے سمجھوتہ کرنے میں مسلمانوں کی فلاح و بہبودی سمجھی یہ حقیقت واقعی ہے کہ برطانوی حکومت کے جابرانہ تسلط کے بعد حالات زمانہ کو دیکھتے ہوئے مغربی تعلیم کو نظرانداز کرنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ مغربی تعلیم مسلمانان ہند کو کس ماحول میں دلائی جانا چاہیئے تاکہ مغربی تہذیب و معاشرہ کے مضر اثرات سے ملتِ اسلامیہ کے نونہال محفوظ رہیں۔ اس کے مقابلہ میں سر سید مرحوم اس امر کے پرزور وکیل تھے کہ مغربی تعلیم مغربی تہذیب کے سایہ ہی میں صحیح طور پر نشو و نما پا سکتی ہے وہ مغربی تہذیب کی برتری کے زبان و دل سے قائل تھے چنانچہ ان دونوں مصلحوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ کتاب تصفیۃ العقائد میں اب بھی موجود ہے۔

بہر حال جب ۱۸۷۳ء میں برطانوی حکومت کی تعلیمی پالیسی مسلمانوں کی بابت بدلی اور اس تعلیم کو سامراجی مقاصد کے لئے جاری کرنا طے کیا گیا۔ تو سر سید احمد خاں نے یکم جون ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی بنیاد رکھی اور اپنے مجوزہ خیالی نقشہ کو عملی رنگ سے بھر دیا حکومت کے تعاون سے ان کو غیر معمولی کامیابی ہوئی تب امام نانوتوی اور ان کے مخلص رفقاء نے دنیاوی تعلیم کے علی گڑھ میں فروغ پا جانے کی بنا پر اپنے لئے دینی تعلیم کے میدان کو منتخب کیا گیا ۱۸۶۶ء ۱۲۸۳ھ دارالعلوم دیوبند کا افتتاح ہوا اور اسی سال مدرسہ مظاہر العلوم قائم ہوا اور تھوڑے ہی عرصہ میں اخلاص و للہیت سے نصب کیا ہوا یہ پودا سایہ دار تناور درخت بن گیا اور اس کی شاخیں ملک کے اطراف پھیلتی گئیں ایسے ہی سر سید کی تعلیم جدید کی تحریک بھی پورے ملک میں برومند و بر آور ہوئی لیکن بقول ڈاکٹر اقبال

جدید تعلیم کی شیریں ہمارے دلوں میں جلوہ گر تو ضرور ہوئی مگر الحاد و لامذہبیت کا فرہاد بھی اپنے ساتھ تیشہ لے کر آیا اور اس فرہاد یا الحاد کے تیشہ نے دلوں کی سرزمین سے معرفت و روحانیت کے پاکیزہ درخت کو کاٹ پھینکا اور اس کی جگہ بد دینی یا تشکیک کا بیج بو دیا جس سے نشو و نما پاکر پھل پھول لانے میں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا خدا نخواستہ ہمارے ان اکابر و بزرگوں نے ملک کے اندر مذہبی مدارس کا جال نہ پھیلایا ہوتا تو ہماری قوم مہذب و ترقی یافتہ ضرور ہو جاتی مگر مسلمان نہ رہتی۔ بقول اقبال رح صرف متاع کارواں ہی نہیں چلا جاتا بلکہ اہل کارواں کے دل سے احساس زیاں بھی رخصت ہو جاتا۔ جس کو لسان العصر نے (اکبر الٰہ آبادی) یوں فرمایا۔ ؎

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو پھر اس کو کیا کرو نگا جنٹ کوئی جج ہے

اسلامیان ہند کی تعلیمی و معاشرتی ترقی کے لئے علی گڈھ تحریک کا غلغلہ سرکاری طور پر پوری دنیا میں کیا گیا لیکن برطانوی سامراج کی ڈپلومیسی نے علمائے حق کے شاندار کارناموں کو دبا دیا اور جہاں کہیں ذکر کیا ہے تو وحشت ناک عنوان مذہبی دیوانوں۔ جنونیوں کے لقب سے ان کو یاد کیا ہے۔

ہر تحریک ہر دعوت ایک جڑ بنیاد رکھتی ہے اور ہر درخت کی آبیاری سے الگ الگ پھول پھل نکلتے ہیں۔ چنانچہ ان دونوں تحریکوں کے نتائج بھی الگ الگ نکلے۔

سرسید آغاز کار میں تو صحیح قومی و ملی خطوط پر کام کرتے رہے لیکن جب کالج کی باگ ڈور انگریز پرنسپل (مسٹر بیک مسٹر راچبولڈ وغیرہ) کے ہاتھ آئی تو پھر برطانوی سیاست نے اپنا وہی پرانا کھیل ڈوائڈ رول کھیلا مولانا طفیل احمد منگلوی جو سرسید کے دیکھنے والوں اور کالج

کے ابتدائی طالب علموں میں تھے انھوں نے لکھا ہے "بوڑھے سر سید اپنی ضعیفی و پیری میں ان یورپین مشیروں کے آلۂ کار بن گئے اور پھر مسلمانوں کے لئے انکی پوری پالیسیاں حکومت کے چشم و ابرو کے نشانے پر انجام پانے لگیں (روشن مستقبل ص)

حالانکہ یہ وہی سر سید تھے جنھوں نے اپنی نوجوانی کے دور میں اسباب بغاوت ہند لکھ کر پورے ملک میں تہلکہ مچادیا تھا برطانوی سامراج کے ہندوستانیوں پر الزامات کی پرزور دلائل سے دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ اور ۱۹۵۷ء میں بغاوت کو حق بجانب ثابت کرنے کی پرزور وکالت کی تھی اور اہل ملک کے دلوں کو جیت لیا تھا۔ انھوں نے سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا ترکی بہ ترکی جواب دیکر پوری ملت اسلامیہ کے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔ لیکن وہ بوڑھے ہوکر ساحر برطانیہ کے جادو کے ایسے شکار کہ اس کی پالیسی پر آمنّا وصدّقنا کہنے لگے چنانچہ جب ملی قافلہ آگے بڑھا تو ملت کے دو بازو نئے تعلیم یافتہ اور قدیم الخیال لوگ سامراجی پالیسی کے نتیجے میں بہ مقابل بن کر آمنے سامنے آئے اور برطانوی سامراج نے اس خلیج کو وسیع کر کے انتہا تک پہونچادیا چوں کہ برطانوی سامراج نے اپنی مستقل پالیسی کے ماتحت ملت اسلامیہ کو دشمن نمبر ایک قرار دے رکھا تھا جیساکہ ایک موقع پر انگریز لارڈ ڈابرس نے کہا تھا کہ ان بدمعاش مسلمانوں کو بتادیا جائے کہ خدا کے حکم سے صرف انگریز ہی ہندوستان پر حکومت کریں گے۔ (شاندار ماضی)

جیساکہ گورنر ایلنٹن نے ڈیوک آف ویلنگٹن کو ۱۸۴۳ء میں لکھا تھا میں اس عقیدہ سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی قوم اصولاً ہماری دشمن ہے اس لئے ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندؤں کی رضاجوئی کریں (دان ہی پی انڈیا)

تقسیم بنگال کا قضیہ

برطانوی سامراج نے برادرانِ وطن (ہندوؤں) کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اس لئے آگے بڑھایا تھا کہ وہ ان کے دست بازو بن جائیں گے اور سامراج کے آلہ کار ہو کر ان کے آلۂ کار ہو جائیں گے۔ لیکن جدید تعلیم نے ان کے اندر حقوق شناسی کے جذبے کو بیدار کیا۔ اور چونکہ سب سے پہلے کلکتہ یونیورسٹی ملک میں انگریزوں نے قائم کی تھی اس لئے بنگال کے بابوؤں نے اعلیٰ ترین عہدوں کے لئے مطالبات کا جوش و خروش پیدا ہوا چنانچہ برادرانِ وطن نے برطانوی سامراج کے خلاف بنگال سب سے پہلے میدان میں آیا برطانوی سامراج کے نمائندے لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں ہندو مسلم تنازعہ پیدا کرنے کے لئے تقسیم بنگال کا اچھر استعمال کیا۔ تقسیم کا یہ پہلا وار تھا۔ جو ہندوستان پر اور ملکی سالمیت پر انگریزوں نے کیا تھا۔ اس کی مصلحت بقول قاضی عبدالغفار یہ تھی کہ ایک طرف تو غیر مسلم بنگالیوں کی قوت و اکثریت کو توڑا جائے جنھوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف ایک محاذ بنالیا تھا اور مورچہ قائم کر لیا تھا اور دوسری طرف وفادار اور برطانوی سرکار کے عقیدت مند مسلمانوں کو اس طریقہ سے خوش کیا جائے ایک پورے صوبے میں ان کو اکثریت حاصل ہو جائے۔ انگریزی اندازِ تدبّر پر نظر رکھی جائے تو اس تقسیم ہند کے اعتراض تقسیم بنگال سے مختلف معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن بیدار عوام بنگالیوں نے انگریزی منصوبہ کو شکست دیدی (آثار ابوالکلام ص۵۳)

بنگالیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف احتجاج کی تین صورتیں تجویز کی تھیں (۱) ولائتی مال کا بائی کاٹ (۲) سودیشی مال کی ترویج (۳) انگریز کے خلاف دہشت پسندی۔

آخری بات تشدد کو چھوڑ کر گاندھی جی نے بعد ان کی دونوں باتوں کو اپنے پروگرام میں شامل کر لیا۔ بہرحال پانچ سال تک اس تقسیم کے خلاف تحریک زور و شور سے جاری رہی بنگال کی بم بازی نے حکومت کے ناک میں دم کر دیا جس کے نتیجہ میں ۱۹۱۱ء میں اس فیصلہ کو حکومت کو منسوخ کر دینا پڑا۔ جس نے برطانوی سامراج کے خلاف برادران وطن میں ایک ولولہ پیدا کیا۔ ایک طرف ہندوؤں میں حکومت کے خلاف ایک جوش و خروش پیدا ہوا۔ دوسری طرف مسجد کانپور کے ہنگامہ برپا ہوا جس کی وجہ سے وفاداران برطانیہ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور جس علیگڈھ کو گورنمنٹ نے مسلمانوں کے لئے اس ڈپلومیسی نافذ کرنے کا اڈہ بنایا تھا اسی کے پرجوش فرزند مولانا محمد علی و شوکت علی میدان سیاست میں کود پڑے اور مسلم عوام کے دلوں میں جو طوفان چھپا ہوا تھا وہ حکومت کے اس فیصلہ سے پھٹ پڑا۔ اس کے بعد حکومت کے دوسرے فیصلہ نے جلتی آگ میں تیل کا کام کیا۔ قاضی عبد الغفار لکھتے ہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی کا قضیہ نامرضیہ تھا۔ جب ہائی کورٹ ہند نے یونیورسٹی کے قانون اساسی میں ایسی دفعات رکھ دیں جن کی بنا پر یونیورسٹی گورنمنٹ کے کنٹرول میں چلی جائے تو مسلمانوں کا وہ خواب بکھرنے لگا جو اس تحریک کے سلسلہ میں دیکھا تھا۔ ایک طرف صاحبزادہ آفتاب احمد نواب مزمل اللہ خاں، سر علی امام، اور نواب محمد اسحاق تھے دوسری طرف احرار تھے۔ جس میں نواب حمید اللہ خان مسٹر مظہر الحق ڈاکٹر بجنوری اور مسٹر جناح وغیرہ تھے۔ آخر میں کانسٹی ٹیوشن کے لئے جو کمیٹی مقرر ہوئی حکیم اجمل خاں کی رہنمائی میں شملہ جانے والی تجویز حسب رائے احرار منظور ہوئی (حیات اجمل صد ۱۳۴)

لیکن حکومت برطانیہ نے اپنے وفادار ازلی کے بل بوتے پر ایک مفلوج

اور اپاہج یونیورسٹی مسلمانوں کے سروں پر تھوپ دی۔ حکومت ان فیصلوں کی وجہ سے کیا ہندو کیا مسلمان دونوں فرقے برطانوی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا ابوالکلام "البلاغ" و "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں میں آزادی کا صور پھونک رہے تھے۔ "الہلال" کا ہر مضمون بقول حضرت شیخ الہند "مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلا رہا تھا دوسری طرف رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر اپنے انگریزی اخبار "کامریڈ" کے ذریعہ نئے تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں میں حریت و خودداری کی بجلیاں چمکا رہے تھے۔ اس سے پہلے جنگ بلقان ۱۹۱۲ء جب چھڑی تھی تو شیخ الہند کے دارالعلوم دیوبند کو بند کرا کر ملک کے اندر مختلف وفود ترکوں کی امداد کے لئے بھیجے تھے۔ ڈاکٹر انصاری (مرید شیخ الہند) کا طبی وفد ۱۹۱۳ء میں ترکیہ بھیجا گیا۔ جو چند ماہ رہ کر واپس آیا۔ چونکہ ولی اللہی تحریک خلافت اسلامیہ کی مرکزیت کو شریعت کی روشنی میں قائم رکھنے کی داعی تھے۔

جنگ عظیم کا آغاز کانپور کے حادثے اور مسلم یونیورسٹی کے ہنگامہ نے مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکنے کا کام کیا اس عرصہ میں جنگ عظیم ۱۹۱۴ء چھڑ گئی جس کے اندر ایک طرف جرمن و ترک تھے اور دوسری طرف اتحادی برطانیہ و فرانس و روس تھے حکومت کے سیاسی لیڈروں کی نظر بندی میں اپنی عافیت سمجھی یہ وہی لوگ تھے جو تحریک شیخ الہند کے ارکان تھے۔ مولانا ابوالکلام۔ علی برادران مولانا حسرت موہانی مولانا ظفر علی خاں وغیرہ اس لئے شیخ نے ہندوستان میں مزید ٹھہرنا مفید نہ سمجھا اور تحریک کے کارکن جو سرحد و یاغستان اور پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے ان کو حرکت میں لانا ضروری خیال فرمایا۔ مولانا سندھی کو ۱۹۱۵ء کابل اور مولانا سیف الرحمٰن، مولانا فضل ربی اور حاجی

ترنگ زئی وغیرہ کو یاغستان روانہ کر دیا اور خود حجاز روانہ ہو گئے۔ مکہ معظمہ پہونچکر اپنے رفقاء سے مل کر عملی پروگرام طے کیا۔ اور مدینہ میں گورنر حجاز غالب پاشا، جمال پاشا اور انور پاشا سے مل کر وہ خطوط حاصل کر لئے جو امیر کابل اور مجاہدین باغستان کو جہاد کرنے کے لئے خفیہ روانہ کئے تھے جن میں سے اکثر خطوط مرسل الیہم تک پہونچا دیئے گئے۔ اس اسکیم کے مطابق فروری ۱۹۱۵ء میں ایک دن طے کیا گیا تھا۔ جس دن ہندوستان پر بیرونی حملہ ہونے والا تھا اور پورا ملک بغاوت کے لئے اٹھ کھڑا ہونا طے تھا (علماء حق ص ۱۷۰)

صرف ایک خط خان بہادر رب نواز کے ہاتھ اس وقت آیا جب کہ جنگ کا پانسہ ہی پلٹ چکا تھا اور اتحادیوں کی فتح سے صورت حال ہی بدل چکی تھی حضرت شیخ حجاز سے باغستان پہونچنا چاہتے تھے۔ لیکن روس نے ایران پر حملہ کر کے راستہ بند کر دیا۔ تب قسطنطنیہ جانے کا پروگرام بنا رہے تھے کہ شریف مکہ نے بغاوت کر کے شیخ کو گرفتار کر کے فروری ۱۹۱۷ء کو انگریزوں کے سپرد کر دیا۔

شیخ الہند کی مالٹا میں نظر بندی:۔ حضرت شیخ الہند اپنے رفقاء مولانا حسین احمد مدنی مولانا عزیز گلؒ، مولانا وحید احمد کے ساتھ چار سال نظر بند رہے۔ جہاں ترک، جرمن کے بڑے بلند پایہ مدبر و جرنل افسر برطانیہ کی حراست میں تھے۔ بقول حضرت مدنی مالٹا کا وہ قید خانہ ہمارے لئے سیاست کا درسگاہ بن گیا۔ شروع میں اس قید خانہ میں حضرت شیخ کو کال کوٹھری میں بند کیا گیا۔ جہاں چاروں طرف لوہے کی سلاخیں اس طرح کی تھیں جس کے اندر آدمی کے لئے کھڑا ہونا بھی مشکل ہوتا تھا، اِدھر اُدھر سہارا لینے سے وہ سلاخیں چبھتی۔ اور جسم کو زخمی کر دیتی تھیں، اس ظالمانہ فعل کا مقصد

یہ تھا کہ حضرت شیخ اور ان کے صاحب جرأت ساتھیوں سے اصل منصوبہ کا سراغ لگ سکے۔ لیکن ان کی ساری کوششیں رائیگاں ثابت ہو گئیں۔

برطانیہ کے جاسوسی نظام کی شکست وناکامی

حضرت شیخ الہند کی اس خفیہ تحریک کو رازداری کے ساتھ وسعت اور پھیلاؤ کا ماجرا اس قدر حیرت ناک اور عجیب و غریب ہے کہ برطانیہ جیسی چالاک، عیار و مکار و ہوشیار حکومت کی بے تدبیری اور حضرت شیخ کے کمال تدبر پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ایک ایسی گورنمنٹ جس کی سی۔ آئی۔ ڈی (محکمہ خفیہ) کا جال ملک کے کونہ کونہ میں پھیلا ہوا تھا اور اس کا تار برقی نظام ملک کے اندر انسانی جسم کے اعصابی نظام کی طرح پورے برطانوی حکومت کے ہر رگ وریشہ میں دوڑ رہا تھا۔ ملک کی رعایا کے ہر اہم آدمی کے اعمالنامے اور ان کے کچے چٹھے برابر لکھے جاتے تھے۔ واقعتاً برطانوی سامراج کا جاسوسی محکمہ اس قدر مستعد فعال اور مضبوط محکمہ تھا کہ اس وقت کی دوسری حکومتیں بھی اس کے نام سے تھراتی تھیں اتنی عظیم حکومت جو نئی اور پرانی دنیا کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھیں۔ اور قصر بکنگھم سے اس کی ہر نوآبادی کے تار جڑے ہوئے تھے۔ اس کا محکمہ خارجہ ہر تحریک سے باخبر رہتا تھا لیکن ایک فقیر درویش صفت جس کی پوری زندگی دارالعلوم کی چار دیواری میں محصور رہی اور جو عمر بھر اس وقت کی عصری سیاست سے کوسوں دور رہو۔ اور جس کے نہ ارباب سیاست سے ظاہری تعلقات تھے اور نہ خفیہ رابطہ تھا۔ لیکن اس نے بسم اللہ کی گنبد میں بیٹھ کر نہ صرف ہندوستان کے اندر بلکہ ملک کے باہر برطانوی سامراج کے خلاف ایک ایسا عالمی محاذ قائم کیا جس کے ارکان جاپان و چین اور برما سے لے کر افغانستان، بلخ و بخارا تک پھیلے ہوئے تھے

لیکن اس کی خفیہ تحریک اور اس کی جاری کردہ تحریک و ہدایات سے برطانیہ کا عظیم جاسوسی محکمہ آخر تک یکساں ناواقف رہا۔ اس تیس سالہ تحریک جہاد سے برطانیہ کب واقف ہوئی جب کہ خلافت ترکیہ کے خاتمہ پر تحریک نے ہی پوری طرح دم توڑ دیا۔ ہماری سابقہ مہربان گورنمنٹ اسوقت زندان مالٹا میں اس تحریک کا کھوج لگا رہی تھی۔ جب کہ وہ منصوبہ ہی ناکام ہو چکا اور سلسلہ جہاد کی تمام کڑیاں بکھر چکی تھیں۔ چوں کہ اس منصوبہ کا بنیادی کردار خلافت ترکیہ کو انجام دینا تھا اور دوسری مسلم حکومتیں دمعاون بن کر اس کے شریک ہوتیں۔ لیکن جب وہ مرکز اصل قائم نہ رہا تو پوری عمارت ڈھ چکی تھی۔ اس وقت حکومت برطانیہ اس کا سراغ رسانی کا جال پھیلا دیا۔ رولٹ کمیٹی کے ارکان نے اپنی لمبی چوڑی رپورٹ میں جو طومار پر اغلاط جمع کیا ہے اس سے انکی نااہلی و بے لیاقتی اور بے خبری کا پتہ چلتا ہے۔ کیوں کہ اس رپورٹ کے مطابق مولانا عبیداللہ سندھی اس اسکیم کے بانی اور مولانا ابوالکلام آزاد اس کے پشت پناہ اور مددگار بتلائے گئے ہیں۔ حالانکہ خود مولانا سندھی نے کھل کر اس کا اعتراف کیا کہ شیخ نے ان کو کابل جانے کا حکم دیا تھا تو وہ کسی پروگرام سے واقف نہ تھے۔ لیکن کابل پہونچ کر شیخ کی پچاس سالہ عوامی جدوجہد کا نقشہ سامنے آیا۔ (ص ۳۶)

ارکان کمیٹی کے نزدیک حضرت شیخ کو بہکانے ورغلانے اور انجام اسلامی کی تحریک کی طرف گھسیٹنے والے مولانا سندھی تھے اور ان کے خفیہ معاون مولانا آزاد تھے۔ لیکن حقیقت واقعہ اس کے خلاف ہے۔ مولانا سندھی کا بیان گزر چکا ہے اور مولانا آزاد شروع ہی سے ہند کی آزادی کے لئے کسی بیرونی ملک جانے سے قطعاً متفق نہ تھے وہ ملک کے اندر رہ کر تحریک آزادی کو بڑھانے کے قائل و داعی تھے شیخ الہند

نے سرحد پار اس تحریک کے سلسلہ تیس سال کی مدت میں اسے قابل اعتماد شاگردوں کے ذریعہ پھیلایا تھا۔ مولانا آزاد قطعاً نابلد تھے۔

گورنمنٹ برطانیہ کی شیخ کی مالٹا میں نظر بندی اور خفیہ پولس کے ذریعہ پورے ملک میں بھاگ دوڑ اور شیخ کے معتمد لوگوں کی گرفتاری یہ ساری کارروائیاں بالکل اسی طرح کی تھیں کہ سانپ تو نکل گیا تھا لیکن اس کی لکیر کو پیٹا جارہا تھا۔ غالب نامہ وہی مکتوب جہاد جو شیخ نے غالب پاشا سے حاصل کر کے امیر افغانستان اور مجاہدین باغستان کے نام ریشمی پھول کاڑھ کر بھیجا تھا اس کو حاصل کرنے کی پورے ملک میں حکومت نے بڑی دوڑ دھوپ کی، شیخ کے معتقدین کی خانہ تلاشیاں لیں گرفتاریاں کیں۔ جیل خانہ میں ان بزرگوں کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں۔ لیکن شیخ کی کرامت سے کچھ ہاتھ نہ آیا۔ نہ کوئی سراغ نکل سکا۔ غرض گورنمنٹ برطانیہ اس تحریک کا پتہ اس وقت چلا جب چڑیاں کھیت ہی چگ چکی تھیں۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ برطانیہ عظمیٰ کے خفیہ محکمہ کی نااہلی و ناکارگی اور ایک فقیر بے نوا کی عزائم کی پختگی کمال رازداری، اور استقامت ایمان کی مضبوط و نقش و مستند دستاویز ہے۔

تحریک کی اہم شخصیات:۔ اس تحریک کے سلسلہ میں جن جن افراد کو ذمہ داریاں سپرد کی جانے والی تھیں ان کی تعداد انڈیا آفس کی ریکارڈ کے اعتبار سے ۲۲۲ تھی، جن کے اندر خلیفہ ترکی، شاہ ایران امیر کابل بحیثیت سرپرست کے اور انور پاشا وزیر جنگ ترکیہ، عباس حلبی (مصر) شریف مکہ، اور نائب السلطنت اور معین السلطنت کابل، نظام حیدرآباد والی بھوپال، نواب رام پور، نواب بھاول پور مرکزی شخصیتیں تھیں مرکزی فوج جنود اللہ کے نام سے مقرر کی گئی تھی۔ اس کے سالار اعظم خود شیخ الہند نائب سالار مولانا عبیداللہ سندھی تاج محمد امروٹ (سندھ)

حاجی صاحب ترنگ زئی (سرحد)، ملا کوہستانی خاں باجوڑ ڈاکٹر انصاری حکیم عبدالرزاق نابینا مولانا منصور انصاری، مولانا آزاد، مولانا مدنی مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں کو لفٹیننٹ جرنل ہونا طے کیا تھا۔

میجر جرنل میں علامہ سید سلیمان ندوی (ہند)، کاظم بے (ترکیہ)، مولانا محمد علی قصوری وغیرہ تھے۔

کرنل کے عہدہ پر مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد صادق کراچی مولانا عزیز گل، خواجہ عبدالحی فاروقی اور مولانا فضل ربی تھے۔اسی طرح میجر اور کی فہرست اس کے علاوہ تھی۔

تحریک شیخ الہند پر تبصرہ

اب ہم اس تحریک کے آغاز وانجام پر ایک اجمالی تبصرہ کرنا اور اس کو نقطہ اختتام بنانا چاہتے ہیں۔

مولانا غلام رسول مہر نے اس تحریک کا تعارف اس طرح کرایا ہے کہ حضرت شیخ نے ۱۸۷۹ء ۱۲۹۱ھ میں ایک جمیعت ثمرۃ التربیت کے نام سے قائم کی تھی حضرت شیخ کی تحریک ولی اللہ جہاد کی کڑی تھی۔ اس کا سلسلہ شاہ اسماعیل شہید، اور سید احمد شہید سے جاکر ملتا ہے دونوں کے مقاصد مسلمانوں کی سربلندی اور ہندوستان کی آزادی کے لئے یکساں تھے۔ دونوں ابتدائی سرگرمیوں کے لئے آزاد سرحد دیاغستان) کو بین الاقوامی دست اندازوں سے محفوظ رہنے کی بنا پر پسند فرمایا۔ حضرت شیخ الہند نے اس دور میں جب کہ سیاسی سرگرمیوں کے لئے وقت ساز گار نہ تھا۔ ایک نقشہ عمل مرتب کرلیا تھا۔ یہ ایا دور تھا کہ مسلمانوں پر بے یقینی، حیرانی افسردگی طاری تھی۔ پھر شیخ اپنے مرکز علمی (دار العلوم دیوبند) کو فرنگی سامراج کی زد سے بچانا چاہتے تھے۔ اس لئے مکمل رازداری سے اس پروگرام کو آگے بڑھا رہے تھے۔ اپنے شاگردوں اور خصوصی معتقدوں میں سے جس کے خلوص پر اعتماد فرما سکتے ہوں ان کو اپنے اکابر کے نقشہ کے مطابق درسگاہ قائم کرنے کی تلقین کرتے ملا صاحب سنڈا کے حاجی صاحب ترنگزئی جو شیخ کے معتقدین میں سے تھے اسلامی درسگاہوں کا سلسلہ سرحد میں قائم کیا تھا۔ ان کے استاد مولانا نانوتوی نے بھی

ہندوستان میں یہ اسلامی قلعے قائم کئے تھے۔ جن کے ذریعہ تعلیم دینی کے ساتھ جہاد اسلامی کی تعلیم بھی شامل تھی۔ جیسا کہ حضرت سید شہید نے اپنی تحریک جہاد میں اس زمانہ کے ذوق کے مطابق پیری، مریدی اور بیعت و اصلاح کا رنگ اختیار کیا تھا (سرگذشت ص ۵۵) چنانچہ حضرت شیخ الہند بھی اپنے بزرگوں کے طریقہ پر اس سلسلے میں اپنے مخلصوں سے بیعت جہاد لیتے تھے اس موقع پر اس واقعہ کا ذکر غیر مناسب نہ ہوگا۔ کہ راقم الحروف نے ایک بار حضرت مولانا الیاس صاحب بانی دعوت و تبلیغ سے عرض کیا کہ حضرت اس گشت گرداوری کا مقصد کیا ہے۔ جماعتی چلت پھرت کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت نے ارشا فرمایا۔" مالوفات و مرغوبات کو چھڑا کر امت کو مجاہدہ کی لاتن پر ڈالنا۔ جو شخص گھر بار ہی نہ چھوڑ سکتا ہو وہ راہ جہاد پر کیوں کر قدم رکھتا ہے"، مولوی صاحب میں نے بھی حضرت شیخ الہند کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔

حاجی ترنگ زئی فضل واحد عابد، زاہد اور مشہور پیران طریقت تھے۔ ص ۱۸۱ حاجی صاحب کی پوری زندگی انگریزوں کے خلاف جہاد کے لئے وقف ہوگئی۔ ان کے فرزند فضل اکبر عرف بادشاہ گل تھے۔

اور یہ سب روحانی لسبت بھی رکھتے تھے۔ پھر حاجی صاحب ترنگ زئی کے خلیفہ فقیرا ے پی نے تو اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں سے آزادی ہند ۷ سہ ۱۹ء تک انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیتے تھے۔ بہر حال یہ ایک دور رس اور طویل المیعاد منصوبہ تھا۔ جس کے نتائج کے لئے حضرت نوح کی استقامت اور حضرت ایوب کا صبر درکار تھا۔ وہی اس عوام و خواص کی ضروری بنیادی تعلیم کے ذریعہ ان کی صحیح تربیت کا ایا تعمیری منصوبہ تھا جو قوم کے لئے ناگزیر تھا۔ بقول مہر صاحب اس انقلاب سے بڑھ کر مصیبت تباہ کن کوئی نہیں ہو سکتی۔ جس کے عوام پیش نظر مقاصد کی تربیت سے کاملا بے بہرہ ہوں۔ دریاؤں کا پانی نہروں کے ذریعہ کھیتوں میں پہونچتا ہے تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار

کے انبار فراہم کر دیتی ہیں۔ لیکن اگر وہ پانی بے پناہ سیل کی شکل اختیار کر لے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا۔

بہر حال حضرت شیخ الہند اپنے منصوبہ کے مطابق آہستہ رفتار دریا کی طرح اپنے ساحلِ مقصد کی طرف بڑھ رہے تھے کہ ایک دم جنگ عظیم کے سیلاب شدید نے میدان عمل میں ہلچل پیدا کر دی۔ ایک طرف انگریز و فرانسیسی وغیرہ میدان جنگ میں کود پڑے دوسری طرف ترکی خلافت نے جرمنی کا ساتھ دیدیا۔ شیخ کا پیمانہ صبر چھلک پڑا۔ وہ مجبور ہو گئے کہ جس طرح بھی ہو سکے انگریزوں کی فتح کے درمیان مشکلات کے پہاڑ کھڑے کر دیئے جائیں اور ترکوں کے لئے اس سیلاب عظیم سے بچانے کے لئے پشتے باندھ دیئے جائیں۔

چوں کہ یہ دور بقول قاضی عبدالغفار ۱۹۱۲ء نصف آخر ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بہت سی بہت مصیبتیں لے کر آیا۔ اور عام فضا میں بہت سی بجلیاں ان کے سروں پر چمکی یہ ۱۹۱۳ء کی شورش کا پیش خیمہ تھا۔

طرابلس میں اطالویوں اور عربوں کی شورش جو دول مغرب کے اشارہ پر شروع ہوئی۔ ترکوں کی کشمکش ختم نہ ہونے پائی تھی کہ جنگ بلقان کے شعلوں نے خود ترکی کو گھیر لیا۔ امراء کی غداریوں سے ایڈریانوپل کو دشمنوں نے فتح کر لیا اور خود قسطنطنیہ بلقانی فوج کی زد میں آگیا۔ شاہ یونان نے بہ آواز دہل صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا اور سینٹ پیٹرس برگ میں مسجد ایا صوفیہ پر صلیب نصب کرنے کی تمنائیں پرورش پانے لگیں۔

وزیر اعظم برطانیہ نے سالونیکا کی تسخیر پر اظہار مسرت و شادمانی فرمایا۔ اور کہا کہ یہی وہ دروازہ ہے جس سے مسیحیت یورپ میں داخل ہوئی تھی ان واقعات نے مسلم خوابیدہ کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ مولانا محمد علی نے ہمدرد کامریڈ کے ذریعہ زبردست تحریک پیدا کر دی اور ترکی کے لئے ایک طبی وفد کی تجویز ہوئی اور ڈاکٹر انصاری (مرید شیخ الہند) کی شرکت نے اس کو

کی شرکت نے اس کو مکمل کیا۔ (حیات اجمل ص۱۳۱)، اسی ۱۹۱۳ء میں حضرت شیخ الہند نے اپنے معتمد شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی کو دہلی پہونچا کر نظارۃ المعارف القرآنیہ کی درسگاہ قائم کی جو شیخ کے تحریک جہاد کی ایک کڑی تھا۔

پھر ۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی کو کابل بھیجدیا کہ وہ امیر امان اللہ خاں کو آزادیٔ ہند کے لئے تیار کریں اور ایک انجمن خدام خلق بنام جنود اللہ بنائی اور ایک ہندوستانی تعلیم گاہ قائم کرنے کی امیر صاحب سے اجازت چاہی برطانوی سفیر کی مخالفت سے اجازت نہ ملی (چٹان ستمبر ۱۹۵۶ء) اور دوسری طرف سرحد باغستان میں اپنے معتقدوں کے ذریعہ جہاد کا آغاز بھی کر دیا اور بقول شیخ مدنی رح انگریزوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں صاف کر دیں اور انگریز فوج سے ہتھیار اور رسد و مال غنیمت کے طور پر حاصل کرتے رہے (نقش حیات) پھر جو کچھ ہوا وہ نوشتۂ تقدیر تھا۔

البتہ ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ شیخ کا اس وقت کا یہ اقدام ملکی و بین الاقوامی حالات کے لحاظ بر محل اقدام تھا، یا صرف ایک عاجلانہ جذباتی فیصلہ تھا۔ شیخ الہند کا یہ منصوبہ بقول مہر صاحب جو ترکی، جرمنی مشن کے ذریعہ مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ کے اشتراک سے روبہ عمل لایا جاتا امیر حبیب اللہ کی فطری کمزوری اور برطانوی سامراج کے حرص و طمع کے جال میں گرفتاری اس منصوبہ کے لئے سدِّ راہ نہ بنتی اور افغانستان انگریزوں کے خلاف ہندوستان پر حملہ کر دیتا تو شاید نقشہ ہی کچھ اور ہوتا کیوں کہ اس وقت ہندوستان میں کل برطانوی فوجی طاقت گیارہ ہزار ۱۱۰۰۰ سے پندرہ ۱۵۰۰۰ ہزار سے زائد نہ تھی۔ اور حکومت برطانیہ ان معدودے چند گنتی کے فوجیوں کو وردیاں بدل بدل کر پورے ہندوستان میں گشت کرا کے یہاں کے لوگوں پر اپنا رعب جمائے ہوئے تھی۔

اگر افغانوں اور یاغستانیوں کو وافر اسلحہ مل جائے تو معاملہ ہی

کچھ اور ہوتا لیکن جیسا کہ لکھا جا چکا کہ ابھی ہندوستان کی آزادی کے لئے قدرت کی طرف سے کچھ اور مراحل درپیش تھے جس سے گزرنا باقی تھا۔ پھر یہ ابھی بلحوظ خاطر رہے کہ شیخ کی تحریک کے دور میں گاندھی جی عدم تشدد (سینہ گرہ) کا حربہ بروئے کار نہ آسکا تھا اور کانگریس کی جو کوششیں اس وقت ہو رہی تھیں ان سے کامیابی کی توقعات موہوم تھیں کیوں کہ برطانوی ڈپلومیسی برسوں کی جدوجہد کو ایک لمحہ میں خاک میں ملادیتی تھی اس لئے شیخ نے اس وقت جو اقدام فرمایا وہ نہایت موزوں و مناسب موقع پر کیا تھا۔ لیکن ہندوستان کی بدقسمتی نے فرنگی حکومت کی عمر کو اور درازی دیدی بہر حال ولی اللہ سلسلہ کی یہ آخری کڑی حضرت شیخ الہند کی تحریک جہاد پر اختتام پذیر ہوئی۔ اور مالٹا سے واپسی پر آپ نے اپنی حکمت عملی بدل دی

مالٹا کے بعد ۱۹۲۰ء شیخ کی حکمت عملی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب مالٹا کی چارسال نظر بندی کے بعد ہندوستان واپس ہوئے تو نہ اب وہ زمین تھی اور نہ وہ آسمان ہندوستان کیا پورے عالم کی سیاست کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ اتحادی طاقتوں (جس کا سربراہ برطانیہ عظمیٰ ہی تھا) نے ترکی و جرمنی کو شکست دیکر اپنی طاقت و برتری کا پرچم اقوام عالم پر لہرا دیا تھا اور مشرقی اقوام پر اپنا پنجہ پہلے سے زیادہ مضبوطی سے گاڑ دیا تھا۔

ترکی خلافت جو مسلمانان عالم کو کسی حد تک ایک تنظیم سے وابستہ کئے ہوئے تھی اس خلافت کی چاک ہو جانے سے مسلمانان پارہ پارہ ہو چکے تھے سلسلہ ملت کی وہ اجتماعی زنجیر جو سب کو جوڑے رکھتی تھی وہی ٹوٹ چکی تھی ولی اللہی تحریک نے ہر خطرناک موقع پر امت کے اس اجتماعی رشتہ کو قائم و برقرار رکھنے کی سعی کی تھی جیسا کہ جنگ بلقان کے موقع پر شیخ نے

دارالعلوم کو بند کرا کے ترکوں کے لئے چندہ کیا۔ اس سے پہلے ان کے استاد مولانا نانوتوی نے بھی ایسا ہی قدم اٹھایا تھا۔ بہر حال ۱۹۲۰ء ۱۳۲۹ھ مالٹا سے ہندوستان میں آکر ولی اللہی جماعت کے چوتھے امام ہونے کے لحاظ سے شیخ کو اپنے موقف پر غور کرنا اور پچھلی حکمت عملی کو تبدیل کرنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ مجاہدین اسلام کے اس آخری مرد مجاہد نے اس کو محسوس کیا کہ ولی اللہی تحریک کے مطابق مغربی سامراج سے ٹکر لینے کا فریضہ دینی اعتبار سے مسلمانوں پر عائد ہوتا تھا اس لئے آزادیٔ ہند کا سارا بوجھ اب تک تنہا ولی اللہی جماعت نے اپنے سر لے لیا تھا اور ایک صدی سے زائد مدّت تک تن تنہا اب تک راہ جہاد کی تمام قربانیوں میں مسلمان ہی پیش پیش رہے اور قائدانہ کردار ادا کرتے رہے۔ اب حالات کا تقاضا تھا کہ برادران وطن کو اس کے اندر شریک کیا جائے اور اس شرعی فریضہ کی انجام دہی میں شرعی احکامات کی روشنی میں ان کے ساتھ اشتراک کیا جائے۔ موجودہ حالات میں صرف مسلمان یکہ وتنہا برطانوی سامراج سے نمٹ نہیں سکتے۔ برطانوی سامراج نے اپنی ڈپلومیسی کے ماتحت مسلمان، مسلمان اور مسلمان و ہندو کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا کر دی تھی۔ اس وقت انڈین نیشنل کانگریس ملک میں منتشر کہ جماعت بن کر گورنمنٹ سے ملازمانی حقوق کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور حکومت کے پنجہ سے باہر نکل آئی تھی۔ چوں کہ کانگریس کی تشکیل ۱۸۸۶ء میں لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کے دوست مسٹر ہیوم کے مشورہ سے ہوئی تھی جس کا مقصد راعی و رعایا کے درمیان نظام حکومت کی خامیوں اور کوتاہیوں سے صرف مطلع کرنا تھا لیکن کانگریس نے ابتدا ہی سے ہندوستان کے مختلف ومتضاد عناصر کو قومیت کے نقطہ پر اکھٹا کرنا اپنا نصب العین قرار دے رکھا تھا۔ اس لئے یہ نصب العین برطانوی سامراج کی ڈپلومیسی سے ٹکراتا تھا چنانچہ تھوڑے ہی دن بعد گورنمنٹ نے اپنی خود ساختہ جماعت سے آنکھیں پھیر لیں کانگریس کو اپنا نصب العین حاصل کرنے کے لئے ملک کے مختلف فرقوں کو ایک

مشترکہ پلیٹ فارم پر اکھٹا کرنے کا مسئلہ سامنے آیا ظاہر ہے مسلمان جو اب تک راہ حریت میں قائدانہ کردار ادا کرتے چلے آرہے تھے ان کی شرکت کے بغیر کانگریس قومی جماعت نہیں بن سکتی تھی اس لئے کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کا سوال پیدا ہوا، سرسید احمد خاں جو برطانیہ کی ڈپلومیسی کے حامی بن کر مسلمانوں کی قیادت کے لئے آگے بڑھ رہے تھے سب سے پہلے انھوں نے کانگریس کی مخالفت کی یہیں سے مسلم سیاست میں پہلا نقطہ اختلاف پیدا ہوا۔ اس لئے کہ علماء کی ایک جماعت نے (جس کے سربراہ مولانا رشید احمدؒ گنگوہی تھے) کانگریس میں شرکت کا فتویٰ دیدیا تھا اس لئے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ٹکرانے کا برطانوی سیاست کا یہ پہلا آزمودہ تیر تھا جو ٹھیک نشانہ پر بیٹھا۔ اب اس نے اپنے ترکش میں سے دوسرا تیر نکالا اور گورنر یوپی سرانٹونی میکڈاپلڈ نے ۱۹۰۰ء میں ایک گشتی حکم ہندی میں درخواستیں دینے اور ان کو قبول کرنے کا جاری کر کے بقول نہرو اردو ہندی کا سدا بہار فتنہ پیدا کر دیا۔ جس نے ہندو مسلم الگ الگ قومیت کے خیال کی داغ بیل ڈالدی اس کے بعد جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کرانے میں حکومت کو دیر نہ لگی ۱۹۰۶ء میں ایک طرف سر آغا خان کی قیادت میں مسلم لیگ اور دوسری طرف ڈاکٹر مونجے کی سربراہی میں مہاسبھا کے ذریعہ شملہ کی برفیلی چوٹیوں سے فرقہ وارانہ سرگرمیوں کو ہوا دی گئی جوں جوں ہندوستانی سیاست آگے بڑھتی گئی بقول اکبرالہ آبادی کے نسخہ گاؤزبان پلایا جاتا رہا۔ چنانچہ حضرت شیخ جو فرنگی سامراج کی سیاست کے نبض شناس تھے انھوں نے محسوس فرما لیا کہ برطانیہ کی جابرانہ طاقت سے مقابلہ اب طاقت سے نہیں کیا جا سکتا اس لئے حضورؐ کی مکی زندگی سے عدم تشدد کے حربہ کے استعمال کرنے کی تصدیق فرمادی اور برطانوی سیاست کی تفرقہ پردازی کے جواب میں تمام فرقوں میں اتحاد کی طرف قدم بڑھایا۔ چنانچہ مالٹا آنے کے بعد سب سے پہلے اتحاد بین المسلمین کی طرف قدم اٹھایا اور خود علی گڈھ پہونچ کر اس سیاسی خلیج کو پاٹنے کی

کوشش کی جس نے مسلمانوں میں دو قسم قدیم وجدید خیال پیدا کر کے ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اپنے خطبہ صدارت ۲۹ ر اکتوبر ۱۹۲۰ء میں ارشاد فرمایا کہ اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں و کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علیگڈھ) کا رشتہ جوڑا۔ حضرت شیخ کی ملک وملت کی دل سوزی، و بیتابی اور ان کی قلبی تڑپ کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے۔ حضرت کا یہ خطبہ ان کی آخری عمر کا ہے۔

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی گمشدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور، اور ذکر اللہ کی روشنی چمک رہی ہے۔ لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدارا جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں میں خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے۔ خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب وضرب کا حالاں کہ ان کو تو سب سے پہلے جاننا چاہیئے کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے (خطبہ صدارت)

پھر شیخ نے اسلامی اتحاد کے بعد دوسرا قدم برادران وطن کی طرف بڑھایا اور جمیعتہ العلماء کے اجلاس ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں پیغام مرض الموت کی حالت میں ارسال فرمایا کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ نے آپ کے ہم وطن اور ہندوستان کی کثیر التعداد قوم (ہندؤں) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں معین بنا دیا ہے۔ اور اس دونوں قوموں کے اتحاد و اتفاق کو بہت مفید و منتج سمجھتا ہوں۔

حضرت شیخ جب تشریف لائے تو ملک میں علی برادران اور مولانا

عبد الباری فرنگی محلی کے ذریعہ خلافت تحریک کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہمارے نزدیک ہندوستان کی قومی تاریخ کا سب سے زیادہ پُر بہار و خوش گوار دور خلافت کا زمانہ تھا۔ حضرت شیخ کی روحانیت و شرکت سے ہندو مسلم شانہ بشانہ ملا کر فرنگی سامراج کے خلاف نبرد آزما ہو گئے حضرت شیخ ہی کی ایماء پر گاندھی جی کو میدان سیاست میں لا کر کھڑا کیا گیا۔ اور قومی لیڈر کی حیثیت سے تعارف کرایا گیا۔ اور مسلمانوں کے مصارف سے پورے ملک کا دورہ کرایا گیا۔ جمعیۃ العلماء ہند ۱۹۱۹ء میں اپنے قیام کے ساتھ کانگریس سے اشتراک کا فیصلہ کر کے ہندوستانی سیاست میں سرگرمی پیدا کر دی۔ کانگریس کے ساتھ اشتراک اور گاندھی جی کے انوکھے حربہ ستیہ گرہ سے فرنگی سامراج بوکھلا اٹھا اور اس نے اپنے ترکش سے آخری تیر نکال پھینکا شدھی سنگھٹن کے ذریعہ تار پیڈو مارا اور آزادی ہند کو ربع صدی پیچھے ڈھکیل دیا۔ بہر حال خلافت کے اس روحانی بابرکت دور کے علاوہ ہندو مسلم کشیدگی کو حکومت برابر بڑھاتی رہی اور پھر یہ سدا بہار فتنہ پھلتا پھولتا رہا۔ اس کے بعد دونوں قوموں میں قومیت کی ایسی چنگاری سلگائی گئی جس نے خرمنِ اتحاد کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔ پھر ملک کے بٹوارہ ۱۹۴۷ء میں برطانوی سامراج کی قہر بانی نے ملتِ اسلامیہ کو تین تیرہ کر دیا۔ اور ایک ایسی خلیج پیدا کر دی کہ ایک صدی تک اس کا پاٹنا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ فرنگی سامراج کا یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جس کے ذریعہ وہ ایشیاء کو بزعم خود قیامت تک اقتصادی غلامی میں رکھنا چاہتا ہے جس کو لسان العصر اکبرالہٰ آبادی نے نصف صدی پیشتر بیاں کیا تھا۔

یورپ کو پالیسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیاء تک

شیخ الہند کا سانحہ ارتحال ۱۹۲۱ء

حضرت شیخ کا علی گڈھ کی طرف آپ کی زندگی کا آخری سفر تھا۔ جو سفر

آخرت سے پہلے جامعہ ملیہ کی تاسیس کے لئے اس عالم میں ہوا تھا کہ بقول مولانا ابوالکلام آزادؒ "ان کا قلب ان کے قد کی طرح بلکہ پورا وجود اپنے محبوب حقیقی کے آگے جھک چکا تھا"، جسم کے چراغ کا تیل چل چکا تھا اس چراغ کی طرح جو خاموش ہونے سے پہلے بھڑک اٹھتا ہے وہ آخری بار بھڑکا اور آخری سنبھالا لے کر اپنا آخری پیغام قوم و ملت کے نام سنانے کے لئے شیخ اٹھ کھڑے ہوئے شیخ کی ذات بابرکات وہ تھی جن کی پوری زندگی قرآن وحدیث کے انوار و برکات پھیلانے کے درمیان گزری۔ جنھوں نے اپنے آقائے ولی نعمت آقائے دوجہاں سرور مکاں کے مشکوٰۃ نبوت سے خدا کی معرفت ومحبت اور مخلوق خدا کے ساتھ سچی خدمت وشفقت کی روشنی حاصل کی تھی اور وہ مرد مجاہد اپنی ملت کی سرفرازی سربلندی ملک کی حریت وآزادی کے لئے ظالموں کے خلاف مظلوموں کی حمایت میں سربکف میدان میں اترا تھا جب کہ باشندگان ملک میں سے کوئی دوسرا اس کے ساتھ ہم سفر نہ تھا۔ جس معرکہ حق میں عین نوجوانی میں قدم رکھا تھا آخر دم تک جما رہا اور کبھی پشت نہیں دکھائی۔ وہ پچھلے مجاہدین کی آخری یادگار تھے جنھوں نے اعلاء کلمۃ الحق کی خاطر اپنی جان کی بازی لگادی اور کبھی باطل کے آگے نہ جھکا وہ راہ صداقت کے ایسے مسافر تھے جن کی منزل مقصود رضائے الٰہی اور اسی راہ میں سینہ سپر ہوکر امتحانات کے سنگلاخ میدانوں سے گذرتے ہوئے آزمائشوں کی وادیوں کو طے کرتے ہوئے آگے ہی بڑھتے رہے اور کبھی پیچھے مڑکر نہیں دیکھا۔ وہ زار و نزار روح جو برطانیہ کی قوت قاہرہ سے کبھی مرعوب نہ ہوسکی تھی وہ ضعیف ونحیف جسم جو مسلمانان عالم اور باشندگان ہند کے لئے فرنگی سامراج کی غلامی سے آزادی کے لئے کبھی نہ تھکا تھا وہ مصلح ملک وملت جس کی ہڈیاں اپنوں و پرایوں کے غم میں پگھل چکی تھیں۔ جس نے اپنے آقا کی اتباع میں اپنوں پرایوں کا غم کھایا وہ صاحب عزیمت انسان جس کے دست و بازو آدھی صدی تک دشمن کو ہزیمت

دینے کے لئے متحرک رہے تھے وہ روح اب مضمحل وہ جسم اب بے جان اور وہ دست و بازو اب شل ہو چکے تھے۔

اگرچہ اس بوڑھے مجاہد کا حوصلہ اب بھی جواں تھا اور جہاد کا ولولہ اب بھی تازہ تھا لیکن قوائے ظاہری جواب دے چکے تھے اس نے عنفوان شباب سے اپنی بے سروسامانی اور رفقاء کار کی شکستہ حالی کی پروا نہ کرتے ہوئے برطانوی حکومت کی قوت قاہرہ سے مقابلہ کی ٹھانی تھی اور اپنے منصوبہ کی کشتی کو طلاطم خیز موجوں اور ہلاکت خیز طوفانوں کے سمندر میں ڈال دیا تھا اور ایسی جابرانہ قوت سے لوہا لینے کا عزم کیا تھا جو نمرود سے زیادہ طاقت و قوت اور فرعون سے زیادہ شان و شوکت اور قارون سے زیادہ مال و دولت کی مالک تھی۔ لیکن اس مست خدا فقیر کی نگاہ میں اس کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر نہ تھی۔ شیخ کی ہستی اپنی بے نفسی و بے لوثی اور بے غرضی کی وجہ سے ایسی برگزیدہ ہستی تھی جس کے آگے اس کے کٹر دشمن (برطانیہ) نے بھی اپنا سر جھکا دیا۔ وہ ایسی مسلمہ شخصیت تھی جس کی حق پسندی اس درجہ بلند و بالا تھی۔ جب علامہ شبلی کے حریفوں نے ان کی شخصیت پر تہمت کفر کا گرد و غبار اڑایا تو علامہ نے شیخ کے فیصلہ پر اپنا سارا معاملہ رکھ دیا۔ وہ خدا کا سچا عاشق و شیدا تھا جس نے رضائے الٰہی میں خود کو فنا کر دیا اور شہرت و ناموری کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا۔ اس کی تواضع و انکساری چھوٹوں کو بڑا اور ذرّوں کو مہرو ماہ بنا دیا۔ جو ذرہ بھی اس کی خاک کف پا سے چھو گیا وہ کندن ہو گیا، اس کے عزم بلند اور ہمت عالی نے آخری سانس تک شکست کو قبول نہیں کیا اب اس حقیقی کے بارگاہ میں اس کا سر بلند جھک گیا جہاں ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہوگا۔ جہاں ہر انسان کو اس کی نیک عملی کی جزا اور بد عملی کی سزا دی جائے گی۔

جب وہ اپنا دینی و ملّی اور انسانی فریضہ انجام دیکر دربار الٰہی کی حاضری کے لئے تیار ہو گیا۔ تو اس کے آخری وقت کے مشتاقان جمال و کمال کا بیان ہے کہ

حضرت شیخ پر ایک کرب، ایک بے چینی اور ایک اضطرابی کیفیت طاری تھی کہ کبھی اِس کروٹ اور کبھی اُس کروٹ پہلو بدلتے تھے۔ یہ حال دیکھا نہ گیا پوچھنے والوں نے پوچھ ہی لیا تو اس مرد میدان و شہید تسلیم و رضا کی زبان حقیقت ترجمان یوں گویا ہوئی۔ عمر بھر کی تمنا اور آرزو یہی تھی کہ میدان جہاد ہوتا اور اسی معرکہ حق میں محمود کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس میدان میں بکھرے پڑے ہوتے۔ خدا کی راہ میں مارا جاتا پھر زندہ ہوتا پھر مارا جاتا پھر زندہ ہوتا پھر مارا جاتا پھر زندہ ہوتا۔ غرض اس عاشق خدا نے اپنے محبوب حقیقی سے لو لگاتے ہوئے ۱۹۲۱ء میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی، اپنے مخلص مرید ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی میں رہگزائے عالم جاوداں ہوا۔ اس عاشق خدا کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا۔ دہلی و میرٹھ اور درمیانی اسٹیشنوں پر ہزارہا اس کے معتقدوں نے نماز جنازہ ادا کی۔ آخری نماز اس کے وطن کی اس سرزمین (دیوبند) میں پڑھی گئی جہاں اس کا خمیر خاکی تیار ہوا تھا۔ اور ہزارہا انسانوں کے ہجوم و اژدہام میں اپنے محبوب استاد اور شفیق مربّی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے پہلو میں سلا دیا گیا۔ شیخ نے اپنے معاصرین کی طرح زبان و قلم کو زیادہ تکلیف نہ دی۔ اور بہت زیادہ کتابیں نہ تصنیف کیں۔ لیکن اس کی آتش نفسی نے ایسے خصوصی شاگرد اور ایسے اصحاب کمال پیدا کئے جو اپنے وقت کے چاند سورج بن کر افق ہند پر چمکے ان میں ہر ایک اپنے شعبہ کا امام بنا۔ حضرت شیخ کا تقویٰ و طہارت حکیم الامت حضرت تھانویؒ میں ان کی ذہانت و فراست مولانا عبید اللہ سندھی مولانا منصور انصاری میں۔ ان کا تبحر علمی امام العصر انور شاہ کاشمیری میں ان کی ریاضت و مجاہدہ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی میں، ان کی تحریر و تقریر علامہ شبیر احمد عثمانی میں آپ کی حکمت و فقاہت مفتی کفایت اللہ میں اور ان کی قوت عمل مولانا عزیز گل میں جمع ہو گئیں۔

یہ اس نظام شمسی کے روشنی و درخشاں ستارے تھے جنھوں نے آفاق عالم کو

اپنی روشنیوں سے منور کیا۔ جس طرح امام محمد قاسم نانوتوی کی علمی و عملی میراث شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حصّہ میں آئی اسی طرح شیخ الہند کی مولانا مدنی نے فرنگی سامراج کو ایشیا سے بوریا بستر باندھتے ہوئے دیکھ کر اپنی آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ لیکن برطانوی سامراج بھس میں چنگاری ڈال کر ایسا روانہ ہوا کہ اس کی لگائی ہوئی آگ کے دھوئیں سے مشرق اب تک تیرہ و تار رہے۔ آزادی کا سورج ۱۹۴۷ء میں ہمارے ملک کے افق پر خوں فشاں بن کر طلوع ہوا۔ اور فرقہ پرست طاقتوں کے ہاتھوں لاکھوں انسانوں کی نقشوں کو خاک و خون میں لتھڑی ہوئی دیکھ کر ملک و ملّت کا وہ سچا ہمدرد اپنے اکابر و اسلاف کی آخری نشانی (شیخ الاسلام مدنی) باچشم گریاں بادل بریاں اپنے حذر کے دربار میں ۱۹۵۶ء میں جا پہونچا۔ فغفر لہم اللہ مغفرۃ کاملہ اور تحریک شیخ الہند کا آخری مجاہد بھی سو گیا۔

نواب محی الدین خاں مرادآبادی قاضی ریاست بھوپال

ریاست بھوپال کے علماء و فضلاء کی پوری تاریخ ولی اللٰہی دعوت کی تاریخ کی ایک شاخ ہے۔ جس سے ریاست آغاز سے ہی آخری دور تک وابستہ رہی چنانچہ حضرت شیخ الہند کی تحریک جہاد میں بھوپال کا بھی حصہ رہا جب شیخ نے مولانا سندھی کو دیوبند سے بھیجکر ۱۳۰۰ھ میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کے ذریعہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ربط پیدا کر کے ان کے اندر روح جہاد کو پھونکنا چاہا تو سب سے پہلے مالی تعاون دو سو روپیہ ماہانہ بھوپال سے کیا گیا۔ پھر نواب محی الدین خاں صاحب قاضی ریاست بھوپال کے واسطہ سے نواب سلطان جہان بیگم قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت ہوئیں اس لئے حضرت گنگوہیؒ کے خلیفہ ارشد حضرت شیخ الہند سے قلبی عقیدت رکھتی تھیں۔ چنانچہ جب شیخ سفر حجاز کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو سلطان جہاں بیگم بھوپال نے

اس کی استدعا کی کہ شیخ بھوپال کے راستہ سے بمبئی تشریف لے جائیں۔ تاکہ ریاست کو حضرت کی زیارت و خدمت کا موقع مل سکے۔ لیکن شیخ سیاسی مصلحت کے تحت انکار فرمایا۔ شیخ کی تحریک کے سلسلہ میں رازداری کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے وقت سے پہلے اپنے منصوبہ سے ان ذمہ داروں کو بھی ظاہر نہ فرمایا جن سے آگے کام لیا جانا طے کیا تھا۔

تاریخ قضاۃ بھوپال میں نواب محی الدین خاںؒ کے تذکرہ کو حضرت شیخ کی اس تحریک میں شرکت کیوجہ سے قصداً نظر انداز کیا گیا ہے اس لئے ہم نے ان کا مفصل تذکرہ اپنی تاریخ میں کیا ہے لیکن یہاں اجمالی تذکرہ کرنا چاہتے ہیں نواب محی الدین خاںؒ کون تھے؛ وہ ایسے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں اقتدار سلطنت اور مال و دولت کے ساتھ ساتھ علم و فضل عرصہ سے چلے آرہے تھے۔ وہ نواب حاجی رفیع الدین خاں کے پوتے تھے۔ جو ایک طرف نواب عظمت اللہ خاں صوبیدار اودھ کے پوتے تھے دوسری طرف شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے براہ راست شاگرد اور اپنے وقت کے زبردست عالم و مصنف تھے۔ ان کے دو صاحبزادوں نواب شبیّر علی نواب بشیر علی نے ۱۸۵۷ء میں آخری مغل شہنشاہ ظفر بادشاہ سے ربط پیدا کرکے مرادآباد میں ہنگامہ جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور آخیر میں ایک بھائی شبیر علی بجرم بغاوت اقبال جرم پر پھانسی پر چڑھائے گئے نواب بشیر علی بچ گئے ان کے صاحبزادے نواب محی الدین خاں نے عالمانہ درویشانہ ماحول میں پرورش پائی اور ابتدائی تحصیل و تکمیل کے لئے امام قاسم العلوم نانوتوی کی خدمت و فیض درجت میں پہونچے۔ حضرت شیخ الہند کے رفیق درس و خواجہ تاش اور مخلص دوست رہے۔

قاضی محمد ایوب کے انتقال ۱۲۹۷ھ کے انتقال کے بعد جو ولی اللہی خاندان سے تھے، منصب قضاۃ خالی تھا۔ اس کے لئے اولاً مولانا سراج الحق دیوبندی کو

مقرر کیا گیا۔ ۱۳۲۱ھ لیکن موصوف نے کچھ دن بعد اس سے کمال تقویٰ کی بنا پر انکار کر دیا۔ یہی مولانا سراج الحق ابو سعید بزمی کے جدا مجد ہیں جنھوں نے بھوپال کی سیاست میں زبردست حصّہ لیا۔ پھر نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں وہ ریاست کے قاضی ہوئے (۱۳۲۲ھ) اور ایک دو سال تک بھوپال میں قیام رہا۔

جب حضرت شیخ الہند سفر حجاز کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو قاضی محی الدین اپنے استاد کے محبوب شاگرد و جانشین حضرت شیخ کو الوداع کہنے کے لئے بمبئی تشریف لے گئے اور حکیم محمد اسماعیل اجمیری کے مکان پر شیخ کے دوسرے مخلصوں کے ساتھ چند دن قیام کیا پھر شیخ نے عدن پہونچ کر ایک خصوصی کارڈ قاضی محی الدین خاں کے نام لکھا جس کے اندر اپنے متعلقین کے خیال رکھنے کو کہا گیا۔ در پورٹ رولٹ

جس سے رشتہ یگانگت کا ثبوت ملتا ہے۔ رپورٹ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت شیخ نے حجاز پہونچکر اس تحریک میں قاضی صاحب کو شامل فرمایا۔ جس کے لئے مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری کو خصوصیت سے بھوپال بھیجا گیا حضرت شیخ کا والانامہ قاضی صاحب کے نام تھا جس کو دیکھ کر قاضی محی الدین خاں اس تحریک میں شریک ہو گئے بلکہ سرپرستی قبول فرمائی ریاست سے ایک سال کی رخصت لے کر ایسے گئے کہ پھر بھوپال نہ پلٹے اور اس اہم جلیل القدر مقصد کے لئے ریاست کے منصب کو چھوڑ دیا اور اپنے وطن مالوف پہونچکر پوری رازداری کے ساتھ کام کرتے رہے۔ چنانچہ رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ہے " جدہ کے بعد کے واقعات بیان کرتے ہوئے عبیداللہ نے حضرت مولانا کو جو خط لکھا ہے اس میں نواب محی الدین کا نام ہے یہ شخص اور قاضی محی الدین احمد خاں قاضی ریاست بھوپال ایک ہی ہیں مرادآباد یوپی کے نواب شبیر علی کا فرزند ہے۔ اس کو نواب محی الدین کہا جاتا ہے۔ وہ اور

مولانا محمود الحسن ہم سبق تھے۔ اس وقت سے اُن کے درمیان بڑی گہری دوستی ہے۔ ایم محمود الحسن کی باغیانہ سرگرمیوں سے اس کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ اور سازش جہاد کا رکن تھا۔ جب مولانا مکہ روانہ ہوئے تھے تو ان کو رخصت کرنے بمبئی گئے تھے (بحوالہ تحریک ۹۷)

چنانچہ اسی رپورٹ میں حکیم محمد اسماعیل اجمیری کے ذکر میں ہے کہ مولوی مرتضیٰ حسن، قاضی محی الدین آف بھوپال اور اس کی جماعت کے کچھ لوگ اس کے مکان پر ٹھہرے تھے (تحریک ۶۶)

اسی رپورٹ میں مزید تحریر ہے کہ پھر مولانا مرتضیٰ حسن اور مولانا محمد میاں جب حج سے واپس ہوئے تو ان دونوں نے بھوپال میں قیام کیا۔ باقی جہاں تک حکومت کا تعلق ہے تو انھوں نے اپنے بیان میں بڑی قوت سے کہا کہ وہ حکومت کے وفادار ہیں (تحریک صـ ۱۱۰)

حضرت شیخ الہند کے نام جو ایک خط بغیر دستخط مورخہ ۹/ جولائی اس کے اندر خط لکھنے والے (غالباً محمد میاں ہوں گے) یہ بھی لکھا کہ قاضی صاحب نے بعد ملاحظہ والا نامہ سرپرستی قبول فرمالی جماعت پر اعتماد بحال رکھ کر کام کرنے کی اجازت دی اس کام کو باضابطہ بنانے کے لئے ایک سالہ رخصت لینے کا قصد فرمارہے ہیں (تحریک صـ ۲۶۹)

اس خط کے آخر میں جو بہت طویل ہے یہ بھی لکھا ہے کہ قاضی صاحب حکیم صاحب، ڈاکٹر ذاکر صاحب رائے والے حضور کی مراجعت ہند کے سخت مخالف ہیں (تحریک صـ ۲۲۷)

کمیٹی کی رپورٹوں سے قاضی محی الدین خاں اپنے مخلص بزرگ رفیق کی تحریک کے ساتھ بدل وجاں مدد و معاون رہے۔ اور اس کے چلے جانے پر قاضی محمد حسن مرادآبادی کو بھوپال بلالیا وہ بھی تحریک کے اہم رکن تھے۔ قاضی صاحب نے ۱۳۴۷ھ میں اپنے وطن مرادآباد میں گوشہ گمنامی میں

انتقال فرمایا۔

قاضی محمد حسن مراد آبادی قاضی بھوپال

قاضی محمد حسن مراد آبادی کے مورث اعلیٰ قاضی شریعت اللہ مراد آبادی ابتدأً گدہ مکتیشر اکبر آباد ہوتے ہوئے پھر بحر العلوم سے علوم فقہ حکمت میں کمال حاصل کر کے مراد آباد سکونت پذیر ہوئے بعد ازاں کلکتہ پہونچے اور وہاں برطانوی حکومت کی طرف سے قاضی القضاۃ بنائے گئے۔ ان کے صاحب زادے حسن امام بھی حکومت کے وظیفہ دار رہے۔ قاضی محمد حسن کی ولادت یکم جنوری ۱۸۶۱ ۱۲۷۵ھ ہے۔ (یکم جنوری ۱۸۶۱ء)

مولوی محمد احسن نے جو قاضی محمد حسن صاحب کے بزرگوار ہیں۔ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے ساتھ شاہ عبد الغنی رحؒ سے حدیث کا درس لیا۔ قاضی صاحب نے حضرت نانوتوی کی زیارت کی ہے حضرت نے ان کے لئے دعائے برکت دی تھی ان کے والد ماجد تصوف میں ایسے غرق ہوئے کہ قاضی صاحب کو تعلیم کی طرف توجہ نہ ہوئی والد ماجد کے انتقال کے بعد پورے گھر کا بوجھ آپ کے کاندھے پر آپڑا۔ پہلے کچھ دن ملازمت کی پھر تحصیل علمی کا شوق ہوا۔ رام پور و بریلی میں ابتدائی تحصیل کی پھر مولانا عبد العزیز امروہوی (شاگرد مولانا عبد الحق خیر آبادی)، سے معقولات کی تکمیل کر کے حضرت قطب عالم رشید احمد گنگوہی کی خدمت میں سنہ ۱۳ اتہ ایسے ہی حاضر ہوئے کہ پھر ان کے ہی ہو کر رہ گئے۔ حضرت کی ہمیشہ آپ کے ساتھ مربیانہ شفقت رہی۔ چنانچہ ایک بار حضرت نے فرمایا۔

مولوی محمد حسن نرا مولوی ہی نہیں ہے، سپاہی ہے، منشی ہے۔ محاسب ہے وکیل ہے، زمیندار ہے۔ درزی ہے، باورچی ہے، پہلوان ہے اور حقیقت یہ ہے کہ حضرت الاستاد مرحوم کی سی جامع شخصیت علماء میں بہت کم ملتی ہے حضرت گنگوہی کے ارشاد پر مدرسہ شاہی مراد آباد میں ۱۳۰۸ھ مدرس ہوئے

پھر گلاؤ ٹھی کے مدرسہ اسلامیہ میں پھر واپس مراد آباد ہو کر مدرسہ شاہی میں خدمت تدریس انجام دیتے رہے۔

پھر جب قاضی محی الدین خاں سے ملاقات کے لئے بھوپال تشریف لائے اور نواب سلطان جہاں بیگم نے ریاست کی خدمت کے لئے مجبور کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضرت گنگوہی کے حکم سے مراد آباد میں ہوں۔ چنانچہ جب حضرت کو خط لکھا گیا تو قطب عالم نے لکھا کہ جب سرکار کا اصرار ہے تو وہیں رہ جاؤ۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے وہاں کوئی اچھا کام لے۔ چنانچہ ۲۲ر جنوری ۱۹۰۵ء سے مہتمم مدرسہ وقفیہ و واعظ شہر کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ مدرسہ کی از سر نو تنظیم کر کے جامعہ احمدیہ کے نام سے موسوم کیا۔ پھر اس مدرسہ کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ اس علاقہ میں دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ بنا کہ جس سے بھوپال و بیرونِ بھوپال کے صدہا تشنگانِ علوم اس سرچشمہ سے فیضیاب ہوئے۔ پھر ۱۹۳۱ء میں قاضی ریاست بن کر ۱۹۴۶ء تک اپنی خدمات مفوضہ کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا وہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے۔ بہرحال قاضی صاحب حضرت گنگوہی کے مخلص مرید اور اچھے شاگرد ہونے کے اعتبار سے حضرت شیخ الہند اور ان کی تحریک کے خفیہ طور پر موئد تھے چنانچہ رولٹ ایکٹ کی کمیٹی کی رپورٹ میں ہے کہ

"محمد حسن آف مراد آباد جو دربار کی نظر میں میجر جرنل ہے۔ بھوپال اسٹیٹ کونسل کا ممبر ہے مولانا محمود الحسن کی جماعت کا سر برآوردہ اور ان کے وابستگان میں سے ہے۔ وہ دیوبند کمیٹی کا ممبر ہے۔ (تحریک شیخ الہند ص ۶۵)

مولانا محمد فاضل پھلتی

مولانا محمد فاضل پھلتی جو ولی اللہی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور

ایک عرصہ تک ریاست میں بسلسلہ تدریس قیام رہا۔ حضرت شیخ الہند کے رفیق درس اور حضرت الامام نانوتوی کے شاگرد اور دارالعلوم کے فارغ التحصیل علماء میں سے تھے۔ جن کو سند فراغ ۱۲۸۹ھ میں دی گئی تھی۔ ان کے رفقاء میں مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا عبداللہ انصاری (والد ماجد مولانا منصور انصاری)، مولانا فخرالحسن گنگوہی مولانا احمد حسن امروہی تھے۔ مولانا کے والد ماجد شیخ عبدالماجد تھے۔ قصبہ پھلت جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ولادت گاہ ہے، میں مولانا فاضل ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مقامی علماء سے حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور بعد تکمیل بھوپال تشریف لائے۔ مدارالمہام کے مدرسہ جمالیہ میں درس دیا پھر نواب سلطان بیگم نے اپنے صاحب زادگان عبیداللہ خاں، نصراللہ خاں کا اتالیق مقرر کیا۔ پھر وطن چلے گئے۔ دوبارہ پھر بھوپال تشریف نہ لائے منصب مقرر ہوا اور پھلت میں ۱۳۳۹ھ میں انتقال ہوا۔

حضرت شیخ الہند سے بے حد خلوص و محبت تھی شیخ ان سے ملنے کے لئے سال میں ایک دوبار ضرور آتے اور مولانا فاضل ایسے بزرگ ساتھی سے ملنے دیوبند پہونچتے۔ شیخ کے محرم راز، اور تحریک کے ہمدرد تھے ان کے علاوہ ریاست میں مولانا سعیدالدین رام پوری دیوبند کے قدیمی فارغ التحصیل علماء میں تھے جن کو ریاست بھوپال کی بلند پایہ خدمات کا اعزاز حاصل ہوا۔ ابتدائی حالات سے ترقی کر کے نائب ناظم بن کر معین المہام مقرر ہوئے نواب سلطان جہاں بیگم ان پر پورا اعتماد رکھتی تھیں۔ وہ دارالعلوم دیوبند کے اس دور سے تعلق رکھتے تھے۔ جب کہ وہ آسمان شہرت بن کر چمکنے لگا۔ حضرت حکیم الامت تھانوی مفتی عزیزالرحمٰن صاحب، مولانا حبیب الرحمان عثمانی ان کے ہم درس تھے۔ شیخ الہند سے سلسلہ تلمذ رکھتے تھے اور ریاست میں اپنے ملازمانی فرائض کے ساتھ ہمیشہ درس کا سلسلہ جاری رکھے تھے۔ بھوپال میں

۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

ایسے ہی مولانا عبدالرحمٰن سہواردی جو حضرت مولانا احمد حسن امروہی سے تلمذ خصوصی اور عربی کے بلند پایہ کے شاعر تھے۔ ان کے نعتیہ قصائد کو دیکھ کر دور جاہلیت کے شعراء کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ ابتداً مدرسہ جہانگیریہ میں مدرس ہوئے۔ آخر میں جامعہ احمدیہ کے مہتمم ہو کر ۱۹۳۲ء بھوپال میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ وہ بھی حضرت شیخ الہند کے خاص معتقدین میں سے تھے اور تحریک شیخ الہند سے اندرونی طور پر وابستہ تھے۔ آپ کے بھتیجے مولانا حفظ الرحمٰن نے ہندوستانی سیاست میں نمایاں حصہ لیا اور بہت مقبولیت حاصل کی۔ ان کے علاوہ بھوپال شیخ کے معتقدین کا ایک وسیع حلقہ تھا جس کا ذکر طول کا باعث ہوگا۔ آخر میں ایک ایسی شخصیت کے تذکرہ پر اس سلسلہ کو ختم کرتے ہیں۔ جنھوں نے خود کو گمنام رکھ کر بھوپال میں زبردست دینی و اصلاحی خدمات انجام دیں

مولانا عبدالرشید صاحب مسکین

مولانا عبدالرشید جو مولانا مسکین کے لقب سے مشہور ہوئے۔ مشہور قدوائی خاندان سے تھے۔ وہ اپنے بڑے گاؤں (بارہ بنکی) میں ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ والدین کا سایہ پیدائش سے ہی ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ اس لئے ان کے بڑے بھائی عبدالرؤف صاحب نے تربیت فرمائی۔ مڈل تک تعلیم حاصل کی ۱۹۱۲ء میں بھوپال تشریف لائے اور پختہ عمری کے باوجود قاضی محمد یحییٰؒ کے دامن کو اس قدر مضبوطی سے پکڑا کہ عمر بھر نہ چھوڑا، انھیں کا یہ لقب دیا ہوا ہے۔ مدرسہ سلیمانیہ میں تدریسی زندگی گذاری، راقم الحروف کو حروف شناسی کی سعادت اسی بزرگ ہستی سے حاصل ہوئی عربی تعلیم کا آغاز بھی اسی مشفق استاد سے ہوا۔ وہ صرف ایک دینی معلم ہی نہ تھے بلکہ

ملت کے نونہالوں کے شفیق مربی اور امت کے ہمدرد مصلح بھی تھے قدیم بھوپال کی دینی و اصلاحی و معاشرتی خدمات میں اس بزرگ ہستی کا نام سرفہرست ہے۔ انجمن ہدایت الاسلام کے ذریعہ شہر میں سالہائے سال تک بدعات و منکرات کے خلاف جہاد فرماتے رہے گاؤں گاؤں پہونچکر دینی مکاتیب قائم کرائے۔ بھوپال میں تبلیغی جماعت اور جمیعتہ العلمار کے اصل بانی وہی ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کو الہامی جماعتیں کہتے تھے۔ وہ علمار بھوپال میں پہلے عالم تھے جو ہند و بیرون ہند عالم اسلام کے اخبار و کوائف سے باخبر رہتے اور مسلمان ہند کی تحریکات سے دلچسپی لیتے۔ درحقیقت بے نفسی و بے لوثی اور گمنامی کے ساتھ ملت کی گوں ناگوں خدمات انجام دہی کا جذبہ اور ولولہ ملا تھا حضرت شیخ الہند کی سچی ارادت اس وقت استاد مرحوم کے اس پردہ کو اٹھانے کی سعادت ان کے ایک ادنیٰ شاگرد کو حاصل ہو رہی ہے کہ وہ باقاعدہ حضرت شیخ الہند کے مخلص مرید تھے۔ ہمیشہ دلیسی اشیار استعمال کرتے کھدر پہنتے، فرنگی سامراج سے دلی نفرت تھی وہ عمر بھر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی میں سرگرم رہے اور حیرت انگیز مجاہدات کے ساتھ اپنی زندگی گزارتے ہوئے ۲ / جنوری ۱۲۵۷ھ کو اپنے خدا کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ رحمہ اللہ

علامہ سید سلیمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی قصبہ بہار شریف کے خاندان سادات سے وابستہ تھے۔ ان کے والد ماجد حکیم ابوالحسن اور جد امجد حکیم محمدی اس علاقہ کے معروف و مشہور حکمار میں سے تھے۔ سید صاحب کی ولادت ۱۳۰۲ھ ۱۸۸۲ء میں ہوئی۔ ابو نجیب کینت اور انیس الحسن نام رکھا گیا۔ لیکن گھریلو نام سید سلیمان سے شہرت پائی۔ ابتدائی تعلیم اپنے بھائی ابو حبیب

سے حاصل کی جو حضرت شاہ ابو احمد مجددی بھوپالی کے خلیفہ تھے۔ پھر پھلواری شریف میں شاہ محی الدین اور پھر مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری سے تحصیل علم کر کے ندوۃ العلماء میں تکمیل کی۔ وہاں کے کامل اساتذہ کے ساتھ علامہ شبلی نعمانی کے دامن کو اس مضبوطی سے پکڑا کہ ان کے صحیح جانشین ثابت ہوئے ان کی تعلیمی زندگی ۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۶ء تک رہی دور تعلیمی کے بعد الندوہ کی پھر الہلال جیسے وقیع علمی پرچوں کی کامیاب ادارت کیوجہ سے ملک میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ پھر اپنے استاد کی وصیت کے مطابق دار المصنفین کی تشکیل کر کے علمی و تحقیقی معارف کے مقالات و شذرات نے شہرت کو چار چاند لگائے۔ اگرچہ سید صاحب کی زندگی کا اصلی عنوان تصنیف و تالیف رہا۔ لیکن وقت کی سیاست نے بھی ان کے دامن کو اپنی طرف کھینچا اور جمیعتہ العلماء ۱۹۱۷ء اور خلافت ۱۹۲۳ء کے مجالس کی صدارت کا اعزاز بھی ان کو حاصل رہا۔ ان کی کتاب زندگی نے اس وقت نیا ورق الٹا جب کہ انھوں نے اپنی مقبولیت کے باوجود روحانی تکمیل کے لئے حضرت حکیم الامت تھانوی کی بارگاہ ~~۱۹۳۷ء~~ میں حاضر ہو کر بیعت کی اور مدارج دینی کی تکمیل فرما کے خلافت سے مشرف ہوئے۔

ریاست بھوپال کی خوش قسمتی ہے کہ نواب صاحب بھوپال کی دعوت اور اصرار پر ۱۹۴۶ء میں یہاں قاضی القضاۃ اور امیر الجامعہ بن کر تشریف لائے اور یہاں کے مدارس دینیہ سلیمانیہ و احمدیہ کا اصلاحی فریضہ انجام دیا لیکن چوں کہ یہ دور ملک کے سیاسی احوال کے اعتبار سے نہایت کشمکش کا دور تھا لیگ اور کانگریس کی ادھیڑ بن نے پورے ملک میں غیر یقینی حالات پیدا کر دیئے تھے اس لئے خاطر خواہ نتائج نہ حاصل ہو سکے لیکن بھوپال سید صاحب کے فیوض ظاہری و باطنی سے مستفید ہوا۔ آخر تقسیم ہند ۱۹۴۷ء کے سیلاب نے سید صاحب کو پاکستان پہونچا دیا

عوام وخواص نے استقبال کیا۔ لیکن حکومت پاکستان نے ان کے شایان شان معاملہ نہ کیا۔ بالآخر علم و عمل، تحقیق وتصنیف کا آفتاب جو صوبہ بہار سے طلوع ہوا اور پورے ملک کو اپنی علمی، تصنیفی شعاعوں سے منور کرتا رہا کراچی کے افق پر ۱۹۵۳ء میں غروب ہوگیا

سابقہ ریاست بھوپال کے وہ خاتم القضاۃ تھے۔ لیکن یہاں جس اعتبار سے سید صاحب کا تذکرہ لکھا گیا ہے کہ تحریک شیخ الہند کے ایک رکن تھے۔ جیساکہ رولٹ کمیٹی کے رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے۔ جیساکہ رپورٹ میں ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی حضرت شیخ سے کتنی عقیدت تھی اس کا اندازہ اس گفتگو سے کیا جاسکتا ہے جو لندن میں وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے نوری سعید پاشا حداد پاشا سے کی تھی

"میں نے کہا کہ مسلمان ہند یہ تصور کر کے عرب کی مقدس سرزمین بھی ان کے لئے امن وامان کا گھر نہیں غمزدہ ہیں وہ حاجیوں سے یہ سن کر کہ وہاں انگریز فوج برسر اقتدار ہے خون کے آنسو روتے ہیں۔ ہندوستان کے مقدس ترین عالم علمائے ہند کے مسلم شیخ اور ہمارے ملک کے پیشوائے ملت وامام شریعت مولانا محمود الحسن صاحب نے ہجرت کر کے بلد الامین میں پناہ اختیار کی۔ وہ سیاست و پالٹکس کے نام سے بھی آگاہ نہیں وہ کفرستان سے بھاگ کر نور وایمان کے مسکن میں گئے۔ لیکن وہاں بھی انھیں پناہ نہ ملی یہ اس بلاد الحرام کی تحقیر نہیں جو عاصی ومجرم کا بھی حامی ہے لیکن حامی نہیں تو اس مسلمان کے لئے جو ملت بیضا کا ہادی اور شریعت غرا کا شارح ہے ہمارے صوبہ کی کونسل میں جب ان کی قید کے متعلق سوال کیا گیا تو جواب ملا کہ ان کو برٹش گورنمنٹ نے نہیں بلکہ عرب گورنمنٹ نے قید کیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو کیوں کر کسی عرب حکومت کی خود مختاری کا مسلمانوں کو یقین آئے۔ خداد پاشا سے ابھی اس کے متعلق کچھ سنا ہے نوری سعید نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ اور

مولانا کا نام ایک پرچہ پر لکھ لیا اس کے بعد شکریہ ادا کیا۔ (فرنگ)

مولانا عبدالحلیم صدیقی بھوپالی

مولانا عبدالحلیم صدیقی مشہور علامہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی کے خاندان سے تھے جن کو حکومت شرقیہ نے جونپور نے ملک العلماء کا خطاب دیا تھا۔ جونپور کے بعد یہ خاندان نواح لکھنؤ میں آباد ہوا۔ پھر حکومت آصفیہ لکھنؤ کی افراتفری کے بعد میں مولانا کے اعزہ بھوپال تشریف لائے اور مولانا کی ولادت تقریباً ۱۸۹۲ء میں ہوئی۔ ابتداً حفظ قرآن کی دولت سے مالامال ہوئے جس کا سلسلہ تراویح میں عمر بھر جاری رہا۔ بڑے جید حافظ تھے اور پر درد لہجہ میں تلاوت کرتے تھے اس کے بعد مدرسہ سلیمانیہ و جامعہ احمدیہ میں تحصیل فرمائی۔ بھوپال کے مشہور مصنف علامہ ذوالفقار احمد نقوی اور مولانا عبدالرحمٰن سہواروی سے عربی زبان و ادب کی تکمیل کی قاضی یحییٰ صاحب اور دیگر کامل علماء سے تکمیل فرمائی۔ اردو و عربی میں شعر کہتے تھے اور ذکا تخلص تھا۔ ان کی علمی و ادبی قابلیت کا جب شہرہ باہر پہونچا تو کانپور میں مدرسہ الٰہیات میں مدعو کیا گیا۔ جہاں انھوں نے علامہ آزاد سبحانی بانی تحریک ربانی کی معیت میں طلبہ کو فیض پہونچایا۔ پھر ندوۃ العلماء کی نظامت کا اعزاز بھی ان کو حاصل ہوا۔ مسجد کانپور کے حادثہ ۱۹۱۳ء نے مسلمانان ہند نے برطانوی سامراج کے خلاف علم بغاوت کی دعوت دی تھی اس لئے مولانا بھی اپنی آزاد مزاجی و حریت پسندی کی بنا پر میدان سیاست میں کود پڑے۔ خلافتی تحریک میں گرم جوشی سے حصہ لیا۔ پھر ۱۹۱۹ء کے بعد جمیعۃ العلماء ہند کے ناظم ہوئے۔ جس پر قید و بند کی مسلسل دار و گیر پر استقامت کے ساتھ قائم رہے۔ حضرت شیخ الہند پھر حضرت شیخ مدنی قدس سرہ سے ایسے وابستہ

ہوئے کہ آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء عوامی خدمت میں بے نفسی و بے لوثی کے ساتھ لگے رہے۔ آخر وہ مرد مجاہد فخر ملک و ملت، نازش بھوپال اپنے عہد و پیمانِ خدمت کو پورا کرتا ہوا اپنے خدا سے جا ملے۔

تاریخ جنوں یہ ہے کہ ہر دورِ خرد میں
اک معرکۂ دار و رسن ہم نے بنایا

تاریخ آزادئ ہند میں بھوپال کا حصّہ

جس کے اندر آزاد فضا اور کھلی آب و ہوا میں ریاست کی ابتدائی تشکیل یہاں کے نوابوں کے دور میں حریّت پسندانہ و مساویانہ ماحول میں عوام سے ارتباط پھر فرنگی سامراج کی معاہداتی سیاست کے ذریعہ جکڑبندی اور ان کے خلاف ردعمل، جہاد آزادی ۵۷ء میں بھوپال کے آزادی پسندوں کی شرکت نواب صدیق الحسن خاں کی خفیہ تحریک حریّت، مولانا برکت اللہ بھوپالی کی آزادئ ہند کے لئے بین الاقوامی سرگرمیاں، ریاست کے آخری دور میں کانگریس کی تحریک کے ساتھ مقامی انجمنوں کے اشتراک کا ذکر کیا گیا ہے۔

اثر خامہ
وجدی الحسینی، قاضی بھوپال

تاریخِ آزادی کا اجمالی خاکہ

پرانی ریاست بھوپال سترھویں صدی میں مرکز کی کمزوری اور طوائف الملوکی کی پیداوار ہے۔ آزاد سرحد (سرا) کے ایک آزاد سردار دوست محمد خاں نے ۱۷۰۹ء میں مالوہ کے پر خطر اور جنگلات سے معمور خطہ (گونڈوانہ) میں اس چھوٹی سی ریاست کی داغ بیل ڈالی۔

سردار صاحب اور ان کے اخلاف سیدھے سچے مسلمان اور دلاور و غیور پٹھان تھے۔ انھوں نے راعی و رعایا، راجا پرجا کے درمیان آزادانہ ماحول کے سائے میں ریاست کو پروان چڑھایا۔ جب کمپنی بہادر نے اپنی ناپاک استحصالی سیاست کے ماتحت ملک پر اپنے پنجہ جمانا شروع کئے تو نواب وزیر الدولہ والیِ بھوپال کو اپنی سنہری و روپہلی زنجیروں میں ایک معاہدہ کے ذریعہ جکڑ بند کر لیا جس کے خلاف ارکان ریاست میں اندرونی ردِ عمل ہوا۔ ان کے صاحبزادے نواب نظیر الدولہ کا قتل اسی کا شاخسانہ ہے۔ نوابوں کے دور کے بعد جب بیگماتی دور میں پورے ملک کے اندر طوفان بغاوت (۱۸۵۷ء کا جہاد آزادی) اٹھ کھڑا ہوا تو سردار فاضل محمد خاں نے (جو اسی خاندان کے معزز ترین فرد تھے) فرنگی سامراج سے کھلے میدان میں ٹکر لی اور راہ حریت میں جام شہادت نوش کیا پھر نواب صدیق الحسن خاں نے اپنے دور حکومت میں تحریک آزادی کا ایک ڈول ڈالا جو ان کی نوابی سے معزولی و برطرفی پر ختم ہوا۔ برطانوی سامراج نے ہنگامۂ ہندوستان ۱۸۵۷ء کے بعد جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا اس سے متاثر ہو کر بھوپال کے پر جوش و انقلابی عالم مولانا برکت اللہ بھوپالی نے بیرونی دنیا میں آزادئ ہند کے لئے جان توڑ کوشش کر کے اس مسئلہ کو بین الاقوامی مسئلہ بنا دیا اور اس راہ میں اپنی زندگی کی بازی لگا کر جلاوطنی کے عالم میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

جب خلافت کانگریس کی سرکردگی نے ۱۹۲۰ء میں آزادی کے لئے وطن

دوست جانبازوں کا قافلہ آگے بڑھا تو ایک طرف بھوپال کے مخلص افراد نے تحریک ہجرت کے سنگلاخ راستہ میں قدم رکھا اور دوسری طرف انجمن خدام وطن (پرجا منڈل) کے کارکن ریاست کے اس گھٹے ماحول میں مردانہ وار آزادی کے جدوجہد کے میدان میں کود پڑے اور ان بہادر وطن دوستوں نے ظلم وستم اور قید و بند کی ہر دعوت پر لبیک کہا۔

غرض ریاست بھوپال کی آزادی کی راہ میں قربانیوں اور جانفشانیوں کی ایک مسلسل خونی و رنگین ایک شاندار داستان ہے جو تاریخ ہند کا ایک اہم باب ہے اور ابھی تک عام نگاہوں سے اوجھل رہا ہے تاریخ آزادی ہند کے اس مخفی و پوشیدہ گوشہ پر سے اس کتاب میں پردہ اٹھایا گیا ہے۔

بیسویں صدی اور مغربی اقوام کا عروج

قدرت کا یہ عظیم الشان کارخانہ (جو آسمان و زمین کی گردشوں کے درمیان قائم ہے) ہمیشہ سے انقلاب کا گہوارہ رہا ہے بقول اقبال اگر اس عالم میں کسی چیز کو قیام و ثبات حاصل ہے تو وہ خود تغیر و انقلاب ہے اقوام عالم کی تاریخ اسی انقلاب کے گہوارہ میں جھولتی رہی ہے کبھی کوئی قوم ترقی کی چوٹیوں پر پہونچتی ہے تو پھر وہی کبھی پستیوں کے گہرے گڑھے میں جا گرتی ہے خدا نے قوموں کو عروج و زوال کے لیے جو قانون مقرر کیا ہے اس کے مطابق ہر قوم ترقی و تنزل کے مرحلوں سے گذرتی ہوئی اپنی منزل تک پہنچتی ہے۔

دنیا کی پچھلی تاریخ کا ایک ایسا دور گذرا کہ ہر ایجاد ہر ترقی کا سورج مشرق کی سرزمین سے طلوع ہوتا تھا کیا مذہب و تمدن کیا تہذیب و تمدن ان سب کی شعاعیں سب سے پہلے مشرق سے پھیلیں مشرقی ترقیات کا آفتاب جب نصف النہار پر پہنچ کر مغرب کی طرف جھکنے لگا تو یہ روشن علاقہ اندھیرے کی لپیٹ میں آتا گیا مغرب کے خطہ میں روشنیاں پھیلنے لگیں اور مغرب کی فتوحات کا دروازہ کھل گیا۔

موروں (عربوں) کی سرزمین اندلس (ہسپانیہ) عظمی نے علم تجربی (سائنس) کا جو پودا پندرہویں ۱۶۰۰ء صدی میں لگایا تھا وہ جرمن فرانس اور انگلستان کی ہواؤں میں سولہویں صدی ۱۷۰۰ء میں پنپ کر ایک عظیم الشان درخت بن گیا لیکن سائنسی پودے کے جو اصل بانی تھے وہ خانہ جنگی،

برادر کشی کے بھنور میں پھنس کر غرقاب ہو گئے اور اہل مغرب اس کے بانی مبانی بن گئے۔

سولھویں صدی ۱۵۰۰ء مغربی فتوحات کا پیغام لے کر آئی سائنسی ترقیات نے ان کے لئے سمندروں کے راستے کھول دیے اور مغربی سامراج کے جنگجو بیڑے افریقہ و ایشیاء کے وسیع سمندروں اور کھلے ساحلوں پر غارت گری اور لوٹ مار کے لیے اترنے لگے جیسا کہ لکھا جا چکا سب سے پہلے ہسپانوی سامراج نے امریکہ میں اور اس کے دیکھا دیکھی پرتگال نے ایشیائی و افریقی علاقوں میں نوآبادیاتی جال بچھا دیا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہالینڈ فرانس اور انگلستان کی سامراجی حکومتیں مفت کی اس لوٹ مار کے اندر ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں مقابلہ پر اتر آئیں جیسا کہ گذر چکا پہلے ان مغربی قوموں نے تاجروں کا بھیس بدل کر ہر طرف سامراجی ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے اور افریقہ و ایشیاء کی کمزور اقوام کو لقمہ تر سمجھ کر ہضم کرنا چاہا اور ان علاقوں کو مفت کا مال سمجھ کر مشرق کے سیدھے سیدھے لوگوں کو نرم چارہ سمجھ کر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور پھر تکا بوٹی کرنے میں ایک دوسرے سے الجھ پڑے ہر سامراجی قوت نے یہی چاہا کہ وہ تن تنہا اس خوان یغما پر قبضہ کر لے۔

سترہویں ۱۶۰۰ء و اٹھارہویں ۱۷۰۰ء صدی میں ان یورپی قوموں نے پادریوں کی فوجوں کو ہراول دستہ کے طور پر یسوع مسیحؑ کے پیغام محبت کو پہونچانے کے لیے آگے آگے رکھا ان کے لبوں پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پیغام محبت تھا لیکن ان کے پیچھے توپیں مشینیں گنیں اور خون کے برسانے والے ہتھیار تھے جن کے بل بوتے پر وہ ان پسماندہ قوموں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لیے سرگرم رہے۔

ان پچھلی صدیوں میں یسوع مسیح کے نام لینے والی قوموں نے ایشیا و افریقہ کے بے گناہ و معصوم انسانوں اور بے زبان مخلوق کی جس قدر خون کی ندیاں بہائیں

ہیں کہ ان کے آگے چنگیز و ہلاکو کی خون خواریاں بھی ماند پڑگئیں سینٹ پال کی جھوٹی عیسائیت نے اپنے کالے کرتوتوں سے نہ صرف عیسائیت کی طرف سے عام لوگوں کے دلوں میں نفرت و بیزاری پیدا کی بلکہ نفس مذہب کی عظمت کو دلوں سے مٹا دیا

انسانی تاریخ کی ظالمانہ خونیں داستان کا ظالمانہ عروج پچھلی صدیاں ہیں انیسویں صدی تک پہونچتے پہونچتے ایشیا و افریقہ کے بہت بڑے علاقوں پر برطانیہ و فرانس اور ہالینڈ کے سامراج نے اپنا خونی پنجہ مضبوطی سے جما دیا جنگ عظیم ۱۹۱۴ء کے اختتام پر ترکی خلافت کے خاتمہ نے برطانوی و فرانسیسی سامراج کو دنیا کا چودھری بنا دیا مگر انیسویں و بیسویں صدی جہاں مغربی سامراج کا نقطۂ عروج پر پہنچا ہوا تھا۔ وہیں مظلوم و کمزور اقوام نئی انگڑائی لے کر مغربی سامراج کے مقابلہ میں اٹھ کھڑی ہوئیں یہی وہ زمانہ ہے کہ ایشیا و افریقہ میں سامراج دشمن تحریکات نے زور پکڑا۔

مصر میں سعد زاغلول پاشا و فد پارٹی الجزائر میں عبدالقادر افریقہ میں سنوسی تحریک اور عبدالرحمٰن کو اکبی ہندوستان میں خلافت و کانگریس اور ولی اللٰہی تحریک مغربی سامراج سے لوہا لینے کے لیئے کھڑی ہوگئی سامراجی طاقتوں نے جس قدر منصوبہ بند طریقوں سے ان تحریکات کو زور و قوت کے دبانے اور کچلنے کی سازشیں کیں اسی قدر یہ تحریکات ابھرتی اور زور پکڑتی گئیں یہانتک کہ ۱۹۴۷ء کی عالمی جنگ نے نازیت و فسطائیت کی شکست کے ساتھ یورپ کی سامراجی طاقتوں کو بھی ان کی نو آبادیاتی پالیسی نے شکست فاش سے دوچار کر دیا

انیسویں و بیسویں صدی کا ہندوستان

جب بیسویں صدی نے عالم انسانیت پر اپنا سایہ ڈالا تو ایشیا یا مشرق زوال و انحطاط کے آخری کنارے پر آرہا تھا ایشیا کی خود مختار حکومتیں مغربی

سامراج کے پنجۂ غلامی میں گرفتار ہو کر اپنی گلو خلاصی کے لیے پھڑ پھڑا رہی تھیں.
انگلستان نے ہندوستان کو سونے کی چڑیا سمجھ کر اس کے پر و بال ہی نہیں
اکھاڑے بلکہ یہاں کے باشندوں میں اختلاف و نفاق کا بیج بو کر دائمی خانہ جنگی کے
راستہ کو ہموار کر دیا ایشیا کی قومیں صدیوں سے عیش و عشرت اور غفلت کے
خواب شیریں میں محو ہو کر اور بیرونی طاقتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر کے
جاہ و اقتدار اور حصول سلطنت کے چکر میں مبتلا تھیں باہمی رسّہ کشی کا سلسلہ
جاری تھا۔ فرنگی سامراج نے ایسا پر فریب ہمرنگ زمین جال بچھایا اور جارحانہ
قومیت و وطنیت کے ہاتھوں تفریق کی لکیریں کھینچ کر اور جغرافیائی حدبندیوں سے
ملکوں کی تقسیم کر کے باہمی جنگ کی بنیادیں استوار کیں اور ایک دوسرے کے
درمیان اونچی اونچی دیواریں کھڑی کر دیں۔ جب مغربی اقوام کا نو آبادیاتی نظام
امریکہ کی سر زمین میں خود یورپ کے باشندوں کی تحریک آزادی سے ٹوٹ پھوٹ کر
رہ گیا اور امریکی ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہوتی چلی گئیں تو ان مغربی
قوموں نے مشرقی ملکوں کو اپنی مکارانہ سیاست اور ناجائز قبضہ و اقتدار،
ظالمانہ نفع اندوزی کا میدان بنایا پھر جیسا کہ معلوم ہے کہ ہندوستان و دیگر
ایشیائی ملکوں کو فرنگی سامراج نے اپنی طاقت و قوت سے زیر نہیں کیا بلکہ
سامراجی ڈپلومیسی لڑاؤ بھڑاؤ جیسے ہتھیاروں سے فتح کیا اور یہاں کے
باشندوں کو مہذب بنانے کے نام پر اپنا خونی پنجہ گاڑ دیا ہمارے نزدیک
ہندوستان کے اندر فرنگی سامراج کو اپنے قصر سلطنت کے استحکام و توسیع میں
دو باتیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں سب سے پہلے بقول نواب صدیق حسن خاں
ہندوستانی ریاستیں ہیں جن کو معاہدات کی زنجیروں میں جکڑ بند کر کے
اپنی عظیم سلطنتی بنیادوں کو مضبوط کیا اور اپنی حکومت کی مدت بڑھائی چونکہ
حسب معاہدات مفت کے فوجی و سپاہی آڑے وقت میں ہر طرح کی مالی امداد
ریاستوں سے ملتی تھی دوسرے مسلمانان ہند کا ناجائز استحصال اور منصوبہ بند

استیصال برطانوی سامراج کا مسلمانوں کے ساتھ عمل ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۷۱ء تک منتقمانہ رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر ملکہ وکٹوریہ کے دور تک ان کے ساتھ ظلم وستم اور جبر وتشدد کا کوئی ایسا حربہ نہ تھا جو استعمال نہ کیا گیا ہو صاحبان اقتدار مسلمانوں رئیسوں و نوابوں کو خواہ مخواہ اپنی ریاستوں سے بے دخل کرکے دانے دانے کا محتاج بنایا اور نامی گرامی علما و فضلا پر جعلی وفرضی مقدمات قائم کرکے ان کو جیل خانوں میں ڈال دیا گیا اور نامور و مقتدر عالموں کو کالے پانی بھیج کر ان کی توہین و بے عزتی کی گئی بقول سر ولیم ہنٹر مسلمان ۱۸۷۱ء تک برطانوی حکومت کی طرف سے دبائے گئے (ہمارے ہندوستانی مسلمان) اور ان پر ہندؤں کو غالب کیا گیا بہر حال جب منصوبہ بند طریقہ سے حکومت برطانیہ برادران وطن کو آگے بڑھانے اور مسلمانوں کو پسماندہ بنانے میں کامیاب ہوگئی تو پھر ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی اپنائی گئی خوش قسمتی سے برطانوی سامراج کو سر سید احمد خاں جیسی عظیم شخصیت ہاتھ لگ گئی جو ابتداً سچے مذہبی انسان اور محب وطن انسان تھے جیساکہ لکھا جاچکا انھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھ کر انگریز حکام کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ذمہ دار کھل کر قرار دیا تھا جس کی بنیاد پر وہ قومی سطح پر ابھر آئے اور پھر سر ولیم میور کی کتاب "لائف آف محمد" کے جواب میں خطبات احمدیہ میں سر ولیم کے اعتراضات کے دندان شکن جوابات دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں گھر کر لیا ان کے ابتدائی خیالات یہ تھے۔

"قوم کا اطلاق ایک ملک کے رہنے والوں پر ہوتا ہے یاد رکھو ہندو و مسلمان ایک مذہبی لفظ ہے ورنہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو بھی اس ملک کے رہنے والے ہیں اس اعتبار سے سب ایک قوم ہیں جب یہ سب ایک گروہ ایک قوم کہے جاتے ہیں تو ان سب کو ملکی فائدے میں جو ان سب کا ملک ہے ایک ہونا چاہیئے اب

وہ زمانہ نہیں کہ صرف مذہب کے خیال سے ملک کے باشندے دو قومیں سمجھی جائیں ،، (تہذیب الاخلاق)

سرسید سرکاری ملازمت سے پنشن پانے کے بعد ۱۸۸۲ء میں وائسرائے کی کونسل کے پہلے ہندوستانی مسلمان رکن مقرر ہوئے انھوں نے اسباب بغاوت ہند میں یہ تجویز رکھی تھی کہ وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانی مقرر کئے جائیں چنانچہ اس زمانہ میں اس کونسل میں ہند و مسلم مسائل کو قومی نقطہ نظر سے وہ اٹھاتے رہے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ بنگال میں قومی حقوق طلبی کا آوازہ بلند ہو رہا تھا۔ سرسید نے بنگالیوں کو اس وقت قوم کا سرتاج کہا تھا۔

سامراجی حکومتوں کا ہمیشہ سے یہ ہتھکنڈا رہا ہے کہ وہ قوم و ملک کے ان سچے رہنماؤں کو جو اپنی مخلصانہ خدمات سے لوگوں کے دلوں میں اپنی عظمت کا نقش بٹھا دیتے ہیں یا تو ان کو وہ عہدہ و منصب مال و دولت کا لالچ دے کر خرید لیتی ہے یا اپنی عیاری و فریب کاری کے دام میں پھانس لیتی ہے چنانچہ سرسید پر بھی مسٹر بیک پرنسپل علی گڑھ کالج کے ذریعہ جال بچھا دیا گیا۔ آزادی پسندوں کی طرف سے ان کو خوب خوب بدگمان کیا گیا پھر مسٹر بیک نے علیگڑھ انسٹی ٹیوٹ میں سرسید کے نام سے ان آزادی پسند بنگالیوں کے خلاف سلسلہ مضامین شروع کرا دیا اسی زمانے میں مسٹر ہیوم کے ذریعہ کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں عمل میں آیا تھا حالانکہ کانگریس ابھی تک وہی مطالبات لے کر اٹھی تھی جو سرسید نے حکومت سے کئے تھے لیکن اس سامراجی پرنسپل نے کانگریس کے خلاف محاذ بنا کر مسلمانوں میں کانگریس دشمنی کے جذبات کو ہوا دی۔ سرسید نے کانگریس کے خلاف ۱۸۸۷ء میں ایک معرکۃ الآرا تقریر کی جس کے نتیجہ میں نائٹ ہڈ کا خطاب ملا پھر تو مسٹر بیک مسٹر ماریسن اور پھر راج پولڈ جیسے برطانوی سامراج کے نمائندوں کے ذریعہ جو بدقسمتی سے علیگڈھ کالج پرنسپل بن کر آئے تھے ۔مسلمانوں کے نام سے متعدد جماعتیں قائم

کر دیں جس کے ذریعہ قومی مطالبات سول سروس کا امتحان ہندوستان میں ہونے اور جمہوری اداروں کے قائم کرنے کی مخالفت شروع کر دی اس طرح علیگڑھ کالج کے ذریعہ فرنگی سامراج نے اپنی روپہلی سنہری مصلحتوں کے خاطر مسلمانان ہند کا استحصال کر کے اپنا آلہ کار بنانا چاہا تو سر سید نے اپنی ابتدائی دور سیاست میں ہندو مسلم دونوں کو ملک کی دو آنکھوں سے تعبیر کیا تھا یا شاطر برطانیہ کے سحر سے مسحور ہو کر اینگلو مسلم اتحاد کو ضروری اور ہندو مسلم اتحاد کو ناممکن العمل قرار دیا۔ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ وہی سر سید جو وائسرائے کونسل میں ہندوستانیوں کے شامل ہونے کی پر زور تجویز لکھ چکے تھے اب تین سال بعد ۱۸۸۷ء میں ہندوستان میں سول سروس امتحان جاری کرنے کے اس لئے مخالف ہو گئے کہ اس کے اجراء سے ایک درزی اور ایک ادنیٰ شخص امتحان دے کر معزز شریف لوگوں میں بیٹھنے کے قابل ہو جائے گا گویا چھوت چھات ذات پات کا وہ مسئلہ جس کو اسلام مٹانے آیا تھا اب سر سید اس کے حمایتی بن گئے پھر ۱۸۸۸ء میں میرٹھ کے نوچندی کے میلہ میں انھوں نے کانگریس کے خلاف زبردست تقریر کی جس کی بناء پر ہندو مسلم نزاع کی دائمی داغ بیل پڑ گئی پھر مسٹر بیک نے سر سید کے ہاتھوں انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن (انجمن محبان وطن) مخالف کانگریس قائم کر کے مسلمانوں میں علیحدگی پسندگی کی بنیاد ڈال دی پھر اسی سامراجی نمائندے مسٹر بیک نے مسلمانوں کے نام سے جمہوریت کے خلاف ایک عرض داشت پیش کرا دی کہ ہندوستان میں جمہوری ادارے قائم نہ کئے جائیں جس کی وجہ سے فرنگی سامراج کو موقع ملا کہ وہ قومی جماعت کے مطالبۂ جمہوریت پر ٹال مٹول سے کام لے اگرچہ دس سال بعد ۱۸۹۲ء میں حریت پسندوں کے جمہوری مطالبہ کے آگے حکومت کو سر جھکانا پڑا لیکن مسلمان بدنامی سے دوچار ہوئے جیسا کہ لکھا گیا لارڈ کرزن نے بنگال کے قوم پرست ہندوؤں کا زور توڑنے کے لیے مسلمانوں کو خوش کرنے کے بہانے تقسیم بنگال کا ۱۹۰۵ء میں اعلان کیا کہ ایک اسلامی صوبہ مسلمانوں کو

اکثریت کے لیے بنایا گیا ہے جس کی بنا پر متحدہ بنگال کے ہندو مسلم فرقوں میں زبردست کشیدگی پیدا ہوئی جو آگے چل کر بڑھتی چلی گئی مگر بنگال کے قوم پرور ہندوؤں نے سخت شورش برپا کر کے ۱۹۱۱ء میں اس فیصلہ کو منسوخ کرا دیا بقول نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ اس تنسیخ نے مسلمانوں کے دل ٹکرے ٹکرے کر دیئے ان کی وفاداری کا یہ صلہ دیا گیا۔ نواب صاحب نہ صرف سیاست سے دست کش ہو کر بیٹھ گئے بلکہ چند ماہ بعد اسی صدمہ سے انتقال کر گئے۔

نواب وقار الملک جو ہمیشہ طلبہ علیگڑھ کو برطانوی حکومت کی وفاداری کا ہمیشہ سبق پڑھاتے رہتے تھے اس فیصلہ پر چیخ اٹھے اور لکھا

"گورنمنٹ کی یہ پالیسی بمنزلہ ایک توپخانے کے تھی جو مسلمانوں کے مردہ لاشوں پر سے گذر گئی بدوں اس احساس کے کہ ان غریب لاشوں میں سے کسی میں کچھ جان بھی ہے اور ان کو اس سے کوئی تکلیف محسوس ہوگی اناللہ وانا الیہ راجعون"

(روح روشن مستقبل صنہ ۶)

غرض فرنگی سامراج کی پالیسی کی بدولت جس کے حامی سرسید اور ان کے حواریین بن گئے تھے سامراج نے مسلمانان ہند کو قومی سیاست کے دھارے سے الگ رکھنے کی تدبیریں اختیار کیں بلکہ آزادی کی راہ میں ان کو سنگ گراں یا راستہ کا روڑا بنانے کی پالیسی تجویز کی۔

پھر مسٹر میکڈانلڈ نے ۱۹۰۱ء میں اردو دیوناگری رسم الخط کے اجرار کرنے کے احکام جاری کر کے ہندوؤں میں فرقہ پرستی کے جذبات پیدا کرنے کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی عمارت میں ڈائنامنٹ لگا دی جس کی وجہ سے دونوں قوموں کے اتحاد کی عمارتیں مسمار ہوگئیں اگر چہ کلکتہ فورٹ ولیم کالج کے پرنسپل جان گل کرائسٹ نے اردو و ہندی کے الگ الگ شعبہ قائم کر کے ایک صدی پہلے باہمی تفریق کی بنیاد رکھ دی تھی لیکن میکڈانلڈ نے اس کی عملی تشکیل کر کے باہمی تفرقہ کی عمارت کھڑی کر دی۔

اردو مسلمانوں کی نہ قومی زبان تھی نہ ملی زبان ۔ ان کی ملی زبان عربی اور قومی زبان فارسی، ترکی وغیرہ تھیں لیکن مسلمانوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تو اپنی مادری زبانوں کو قربان کر کے مقامی زبانوں سے مخلوط زبان اختیار کی جسے ابتدار ہندی ۔ دکھنی ۔ گجری مختلف نام دیئے گئے اور آخر میں اردو ئے معلیٰ کا جس نے لقب اختیار کیا ۔

مسٹر میکڈانلڈ نے اس طرح ہندوستان میں اس لسانی تنازع کی جڑ بنیاد رکھ دی جو آگے چل کر سدا بہار فتنہ بن گیا آج ملک میں جہاں لسانی و جغرافیائی مزاعات برپا ہیں ہماری سابقہ مہربان گورنمنٹ کی پالیسیوں کا نتیجہ ہیں ۔

اس کے بعد جداگانہ انتخاب کو برطانوی سامراج نے جاری کر کے ملکی متحدہ سیاست کے پرخچے اڑا دیئے چنانچہ فرقہ پرستی کا جو بیج سامراجی مورخوں نے بویا تھا وہ بیج پھوٹ کر پھل پھول لایا فرقہ دارانہ انتخابات کی بیل پر چڑھ جانے کی وجہ سے زبان کا مسئلہ بقول مولانا منگلوری کریلا اور نیم چڑھا ہو گیا (روشن مستقبل ص ۹۴)

فرقہ وارانہ انتخابات کو برطانوی سامراج نے جس مقصد کے لیے جاری کیا تھا اس کے لیے اس وقت کے ایک اہم برطانوی سیاستداں مسٹر لانٹل کرڈٹس کے خط سے اس کی حقیقت کھلتی ہے وہ لکھتا ہے ۔

دو چند سال ہوئے جب کہ طریقہ انتخاب جاری کیا گیا تھا اس وقت جداگانہ انتخاب کا کہا ماننا گورنمنٹ کی سب سے بڑی غلطی تھی جو اس سے ہندوستان میں سرزد ہوئی میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان میں جداگانہ انتخاب کا اصول مستقل طور پر قائم ہو گیا تو ہم ہندوستان میں ذات پات کا ایک نیا طریقہ جاری کرنے کا موجب ہوں گے اور یہ وہ طریقہ ہو گا جو ہندوستان کو سال بسال گھن کی طرح کھاتا رہے گا جب تک یہ طریقہ جاری رہے گا ہندوستان قومیت کے لحاظ سے کبھی متحد نہ ہو سکے گا جتنے عرصہ تک وہ قائم رہے گا اتنی ہی مشکل اس کے استیصال کرنے میں پیش آئے گی نتیجہ یہ ہو گا کہ آخر کار اندرونی خانہ جنگی اس

ملک کا خاتمہ کرے گی (بحوالہ سابق ص ۹۴)

سو سال پہلے برطانوی سامراج نے جس تہذیبی سانچہ پر ہندوستانی سیاست کو ڈھالا تھا اس کے تلخ نتائج پیدا ہونے اور کڑوے پھل لگنے میں زیادہ دیر نہ لگی جو ہونا تھا وہ ہوا لیکن یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ علیگڈھ کی سیاست کا محور مٹھی بھر مخصوص افراد تھے ورنہ عام مسلمانان ہند کو نہ ان امور سے آگاہی دی جاتی تھی نہ ان کو خوشامد پرستانہ سیاست سے دلچسپی تھی وہ ان جلسوں میں گاہے ماہے تماشائی کی حیثیت سے ضرور شریک ہو جاتے تھے عام مسلمان مذہبی و دینی خیالات کے حامل تھے اس لیے وہ علماء کرام کے پیچھے چلتے رہے تھے چنانچہ جب سنہ ۱۹۱۹ء جمعیتہ علماء ہند نے میدان میں قدم رکھا اور خلافت کی تحریک ہندوستان بھر میں جنگل کے آگ کی طرح پھیلی تو مسلم عوام اپنے اصلی حریت پسندانہ جذبات کی بناء پر جوق در جوق ملکی سیاست میں امنڈ پڑے۔

جنگ عظیم سنہ ۱۹۱۴ء میں اتحادیوں کی فتح نے جن کا چودھری برطانیہ بن گیا تھا اس کے سر غرور کو اتنا بلند کر دیا کہ برطانیہ نے ہندوستان کے لیے حقوق ملکی اور آزادی ہند کے پچھلے وعدوں کو پس پشت ڈال کر جلیانوالہ باغ کا تحفہ جنرل ڈائر کے ہاتھوں اہل ہند کو پیش کیا اور ہندو مسلم کے خون سے اس باغ کو لالہ زار بنایا جس کے نتیجہ میں یہ دونوں فرقے فرنگی سامراج سے ٹکر لینے کے لیے میدان میں آگئے برطانوی سامراج کی اس مغرورانہ پالیسی نے خود اس کے حامیوں میں برہمی پیدا کر دی علیگڈھ کالج کی نصف صدی کی وفاداریاں آزادی پسند قوم پرور طاقتوں کے آگے رائیگاں ثابت ہوئیں اور خود علیگڈھ کالج سے مولانا محمد علی، شوکت علی، مولانا حسرت موہانی مولانا ظفر علی خاں،، جیسے حریت پسند رہنما سرسید کی پالیسی کے خلاف برطانوی سامراج کے ساحرانہ سیاست کے دام سے باہر نکل آئے اور میدان سیاست میں کود پڑے تحریک خلافت جمعیتہ علماء ہند اور احرار اسلام جیسی قومی و ملی جماعتوں کے

جلوس میں مسلمانانِ ہند نے اپنی افرادی قوت سے زیادہ قربانیاں دیں۔ پشاور کا قصہ خونیں تاتار کا واقعہ آزادیٔ ہند کا سنگ میل ثابت ہوا جس کے اندر سرحدی پٹھانوں نے اپنے خون شہادت سے داستان حریت کو رنگین بنایا افسوس ہے کہ مسلم عوام کی مسلسل وعظیم قربانیوں کے باوجود فرقہ پرستانہ سیاست نے۔ ان حریت پسندانہ تاریخ کو مسخ کر دیا اور علمار حق مجاہدین آزادی قوم پرور مسلمانوں کو قصداً پیچھے ڈھکیل دیا گیا اور جو کچھ عام مسلمانوں نے اپنی تعداد سے زائد آزادی کی راہ میں سرفروشیاں کی تھیں اس کا پھل ان کو نہ مل سکا آزادی سے پہلے بھی آزادی پسند مسلمان اپنی قوم کے اندر نشانہ ملامت بنے رہے اور آزادی کے بعد ہندو فرقہ پرست طاقتوں نے ان کو ابھرنے اور پنپنے کا موقع نہیں دیا رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰنؒ لدھیانوی نے ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے فیصلہ پر وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی اور مسٹر چرچل کو مبارک کا جو تار دیا تھا اس کے اندر لکھا تھا کہ برطانیہ اپنی سامراجی پالیسی میں کامیاب اور علمار حق دو صدی سے متحدہ ہند کی آزادی کے لیے خون کی ندیاں بہنے سے روکنے کی خاطر جو جدوجہد کر رہے تھے اس کے اندر ناکام ہوگئے اب دونوں ملکوں میں خون کی ندیاں بہنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی خود مولانا مرحوم نے راقم الحروف سے یہ بات کہی ۔۔

بہرحال برطانوی سامراج نے ان حریت پسند مسلمانوں کو اپنی مکاری و عیاری کی دودھاری تلوار سے ذبح کر کے انتقام کی پیاس کو بجھایا فرنگی سامراج کی تاریخ نگاروں اور ان کے پیروکاروں نے تاریخ ہند میں ان مسلم رہنماؤں کو (جو تاج برطانیہ کے وفادار تھے) ہیرو کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جن مخلص قائدوں نے ملک وملت کے لیے مخلصانہ قربانیوں کا غیر معمولی ریکارڈ قائم کیا یا نوان کو برے القاب وخطابات سے یاد کیا گیا ہے ورنہ زیادہ تر صفحات تاریخ ان کی زبردست قربانیوں سے خالی ہیں ہماری کتاب کا مقصد ان مخلص

بزرگوں کا اجمالی تعارف و تذکرہ ہے جن کو خاموش وگم نام مساعی سے ہمارا ملک غلامی کی گرداب سے نکل کر ساحل آزادی پر جا لگا ملک و ملت کی راہ میں ان گمنام و خاموش مجاہدوں اور شہیدوں کے جانبازیوں کے لیے ادنیٰ خراج عقیدت ہے۔

ریاست بھوپال بیسویں صدی میں

جیسا کہ اس سے پہلے گذر چکا کہ بیسویں صدی تاریخ انسانی میں اس لیے یادگار رہے گی کہ اس صدی تک پہنچتے پہنچتے مشرقی قومیں اور ایشیائی سلطنتیں زوال کے نقطہ اختتام تک پہنچ گئیں ہمارے ملک پر فرنگی سامراج کی گرفت مضبوط ہوگئی برطانوی سامراج نے اپنے فولادی نظام سے ہندوستان کو ۱۸۵۷ء کے بعد مضبوط شکنجہ میں کس لیا بقول غالب ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

برطانوی حکومت کی سخت گیری اور پچھلے مظالم کی دہشت انگیزی نے ہندوستان میں قبرستان کا امن پیدا کر دیا تھا۔ برطانوی شہنشاہیت کے سایہ میں رہ کر ہندوستان کی ساڑھے چھ سو ریاستیں من مانی کارروائیاں کرتی ہوئی اور عیش و عشرت کے گلچھرے اڑاتی ہوئی چین کی بنسی بجا رہی تھیں اکثر راجہ مہاراجہ نواب و حکمراں برطانوی سامراج کے آغوش میں رہ کر اپنی رعایا کی واقعی ضرورتوں سے غافل و بے پروا تھے اور اپنے اکثر اختیارات فرنگی ماحول کے پروردہ افراد کے ہاتھوں دے کر اپنے محلوں میں داد عیش دیتے رہے ان ریاستوں کا ماحول ایک صدی پہلے کا تاریک ماحول تھا جہاں جدید تعلیم اور عصری تقاضوں کی ہلکی سی روشنیاں بھی نہ پہونچ سکی تھیں یورپ کی ایجادات اور مغرب کی جدید اختراعات یعنی صنعتی ترقیات کی

ہوا تک نہ لگی تھی اس لیے ریاستی باشندے برطانوی ہند کے باشندوں سے
ایک صدی پیچھے تھے حقوق شناسی کا پیمانہ تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے خالی تھا۔
کیوں کہ شخصی حکومت میں سیاست ایک شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی اس لیے
ہندوستانی ریاستوں میں پچھلے شاہی نظام کی طرح ترقی کا دارومدار زیادہ تر
سرکار دربار کی خوشامد پر مبنی ہوتا تھا خوددار قوم و ملک کے ہمدرد و غمخوار
انسان راجوں مہاراجوں اور نوابوں کے یہاں زیادہ دیر تک نہیں ٹک
سکتے تھے بیدار مغز اور رعایا کے سچے بہی خواہ اور ریاست کو ترقی کی شاہراہ پر
لے جا کر کھڑے کرنے والے حکمراں اولاً تو اس ماحول کی وجہ سے ناپید تھے
اور اگر کوئی غیر معمولی آدمی پیدا بھی ہو جاتا تو حکومت کی ساحرانہ سیاست یا تو
اس کو تھپکی دے کر سلا دیتی یا سامراج کی مہربانی اس کو اپنے شکنجے میں کس کر
بے دست و پا بنا دیتی

عہد سلطانی اور بھوپال

سابقہ ریاست بھوپال مسلمان ریاستوں میں دوسرے نمبر کی ریاست
تھی حیدرآباد کو اولیت کا فخر حاصل تھا۔ ریاست بھوپال کی فارغ البالی
مرفہ الحالی کا دور بیگمات کا دور تھا جس کی آخری کڑی نواب سلطان جہاں بیگم
تھیں نواب صدیق حسن خاں کی تحریک جہاد کی وجہ سے ریاست پر حکومت
برطانیہ کی کڑی نظریں لگی رہتی تھیں اس لیے گریفن گردی کے بعد ایک
انگریز پولٹیکل ایجنٹ ریاست کے معاملات پر گہری نظر رکھتا تھا سلطان جہاں بیگم
سنہ ۱۹۰۱ء میں جب مسند نشین ریاست ہوئیں تو ریاست کی حالت خستہ و ابتر
تھی ان کی والدہ شاہجہاں بیگم کی غیر معمولی فیاضی و فراخدلی اور طویل علالت نے ریاستی
نظم و نسق کو کمزور کر دیا تھا اور نواب صدیق حسن خاں کی پچھلی حکمت عملی کی وجہ
سے وہ ریاستی انتظام حکومت سے علیحدہ کر دی گئی تھیں سلطان جہاں کے

برسر اقتدار آنے پر پچھلے قرضوں کا بار آپڑا اور سابقہ سیاست کے مطلع کو صاف کرنے کے لیے ہر ہر قدم ان کو پھونک پھونک کر رکھنا پڑا یہ امر مخفی نہ رہے کہ بھوپال کی پہلی ولی صفت فرماں روا قدسیہ بیگم نے عہد میں بھوپال کی رعایا کے علاوہ غیر آدمی کو ملازم نہیں رکھا جاتا تھا رعایا میں ہندو مسلمانوں کے ساتھ ملازمت عہدوں کے سلسلہ میں یکساں معاملہ کیا جاتا ان کے عہد میں رعایا خوش حال اور شہر سرسبز و آباد تھا (فرماں روایان بھوپال ص ۶۵)

پھر عہد جہانگیری اور دور سکندری میں ریاست کے باہر کے علماء فضلاء کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ جب قدسیہ بیگم کو انگریز بہادر نے فرماں روائی سے علیحدہ کر دیا تو ان کے ساتھ جتنے ریاست کے عہدے دار و منصبدار تھے وہ سب ریاست سے علیحدہ ہو کر ان کی ڈیوڑھی میں منتقل ہو گئے۔ (تاج الاقبال)

اس لیے ضرورت پڑی کہ باہر کے قابل و فاضل اور تجربہ کار افراد کو انتظام ریاست کے لیے بلایا جائے چنانچہ یہ بیرونی علما و فضلا بھوپال آکر بس گئے اور انھوں نے ریاست بھوپال کو اپنا وطن بنا لیا۔

اسی طرح ہنگامہ ۱۸۵۷ء بعد ہزاروں خانماں برباد شرفاء و غرباء خاندانوں نے بھوپال کو گوشہ عافیت سمجھ کر پناہ لی نواب جہانگیر محمد خاں کے زمانے میں پچھلے قاضی و مفتی خاندانوں کا سلسلہ ختم ہو گیا پھر دور شاہجہانی میں جب نواب صدیق الحسن خاں کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ دوڑ آئی تو انھوں نے اپنے مخصوص مسلک و سیاست کی وجہ سے پرانے منصب دار و جاگیر دار خاندانوں کا صفایا کر دیا جس کی وجہ سے ریاست بھوپال میں ملکی و غیر ملکی کا مسئلہ ابھرا پھر نواب صاحب کی معزولی کے بعد ملکی و غیر ملکی کشمکش دوسرے پیرائے میں ظاہر ہوئی نواب صاحب کی ریاست سے بے دخلی کے بعد انگریز ریزیڈنٹ نے جن وزراء کو نامزد کیا نواب عبداللطیف خاں کرنل وارڈ

منشی امتیاز علی صاحب اور وزیر عبدالجبار خاں یہ سب کے سب باہر کے آوردہ تھے بقول شخصے بھوپال میں بٹر پکتا دیکھ کر یہ زیرک و دانشمند لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور ہر محکمہ میں اپنے آدمی بھرنا شروع کر دیئے بھوپالیوں کے حقوق و پامال ہوتے چلے گئے سلطان جہاں بیگم نے بر سر اقتدار آکر اپنی حکمت عملی فیاضی و رواداری سے اس پچھلی کشمکش کو ایک حد تک دبا دیا۔ کیوں کہ وہ خود نواب صدیق الحسن خاں کی وجہ سے معتوب ریاست ہوکر ریاست کے پرانے وفادار خاندانوں سے قریب ہوگئی تھیں اس لیے ایک حد تک اس کشمکش کو دور کرنے میں کامیاب ہوئیں شاہجہاں بیگم نے اپنی غیر معمولی سخاوت و فیاضی کی وجہ سے اخوان ریاست اور اعیان مملکت کو کسی خدمت کی شرط لگائے بغیر جاگیرات و مناصب سے نوازا تھا اس لیے ان میں سے اکثر افراد لہو و لعب سیر و شکار کے خوگر اور مفت خوری کے عادی ہو گئے تھے سلطان جہاں بیگم نے ان مناسب و جاگیرات کے متعلق خدمات کی شرائط عائد کر دیں اور ان خاندان کے نونہالوں کو اصلی تقاضوں کے مطابق دینی و دینوی تعلیمات کو لازم کر دیا اس لیے قدیم و جدید مدارس ان کے عہد میں کھلتے چلے گئے۔

چونکہ سلطان جہاں بیگم ایک دیندار تعلیم یافتہ اور مدبرہ فرمانروا تھیں۔ اس لیے انھوں نے مردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ عورتوں کی تعلیم کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جہاں مشرقی علوم کے مدرسہ سلیمانیہ اور جامعہ احمدیہ خالص دینی مدرسہ قائم کیے اور بیرونی علماء فضلاء کو بلا کر ان مدارس کو رونق بخشی وہاں عصری اور جدید اسکول بھی قائم فرمائے سلطانیہ زنانیہ اسکول صنفِ نسواں کے لیے قائم کیا۔ خود اپنے چھوٹے صاحبزادے نواب حمید اللہ خاں کو علیگڑھ بھیجا وہ پہلی مسلمان خاتون ہیں جو مسلم یونیورسٹی کی دو بار چانسلر منتخب ہوئیں اس موقع پر ابو سعید بزمی کی کتاب ریاستوں کی سیاست کا اقتباس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا بزمی صاحب نے لکھا ہے کہ فرمانروا کی ذات کا کوئی فعل حلو منتہا اور اس کے

حکام کو اپنے رنگ میں رنگے بغیر نہیں رہ سکتا مطلق العنان شخصی حکومتوں میں فرمانروا کی ذاتی زندگی کا اثر ملکی سیاست پر پڑنا ناگزیر ہے چنانچہ مہاراجہ پٹیالہ کو جب پہلوانی کشتی گیری کا شوق ہوا تو ریاست میں اس کا اسکول کھل گیا اور بے دریغ روپیہ اس پر صرف ہونے لگا نواب صاحب جوناگڑھ کو کتے پالنے کا شوق ہوا تو ساری ریاست میں کتے ہی کتے نظر آنے لگے نواب صاحب بھوپال کو پولو، ہاکی کا شوق ہے اس لیے عوام بھی اس کمال کے حاصل کرنے میں پیش پیش ہیں آپ کی والدہ سلطان جہاں بیگم کو تعلیم کے فروغ دینے اور بالخصوص لڑکیوں کے تعلیم یافتہ بنانے کا شوق تھا اس لیے اس زمانہ میں ساری فضا میں علم وفضل کا چرچا تھا (ریاستوں کی سیاست ص ۵۵)

بہر حال نواب سلطان جہاں بیگم اپنی صنف میں منتخب روزگار اور اپنے وقت کی فصیح و بلیغ مقررین میں اونچا مقام رکھتی تھیں مولانا شبلی رح نے لکھا ہے

"مجھ کو حکمران اسلام میں سے متعدد رؤساء و فرمانروایان ملک کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہے ان سے گفتگو و ہم کلامی کی نوبت بھی آئی ہے لیکن میں بغیر کسی قسم کی رواداری اور تعلق اس کہنے پر مجبور ہوں کہ میں نے اس وقت تک کسی رئیس اور یا والی ملک کو اس قدر وسیع المعلومات خوش تقریر، فصیح اللسان، نکتہ سنج اور دقیقہ رس نہیں دیکھا وہ تقریر فرما رہی تھیں اور میں محو حیرت تھا کہ دہلی و لکھنؤ کی سرزمین کے علاوہ کسی اور ملک کا آدمی بھی ایسی شستہ اور فصیح اردو کے بولنے پر قادر ہو سکتا ہے وہ مختلف علمی اور انتظامی امور پر گفتگو کر رہی تھیں اور میں سوچتا تھا کہ مخدرات اور حجرہ نشین بھی اس قدر معلومات حاصل کر سکتیں ہیں"، بہر حال تاریخ بھوپال میں عہد سلطانی اپنی گوناگوں خصوصیات و برکات کے لحاظ سے ممتاز رہا۔

معاشرہ اسلامی نے عورتوں کے حقوق کو پامالی پر سب سے پہلے انھوں نے ہی ملک کے نامی گرامی علماء کو مدعو فرما کر حقوق زوجین کا مسودہ مرتب کرایا اور

مفقود الخبر مطلقہ عورتوں کی گلو خلاصی کے لیے قانون بنوائے جس نے ہیں بعد میں ناقص
صورت میں کاظمی ایکٹ کے نام سے شہرت حاصل کی۔

دورِ حمیدی کی سیاست ۱۹۲۶ء

عہد سلطانی تک جو بیگماتی دور کا آخری زریں عہد تھا ریاست قدیم جاگیردانہ
گہوارہ میں جھول رہی تھی اور دور جدید کی سیاست کی پرچھائیاں اس علاقہ
میں نہ پڑی تھیں نواب حمید اللہ خاں (ولادت ۱۸۹۴ء وفات ۱۹۶۰ء) ۱۹۲۶ء
میں جب مسند نشین ہوئے تو ریاست کی سیاست نے نئی انگڑائی لی کیونکہ خود نواب صاحب
پہلے گریجویٹ رئیس اور علیگڈھ کالج کے پروردہ ہونے کی وجہ سے ہندوستان
ارباب سیاست کے قریب رہے تھے اور مسلم یونیورسٹی کے قضیہ نامرضیہ میں
احرار اسلام کے ساتھ تھے اس لیے گورنمنٹ کی نگاہ میں تاج برطانیہ سے
ان کی وفاداری مشکوک سمجھی جاتی تھی اس بنا پر ان کے مسند نشین بنانے
پر سلطان جہاں بیگم کو زبردست کوشش کرنا پڑی یہ حقیقت ہے کہ سیاست ان
کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی اور علیگڈھ کالج نے ان کی فطری ذوق سیاست
کو جلا بخشی اور عصری سیاست کے میدان کا شہسوار بنایا اس لیے ان کے فرمانروا
ہونے سے کچھ عرصہ بعد ہی حقوق طلبی کی سیاست کا ریاست میں غلغلہ بلند ہوا جس
نے آگے چل کر تحریک کی شکل اختیار کی اور بہت سی جماعتیں بنتی اور مٹتی رہیں
جیسا کہ آگے معلوم ہوگا کہ انجمن خدام وطن اپنے پرزور سرگرم حمایتیوں کی وجہ
سے ایک فعال جماعت ثابت ہوئی اس جماعت کے ارکان میں ابوسعید بزمی ایک
مفکر یا اس جماعت کے دماغ تھے جس پر ان کی کتاب "ریاستوں کی سیاست"
شاہد ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کتاب کا اقتباس پیش
کیا جائے۔

بزمی صاحب لکھتے ہیں:۔

ابتداً سیاست یا حکومت ایک سیدھا سادہ نظریہ تھا اس میں کوئی منطقی الجھاؤ اور نہ فلسفیانہ اشکال تھا لیکن انسانی خود غرضیوں اور خود پرستیوں نے رفتہ رفتہ اس میں الجھاؤ پیدا کرنا شروع کر دیئے جب کسی ناجائز چیز کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو منطقی موشگافیوں اور فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کے بغیر کام نہیں چلتا بات میں بات پیدا کی جاتی ہے اور بہت معمولی سی حقیقت کو بھی بحث و نزاع کی بھول بھلیوں میں گم کر دیا جاتا ہے یہی حال سیاست و حکومت کا ہوا۔

امن، خوش حالی، اور ترقی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے دنیا والوں نے حکومت کے نام سے ایک ہیئت اجتماعیہ کی بنیاد ڈالی تھی لیکن ان کو کیا خبر تھی کہ یہ سیدھی سی بات آگے چل کر بڑے بڑے جھگڑوں کا سبب بن جائے گی اور چند خود غرض عیش پسند اور حیلہ تلاش لوگ اقتدار و بالا دستی کی اس امانت سے جس کا نام حکومت ہے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ساری دنیا کو ایک زبردست آفت میں مبتلا کر دیں گے آج دنیا میں جمہوریت، دستوریت، اشتراکیت کے نام سے اصلاح و انقلاب کی جو آوازیں بلند کی جا رہی ہے وہ سب اسی قسم کی ناجائز فائدہ اٹھانے والے چند خود غرض لوگوں کے کرتوتوں کی وجہ سے ہو رہی ہے۔

دنیا کی ہر حکومت میں خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو خواہ کتنی ہی مختصر ہو مسائل کی نوعیت یہی ہے یعنی اوپر کے چند مٹھی بھر افراد نے حکومت و اقتدار کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر عیش و عشرت کو صرف اپنے لیے مخصوص کر دیا ہے عوام کا روپیہ عوام پر صرف ہونے کے بجائے چند مخصوص لوگوں کی کوٹھیوں اور بنگلوں پر صرف ہوتا ہے عوام مال گذاری دیتے ہیں ٹیکس دیتے ہیں اور اس طرح خزانے کی تھیلیوں کو دولت سے پر کرتے ہیں قاعدے کی رو سے یہ روپیہ ان کے کاموں پر صرف ہونا چاہیئے ان کی تعلیم پر، حفظان صحت پر، سڑکوں کی تعمیر پر، ہسپتالوں کے قیام پر، غرض کہ ان تمام چیزوں پر جن کا تعلق عوام سے لیکن

ایسا نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس چند مخصوص لوگوں کے لیے موٹریں۔ ریڈیو، بنگلے بنائے جاتے ہیں اور وہ خوب عیش سے اپنے گلچھڑے اڑاتے ہیں لیکن لاکھوں عوام بھوکوں مرتے ہیں نہ ان کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہوتا ہے اور نہ ان کے محلوں میں صفائی ہوتی ہے حالانکہ جو کچھ روپیہ محلوں اور کوٹھیوں میں صرف ہوتا ہے وہ ان ہی کا روپیہ ہے یہ خیال کر کے قدرتاً ان کے دل میں غم و غصہ کی لہر پیدا ہوتی ہے اور وہ اپنے غم و غصہ کو حکومت کے سامنے پیش کرتے ہیں حکومت اس غم و غصہ کی طاقت و اہمیت کو محسوس کرتی ہے اسے یہ ڈر پیدا ہونے لگتا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ عوام کا غم و غصہ ان کے عیش و عشرت کو خاک میں ملا دے اور اس کے جس روپے کو اپنے عیش کے خاطر پانی کی طرح بہاتے ہیں اسے عوام واپس لے لیں اس لیے وہ چند لوگوں کو رشوت دیتے ہیں یعنی اس ناجائز عیش بازی میں انھیں بھی شریک کر لیتی ہے جس کو زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں اسے زیادہ سے زیادہ رشوت دے کر اپنے ساتھ شریک کر لینے کی کوشش کرتے ہیں نئے نئے وسائل پیدا کر کے فلسفیانہ و منطقی بحثوں میں عوام کے دماغ کو الجھانے کی کوشش کرنے میں مذہب کے نام کو بیچ میں لاتے ہیں غرض کہ جس طرح ڈوبتا آدمی ہر تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے اسی طرح ایسے مواقع کو حکومت بھی ہر ممکن طریقہ سے عوام کا منہ بند کر کے اپنے عیش کو خطرے میں پڑنے سے بچانے کی کوشش کرتی ہے بالکل یہی حالت ہے جو آج میں ہندوستانی ریاستوں میں نظر آ رہی ہے خواہ وہ رقبہ و وسعت کے لحاظ سے کتنی ہی مختصر اور چھوٹی کیوں نہ ہو (ریاستوں کی سیاست ص ۱ د ۳)

آج سے نصف صدی پہلے ریاستی یا ہندوستانی عوام کو مشکلات و پریشانیوں کی جو تصویر کسی اس کتابچہ میں کی گئی ہے افسوس کہ آزادی کی ربع صدی گذر جانے کے بعد بھی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ حالات جوں کہ توں ہیں عہد ماضی کے آئینہ میں جس روشن مستقبل کی جھلکیاں دکھائی گئیں تھیں نہایت افسوس کے

کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ اکثر غرباء اور عوام خصوصی طور پر اقلیتوں کے ساتھ ہمارے رہنماؤں کا خواب اب تک شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا بقول اقبال. دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوبی کر رہا ہے ہماری حکومت کے بے شمار کا غذی اور غربت و پسماندگی کے دور کرنے کے اعلانات اشتہاری بن کر رہ گئے ہیں۔ یقیناً ہمارے ملک کا دستور اساسی جو آزادی کے بعد قومی رہنماؤں نے بنایا وہ دنیا کے بہت سے ملکوں کے دستور سے عمدہ و بہتر اور معقولیت پر مبنی ہے لیکن فرنگی سامراج کی باقی ماندہ نوکر شاہی نے ہندوستانی عوام کو پوری طرح اپنے حقوق سے بہرہ مند ہونے کا موقع نہیں دیا غالب ؎

کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعیٔ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصت روانی کی

ریاستوں کے قیام کی تاریخ

اس سے پہلے کہ ریاست بھوپال کی دور حمیدی کی سیاست اور حقوق طلبی کی تحریک کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاستوں کے قیام کی تاریخ کا اجمالی تذکرہ کر دیا جائے تاکہ اس آئینہ میں سیاسی تحریک کو دیکھا جاسکے ریاستوں کے قیام کی تاریخ جیسا کہ بزمی صاحب لکھا ہے یہ ہے

اٹھارویں صدی کے اندر جب ہندوستان پر برطانیہ کا تسلط بڑھا تو اس نے ریاستوں کو بے دھڑک برطانوی ہند میں ضم کرنا شروع کر دیا سب سے پہلے لارڈ ویلزلی (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) نے اس کام کی ابتداء کی اور ریاستوں پر بے جا الزامات عائد کرکے ان کو برطانوی مقبوضات میں شامل کیا بعد میں لارڈ ڈلہوزی (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء) نے اس پالیسی پر اور زیادہ شدت سے عمل کیا چنانچہ اس زمانے میں بیسیوں ریاستیں برطانوی علاقوں میں ضم کی گئیں لیکن جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی باشندوں نے سات سمندر پار گورے آقاؤں کے خلاف ایک انقلابی بغاوت

کمرِ ہمت کس کر ان کے وجود سے سرزمین ہند کو پاک کرنے میں ان ریاستوں نے جان توڑ کر انگریزوں کا ساتھ دیا اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ریاستیں اس وقت انگریزوں کا ساتھ نہ دیتیں تو آج ہماری گردنوں پر برطانوی اقتدار کا جوا نہ رکھا جاتا چنانچہ غدر کے فوراً بعد ہی لارڈ کیننگ نے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں ریاستوں کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا تھا۔

"دیسی ریاستوں کے ان ذرا ذرا سا علاقوں میں مضبوط چٹانوں کا کام کیا اور ہندوستان کی عام بغاوت کے طوفان کے زور کو بہت زیادہ ہلکا اور بے اثر کرنے میں ہماری مدد کی اگر یہ ریاستیں نہ ہوتیں تو ہم ختم ہو چکے ہوتے"

ہندوستانی قومیت و وطنیت کے ساتھ غداری کر کے انگریزوں کے قدموں کو ہندوستان میں جمانے کا کام ایسا نہ تھا کہ جس کا صلہ نہ دیا جاتا چنانچہ عین اس وقت جب کہ ہندوستان کے ہر ہر گوشہ میں ہنگامۂ محشر بپا تھا اور معمولی سے شک و شبہ پر انسانی خون کی ندیاں بہائی جا رہی تھیں برطانوی ایوان اجلال میں ہمارے ان رئیسوں کی خدمات کے اعتراف میں صلہ اور خلعت تقسیم کیے جا رہے تھے اور جس رئیس کی پیشانی کا داغ زیادہ سے زیادہ بڑا اور زیادہ سے زیادہ سیاہ ہوتا تھا اس کے انعام کی مقدار بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی تھی ریاست بھوپال کو خطابات اور تمغوں کے علاوہ رائسین نامی قصبہ دیا گیا در رائسین کا قصبہ نہیں بلکہ قصبہ بیرسیہ دیا گیا۔ وجدی) الغرض ہمارے رئیسوں کی اس وفادارانہ مظاہرہ کے بعد برطانوی شہنشاہیت کے دربار میں ریاستوں کی ضرورت کو محسوس کیا گیا اور تاج برطانیہ کی طرف سے ان کے تحفظ کا باقاعدہ اعلان کر کے انھیں اندرونی معاملات میں خود مختار بننے کا یقین دلایا گیا لیکن اسی کے ساتھ اس کی بھی وضاحت کر دی گئی کہ سلطنت برطانیہ کی بالادستی ہر وقت ہر لمحہ باقی رہے گی اور جب ضرورت سمجھے گی ان ریاستوں کے ہر معاملہ میں مداخلت کر سکے گی ۱۹۲۶ء میں نظام حیدرآباد کے ایک مراسلہ کے جواب میں لارڈ ریڈنگ نے بحیثیت وائسرائے

جو تاریخی خط لکھا تھا اس میں برطانوی بالادستی اور رئیسوں کی زیردستی کو صاف صاف لفظوں میں ظاہر کیا ہے (ریاستوں کی سیاست ص ۴۰-۳۹)

بہرحال صدیوں سے ریاستی عوام بلکہ ہندوستانی عوام اپنی غفلت پسندی و کوتاہ عملی کی وجہ سے پسماندگی کا شکار اور طاقتوروں کے دام میں گرفتار ہو چکے تھے بقول اصغر ؎

یہاں کوتاہئ ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

دورِ حمیدی سنہ ۱۹۲۶ء

جب نواب حمید اللہ خاں صاحب سنہ ۱۹۲۶ء میں برسر اقتدار آئے چوں کہ الگزنڈرا ہائی اسکول کے طالب رہے تھے اس لیے ان کے استقبالیہ میں بابو عبدالکریم مرحوم نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہمارے فرماں روا جو اولڈ بوائے اور گریجویٹ بھی ہیں اہل بھوپال کو توقع ہے کہ بھوپالیوں کو ان کے دور حکومت میں ان کی صلاحیتوں کے اعتبار سے پورے پورے حقوق حاصل ہوں گے۔ حقوق طلبی کی یہ پہلی استدعا یا درخواست تھی جو رعایا کی جانب سے راعی کی خدمت میں پیش کی گئی پھر حامد رضوی صاحب نے اسٹیٹ اسمبلی میں اس مسئلہ کو اٹھایا پھر سنہ ۱۹۳۱ء میں اصغر انصاری انیس انصاری نے گریجویٹس ایسوسی ایشن بنائی جو اختلافات کے نذر ہو گئی یہ لکھا جا چکا ہے کہ نواب حمید اللہ خاں صاحب نے علیگڈھ کالج و الہ آباد یونیورسٹی میں اپنے تعلیمی سلسلہ کو پایۂ تکمیل تک پہونچایا تھا اس لیے ریاست میں باہر کے آنیوالے عہدیداروں کا حلقہ وسیع ہوتا رہا اور ریاست کے قدیم باشندے پیچھے ڈھکیلے جاتے رہے ان بیرون ریاست عہدیداروں نے ان کو چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے لیا اور نواب صدیق الحسن خاں کے دور کی کشمکش قدیم و جدید

باشندوں کے درمیان پیدا ہوتی چلی گئی ان کی ہندوستانی سیاست میں دلچسپی ہی ریاست کے داخلی انتظامی احوال سے بیگانہ بے پرواکر دیا یہ وہ زمانہ تھا کہ جنگ عظیم کی فتح سنہ ۱۹۱۸ء کے حکومت برطانیہ فرعونی انداز میں آزادی ہند کے پچھلے وعدوں کو ٹھکرا چکی تھی۔ رسوائے عالم جنرل ڈائر نے جلیان والا باغ میں نہتے عوام پر فائرنگ کرکے عام ہندوستانیوں کے دل میں غم و غصہ کے جذبات کو مشتعل کر دیا تھا۔

خلافت جمیعتہ علماء اور کانگریس نے مل جل کر برطانوی سامراج کے خلاف عدم تشدد کے ہتھیار سے جنگ کا بگل بجادیا تھا پورے ملک میں تحریک آزادی جنگل کے آگ کی طرح پھیل رہی تھی جس کے شعلے دار وگیرا ور سخت گیری کے پانی سے بجھ بجھ کر اور بھڑکتے تھے جمیعتہ نے اپنے قیام سنہ ۱۹۱۹ء کے ساتھ آزادی کامل کی تجویز پاس کردی تھی جب کہ ملک کی قومی جماعت (کانگریس) کو ہوم رول سے آگے بڑھ کر دس برس بعد سنہ ۱۹۲۹ء آزادی کامل کو اپنا نصب العین بنانا پڑا برطانوی ہند میں تحریک آزادی کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کی چنگاریاں اڑاڑ کر ہندوستانی ریاستوں میں بھی پہونچ رہی تھیں جس کے نتیجہ میں بھوپال میں ملکی وغیر ملکی قضیہ نے اپنا سر نکالا غالباً سنہ ۱۹۳۲ء کا واقعہ ہے جب کہ نواب صاحب کے دست راست سلام الدین خاں چیف جسٹس (پنجاب) اور شعیب قریشی مشیر المہام اور خواجہ اکرم افسر اعلےٰ پولس تھے اگرچہ زمام اقتدار نواب صاحب کے ہاتھ میں تھا لیکن اس اقتدار کے اختیارات کا ظہور ان بیرونی حکام کے ہاتھوں میں تھا قدیمی بھوپالیوں نے اپنے حقوق کے تحفظ اور ان کے ساتھ ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی چونکہ نواب صاحب کے ارد گرد ان بیرونی افسران کا مضبوط حصار تھا اس لیے بھوپالیوں کی صدائیں نقار خانہ میں طوطی کی صدا بن کے رہ جاتی تھیں۔

مغربی سامراج نے جو نوآبادیاتی نظام ایشیا و افریقہ میں قائم کیا تھا وہ درحقیقت پرانے دورِ وحشت کی غلامی کا نیا روپ تھا جس پر غیر مہذب قوموں کو مہذب بنانے کا پردہ ڈال دیا گیا تھا اس کی خصوصیت یہ تھی کہ کمزور

و ضعیف قوموں ، مجبور و مقہور لوگوں کے مال و دولت اور محنت کا استحصال کیا جائے ان کے خون پسینہ سے حاصل کردہ منافع پر ناجائز تصرف اور بیجا قبضہ کیا جائے غریب مزدور محنت کش عوام کی محنت کا پھل سرمایہ دار کے ہاتھ آئے یہی وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے۔ جو جمہوریت کی نقاب اوڑھ کر اور مشرقی قوموں کو مہذب اور متمدن بنانے کے نام پر ہر جگہ قائم کر دیا گیا تھا ایک طرف تو یورپ نے دور وحشت کی یادگار غلامی کو قانونی طور پر ختم کرنے کا زبردست اقدام کیا لیکن دوسری طرف نوآبادیاتی نظام کو ایشیا اور افریقہ پر مسلط کر کے اسی دور غلامی کو نئی شکل دیدی اس میں شک نہیں کہ پچھلے جاگیر دارانہ نظام میں بھی نواب راجہ ، بادشاہ لوگ عوام کی محنتوں سے گلچھرے اڑاتے تھے لیکن گاہے ماہے غریب کسان اور محنت کش طبقہ کو آنسو پونچھنے کے لئے اکرام و انعام اور حقوق کے نام پر کچھ نہ کچھ دیدیا کرتے تھے لیکن یورپ کا لایا ہوا صنعتی سرمایہ دارانہ نظام اس قدر ظالم و جابر اور سنگدل بن کر آیا کہ اس نے یہاں کے غریب باشندوں کا خون نچوڑ کر ان کو بے دم کر دیا ۔

تاریخ کی صبح نمودار ہونے سے پہلے قوموں ، قبیلوں کی آمد و رفت اور ایک مقام سے دوسرے منتقلی اور زور زبردستی یا رضامندی سے ان مقامات پر اقامت فرمائی کا سلسلہ ہمیشہ سے جاری رہا ہے جو کچھ عرصہ بعد لڑ بھڑ کر یا پریم و پیار سے مقامی و بیرونی لوگ باہمی اختلاط اور ایک دوسرے سے مل جل کر اور شیر و شکر ہو کر رہنے لگتے تھے اس کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کہ کمزور قوموں پر حملہ آور ہو کر طاقتور بادشاہوں اور فاتح سپہ سالاروں کا لوٹ مار کرنا ایک محبوب مشغلہ رہا ہے لیکن ایک قوم کا استحصال کر کے اس کے حاصل کردہ فوائد و منافع کو اپنے ملک کو منتقل کرتے اپنے ملک کو دولت مند و مالدار بنانا اور دوسرے کے ملک کو مفلس و تلاش کرنا ، اپنے شہر کو گل و گلزار بنانا ، اور دوسرے کے ملکوں کو اجاڑ کر ویرانہ بنانا مغربی سامراج کا لایا ہوا طبیرہ

ہے جس نے پوری دنیا میں خلفشار پیدا کیا اور دنیا کو معرکۂ کارزار بنا رکھا ہے۔

ریاست بھوپال اگرچہ اس وقت تک جاگیردارانہ دور سے گذر رہی تھی لیکن سرمایہ دارانہ ہوائیں بھی چلنا شروع ہوگئیں تھیں ان ہواؤں کے اثر سے یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ خواب غفلت سے بیدار ہوکر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا سب سے پہلے ینگ مین نیشنل ایسوسی ایشن کی داغ بیل ۱۹۲۹ء میں پڑی اس کے بنیادی ارکان دیوان دولت رائے، انیس الدین انصاری۔ گوبند پرشاد آفتاب تھے پھر بابو عبدالکریم سابق سشن جج، عبدالحمید صاحب سابق ہیلتھ آفیسر محمود اعظم فہمی اور حامد حسین اس کے ممبر ہوتے یہی وہ حامد حسین بھوپالی ہیں جن کے صاحبزادے ڈاکٹر عابد حسین نے ریاست کو خیرباد کہہ کر اور جامعہ ملیہ کی تحریک میں شریک ہوکر ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب صدر کی طرح تعلیمی و تصنیفی میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی بھوپال کے اس فرزند نے یہیں ہوش و شعور کی آنکھیں کھولیں یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی پھر آگے بڑھ کر جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لے کر جامعہ ملیہ کو اپنا مرکز بنایا ایسے ہی بھوپال کے ہونہار فرزند ڈاکٹر اعزاز الدین خان بھی تھے جن کی علمی و فنی صلاحیتوں سے بیرون ریاست مستفید ہوئے لیکن بھوپال میں ان کی ریاستی دور تک کوئی قدر دانی نہ ہوسکی اس موقع پر پھر ہم بزمی صاحب کی ریاستوں کی سیاست کا اقتباس اس لیے پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے یہاں کی سیاست کا پورا پس منظر آنکھوں کے سامنے آجائے گا وہ لکھتے ہیں۔

ریاستوں میں سیاسی بیداری کو روکنے اور عوام میں طلب حقوق کے احساس و شعور کو مٹانے کی جو کوششیں کی جاتی ہیں اس کی ایک مثال ینگ مین ایسوسی ایشن چند ماہہ تاریخ سے ملتی ہے اس ایسوسی ایشن کی تحریک نے ریاست کے ذہین اور پرجوش تعلیم یافتہ جوانوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا اگرچہ یہ جماعت زیادہ عرصہ

تک قائم رہتی تو اپنے نصب العین اور اصول کار کے اعتبار سے ہر پھر کر صحیح راستہ پر آجاتی لیکن حکومت بھوپال نے جونہی اس کی آئندہ طاقتوں کا احساس کیا فوراً اس کی جڑ پر کلہاڑی رکھنا ضروری سمجھا اور اس کے ممبروں کو اس طرح خائف دہراساں کیا گیا کہ چند مہینوں کے اندر اس جماعت کے سارے اجزاء منتشر ہو گئے۔

بھوپال کے باشندوں کی شکایت کا سبب سرکاری ملازمتوں پر پردیسیوں کا قبضہ بنایا گیا۔ اس سوال نے بھوپال میں نہایت شدت اختیار کر لی اور دیسیوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ینگ مین ایسوسی ایشن قائم کی اس جماعت نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ بھوپالیوں کی ملازمت میں داخل کرنے کا مطالبہ کیا اور مقامی لیڈروں نے عوام کے اس مطالبہ کی کونسل میں نمائندگی کی اس شور وہنگامہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرمانروائے بھوپال نے پبلک سروس کمیشن کے نام سے ایک کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا اور اس بات پر غور ہونے لگا کہ آیا بھوپالیوں میں سرکاری عہدوں کی ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت ہے بھی یا نہیں اس کمیشن نے بڑی لمبی چوڑی تحقیقات کے بعد اپنی ایک رپورٹ پیش کی اس رپورٹ کی لکھائی چھپائی دیدہ زیب تھی اس کا کاغذ چکنا اور دبیز تھا اس کی سلائی بنائی بھی نہایت سلیقہ کے ساتھ کی گئی تھی لیکن کیونکہ یہ کمیشن اہل بھوپال کے منتخب اور قابل اعتبار لوگوں پر مشتمل نہ تھا اس لیے قدرتاً معنوی اعتبار سے اس میں اہل بھوپال کے لیے کوئی خوبی نہ تھی اس میں یہ بتلایا گیا کہ بھوپال میں سرے سے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہونے کی صلاحیت ہی نہیں ہے ان میں نہ تو اعلیٰ تعلیم اور نہ عقل و ذہانت کے اعتبار سے وہ سرکاری کام چلانے کے اہل ہیں نیز اس میں یہ بھی ثابت کیا گیا تھا کہ اہل بھوپال محنت سے جی چراتے ہیں اور کاہلوں کی طرح بیٹھے بیٹھے مفت کی روٹیاں توڑنے کے خواہاں رہتے ہیں اس قسم کی بہت سی باتوں کے لکھنے کے بعد سفارش کی گئی تھی کہ چپراسیوں،

اردلیوں، اور اسی قسم کی گھٹیا ملازمتوں کے علاوہ دوسری اعلیٰ ذمہ داریوں کے پوری طرح اہل نہیں ہیں اس لیے آئندہ سے چپراسی گیری وغیرہ کی ملازمتیں صرف ان کے لیے مخصوص کر دینا چاہیئے رہ گئیں دوسری اسامیاں اگر موزوں بھوپالی مل سکیں تو حتی الامکان ان کے تقرر کو غیر بھوپالیوں پر ترجیح دینا چاہیئے۔

جب پبلک سروس کمیشن کی یہ رپورٹ شائع ہوئی ریاست میں کوئی منظم جماعت ایسی نہ تھی جو عوام کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر کے اس کی رہنمائی کرتی ینگ مین ایسوسی ایشن کے نام سے جو جماعت یہاں بنائی گئی تھی وہ رپورٹ کی اشاعت سے بہت پہلے عملاً شکست کرائی جا چکی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ اس رپورٹ کی سفارشوں سے عوام بالکل مطمئن نہ تھے لیکن ان کی زبانوں پر خوف و دہشت کی مہر لگا دی گئی تھی انھیں لب شکایت وا کرنے سے باز رکھا۔ تاہم چوں کہ دل غیر مطمئن نہ تھے اور حکومت کے بعد کے عمل نے اس بے اطمینانی میں اور اضافہ کر دیا تھا اسی لیے اضطراب و بے چینی کی یہ چنگاریاں آہستہ آہستہ سلگنا شروع ہوئیں اور بالآخر چار پانچ سال کے بعد ۱۹۳۴ء کے وسط میں دفعتہً شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں حکومت کی غیر دانشمندی اور سخت گیری نے اس شعلہ کو ہوا دی بیسیوں گرفتاریاں عمل میں آئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ آگ ساری ریاست میں پھیل گئی۔ جب اس اشتعال اور ہنگامہ نے نازک صورت اختیار کر لی تو فرمانروائے بھوپال نے ایک خاص فرمان کے ذریعہ سرکاری نوکریوں کے متعلق اہل بھوپال کے مطالبہ کو جائز قرار دیتے ہوئے آئندہ سے انھیں نوکریاں دینے کا وعدہ کیا علاوہ ازیں دو تین خیراتی فنڈ کھولے گئے جس کا منشا تھا کہ عوام کی معاشی شکایتوں کو دور کرنے کوشش کی جائے اس اعلان کے بعد ساری نوکریوں میں بھوپالیوں کی بھرتی کا تناسب کچھ بڑھ گیا مگر یہ بھرتی صرف ادنیٰ اور ادنیٰ سے ذرا اعلیٰ ملازمتوں تک محدود رہا۔ نائب تحصیلداری اور تحصیلداری کو عموماً اس بھرتی کا نقطہ عروج سمجھنا چاہیئے (ریاستوں کی سیاست ص ۱۶ تا ۱۹)

بہر حال بھوپال کی پہلی گریجویٹ ایسوسی ایشن کا جو حشر ہوا تھا وہی ینگ مین ایسوسی ایشن کا ہوا نواب صاحب نے ان نوخیز نوجوانوں کا سلک ملازمت سے منسلک کر کے اور عہدہ مناصب دے کر منہ بند کر دیا اگرچہ ان کی دلی ہمدردیاں ملکی تحریک سے وابستہ رہیں مگر ملازمتی زنجیر میں جکڑ بند ہونے کی وجہ سے میدان سیاست سے کوسوں دور رہے۔

البتہ حامد رضوی وکیل جو بھوپالی سیاست کے گاندھی کہے جاتے تھے حقوق طلبی کے میدان میں ۱۹۲۹ء میں اترے اور انھوں نے ملکی وغیر ملکی قضیہ کے لیے قانونی جنگ کا بگل بجا دیا حامد رضوی صاحب پہلے سیاسی رہنما ہیں جنھوں نے چھوٹے چھوٹے پمفلٹوں اور کتابچوں کے ذریعہ اہل بھوپال میں سیاسی شعور کا بیج بویا اور اپنے حقوق کے حاصل کرنے کے لیے میدان میں آنے کی دعوت دی۔ وہ مفکر ہونے کے ساتھ جذباتی وعملی آدمی تھے انھوں نے تجلیات ۱۹۳۳ء کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا

جس کے اندر بھوپال کے قدیم و جدید تعلیم یافتہ افراد کی فہرست شائع کی ان کی قابلیت و صلاحیت کی نشاندھی کی۔ اور ان کے حق واقعی کی محرومی پر مناسب الفاظ میں روشنی ڈالی جس کی بناء پر ریاست کو پبلک سروس کمیشن کے نام کی ایک کمیٹی تشکیل کرنا پڑی جس کا کچھ حال ابھی گذر چکا۔

انجمن رعایائے بھوپال

ریاست میں حقوق طلبی کا جو پرچم بلند ہوا تھا جس نے ملکی وغیر ملکی کے قضیہ نامرضیہ کی بناء پر شہرت اختیار کر لی تھی یہ پرچم ابھی تک ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھا جو قانونی حدود کے اندر رہ کر اپنی آواز بلند کر رہے تھے اس راہ میں غیر معمولی جرات وہمت و دار ورسن کی دعوت پر لبیک کہنے کی ہمت نہ رکھتے تھے حالانکہ حق پسندی وانصاف طلبی کے لیے لیلائے مقصد سے ہمکناری

اس دنیا میں اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس راستہ کا مسافر مجنوں نہ بن جائے کیوں کہ حق و انصاف کے حصول کی منزل تک پہنچنے کے لیے ایسے مرحلوں سے گذرنا ضروری ہے جو خطرات سے بھرے ہوئے ہوں اس لیے حقوق طلبی کا میدان ایسے مردان کار کی راہ تک رہا تھا جو تن من دھن کی بازی لگا کر اس راہ کو پامال کریں یہ حقیقت ہے کہ ریاست کے اہم عہدوں پر جو باہر کے افراد قابض بن بیٹھے تھے انھوں نے ریاست کو اپنے مفادات کے حصول کا ذریعہ بنا رکھا تھا اور مقامی باشندوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ان اور ان کے ساتھ اہانت و ذلت کا رویہ اختیار کرتے ان واقعات سے شہر کے خوددار لوگوں کے دلوں میں ان احکام بالا کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ پھر عدالت کی طرف سے ایسی ہی ایک واقعہ نے وہ کام جو فتیلہ بارود کے لیے کام کرتا ہے اس لیے فروری ۱۹۳۴ء میں انجمن رعایائے بھوپال بنی جس کے صدر سعید اللہ خاں رزمی نائب صدر ڈھل واس بجاج، اور ستار حال سکریٹری تھے۔ بھوپال کے بابائے سیاست سعید اللہ خاں رزمی بھوپال کے ان نوجوانوں میں سے پہلے نوجوان ہیں جنھوں نے تحریک خلافت کی دعوت پر لبیک کہہ کر ۱۹۱۹ء میں بھوپال کو خیر باد کہا اور ہندوستانی کی گرم سیاست میں کود کر حصہ لیا تھا بعد میں اجمیر (راجپوتانہ) ان کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ جب ہندوستان میں تحریک ہجرت کا ۱۹۱۹ء میں آغاز ہوا نوان کی گرمی تقریر سے نوجوانوں کے سینوں میں آگ لگ گئی اور وہ بھوپال کو چھوڑ راہ ہجرت پر چل کھڑے ہوئے جب بھوپال میں ملکی و غیر ملکی قضیہ نے سر نکالا تو رزمی صاحب نے یہ انجمن مذکور قائم کر کے سب سے پہلے حقوق طلبی کی آواز کو بلند کیا اور ریاست کی مردہ رگوں میں خون زندگی دوڑایا لیکن رزمی صاحب ہندوستانی سیاست کی راہ سے ریاستی سیاست میں آئے تھے اس لیے ریاستی اور برطانوی سیاست کے مزاج کے اختلاف کی بناء پر عوام و خواص کو ایک

پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

رزمی صاحب ایک پرانے تجربہ کار سیاست داں تھے لیکن تیز مزاجی، زود اشتعالی کی وجہ سے عوام کو اپنے ارد گرد جمع نہ کر سکے انجمن بازی عمر بھر ان کا مشغلہ رہا۔ سب سے پہلے انجمن رعایا بھوپال پھر سوشل سروس لیگ اور پھر آل بھوپال پولیٹیکل کانفرنس بنائی اس کے بعد بھوپال اسٹیٹ کانگریس، پھر سنٹرل مسلم بلاک اور آخر میں سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے غرض ہر دور میں وہ اپنی سیاست کیلئے نیا محور تلاش کرتے رہے۔ اور اپنی اس تلون مزاجی کی وجہ سے ریاستی عوام کے مسلمہ لیڈر نہ بن سکے۔

انجمن خُدامِ وطن کی تشکیل

انجمن رعایا بھوپال کے مقابلہ میں چند نوجوانوں نے انجمن خدام وطن بنائی جس کے پہلے صدر آصف علی تھے جو عدالت کے ایک سربراہ کے توہین آمیز فقرہ کے زخم خوردہ تھے سید حافظ علی، شاکر علی خاں ان کے بنیادی ارکان تھے اس انجمن نے عوام میں حامد رضوی صاحب اور خالد میاں جیسے مدبروں کی پشت پناہی سے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔

جس طرح بارش کا موسم آتے ہی سوکھی زمینوں میں ہریالی اور کھیتوں میں پانی کی قطرہ افشانی سے سرسبزی و شادابی اور باغوں میں گل و ثمر کی جلوہ نمائی کا منظر ابھر آتا ہے اسی طرح بنجر زمینوں میں گھاس پھوس اور کانس نکل آتا اور حشرات الارض بھی ابل پڑتے ہیں اسی طرح ریاست میں سنہ ۱۹۳۴ء میں جب حقوق طلبی کی برسات کا موسم آیا تو بے شمار انجمنیں بن گئیں اور حشرات الارض کی طرح لاتعداد اخبارات ابل پڑے۔ لیکن یہ انجمنیں اور اخبار دو، دو، چار چار قدم چل کر بیٹھ گئے مگر اخبار صبح وطن بار بار ضبط ہو کر عوام کی ترجمانی کرتا رہا اس میدان میں سینہ سپر رہا۔ بھوپال کی سیاسی تاریخ میں وہ اندھیری رات

ہمیشہ یادگار رہے گی جس کے اندر چند نوجوان مثلاً شاکر علی خاں، ظہور ہاشمی، نور باز خان وغیرہ قاضی شریف حسین خاں کی مسجد میں جمع ہوئے مسجد کے محراب و منبر کے سایہ میں اپنے خدا سے ملی و وطنی بھائیوں کی سچی خدمت کا عہد و پیمان باندھا یہ عہد و پیمان صبح وطن بن کر نمودار ہوا۔ بھوپال کے دور جدید کے اخبار میں یہ پہلا اخبار تھا جس نے کھل کر ریاست کی پالیسی کی مخالفت کی۔

بھوپال کی صحافت کا آغاز گو ہفت روزہ عمدۃ الاخبار ۲۴ / مارچ ۱۸۷۱ء سے ہوا تھا لیکن جس اخبار نے ریاست کے حکمرانوں پر تنقید کر کے ہلچل پیدا کی وہ منشی عبدالکریم اوج کا اخبار موج نربدا ۱۸۸۳ء ہے جس کی بناء پر بھوپال سے ان کا اخراج ہوا۔ منشی صاحب نے ہوشنگ آباد میں پہونچ کر پھر موج نربدا کو جاری کیا۔ جس کے اندر ریاستی سیاست پر چٹکیاں لی جاتی تھیں اس کے بعد سے علمی و مذہبی اور ادبی اخبار نکلتے رہے جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا اس لیے صبح وطن پہلا خالص سیاسی اخبار تھا جو یکم جنوری ۱۹۳۳ء کو جاری ہوا۔ ابتداء میں سید رفیق حسین ایڈیٹر تھے بعد میں شاکر علی خاں بنے اس کے ساتھ ڈاکٹر دوست محمد خاں نے رہبر وطن نکالا جو ایک قابل اعتراض مضمون کی بناء پر ضبط ہوا اور ڈاکٹر صاحب کو بھوپال چھوڑنا پڑا۔ صبح وطن کی پیشانی پر ابتداءً خدام وطن کا نام نہ تھا بعد میں جون ۱۹۳۴ء میں وہ اس انجمن کا نقیب بن گیا۔ شاکر علی خاں اس کے ایڈیٹر ہوا۔ اس اخبار کے خاص کارٹونسٹ ایم عرفان تھے جن کے کارٹونوں نے غیر ملکی حکام کے خلاف ہیجان برپا کر دیا ان کارٹونوں کے چھاپنے سے حکومت کی ڈر کی بناء پر بھوپال پریس انکار کر دیتے تھے اس لیے فضل علی سرور اور عبدالرحمن کوکب منیجر جیسے نوجوانوں نے خفیہ پریس قائم کر کے چھاپنا شروع کیا اب صبح وطن بھوپالیوں کے آرزؤں کا ترجمان بن چکا تھا۔ اس لیے اس کا نعرہ بھوپال بھوپالیوں کے لیے بن گیا صبح وطن کے دو دور تھے۔

پہلا دسمبر ۱۹۳۳ء سے مئی ۱۹۳۴ء تک دوسرا جون ۱۹۳۴ء سے شروع ہوا تھا جس کے اندر شاکر صاحب قدوس صہبائی شامل تھے شخصی حکومت کی پابندیوں کی وجہ سے ابتداً اس کی تحریریں نرم و ملائم اور متوازن لہجہ میں رہیں لیکن ان کے بین السطور میں بغاوت کی چنگاریاں چمکتی نظر آتی تھیں۔ جب حکومت اس نرم لہجہ سے متاثر نہ ہوئی تو اس کے مضامین سے شعلے بلند ہونے لگے اور حکومت کا پنجہ اس کی طرف بڑھا۔ اس اخبار کے ایڈیٹر شاکر علی خاں، اور بھگوان دیال نشاط مدیر اعزازی تھے۔ صبح وطن اپنے نرم گرم تحریروں کی وجہ سے عوام میں اس قدر مقبول ہوا کہ چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل جاتا بھوپال میں ایسی مقبولیت اور کسی اخبار کو حاصل نہ تھی اس کا ایک شمارہ ۲۱ ستمبر ۱۹۳۴ء دو آنے کے بجائے پانچ پانچ روپیہ میں بکا جس کے اندر ریاستی حکام کے خلاف کارٹون چھپے تھے اس اخبار کے علاوہ اخبار پیام ۱۹۳۴ء شوکت علی، ظہیر الدین انصاری آواز ۱۹۳۳ء عبد الکریم، کبیر قریشی شریف عظمی، اخبار رہنما ابو سعید بزمی۔ مشیر وطن ۱۹۳۵ء بھگوان دیال نشاط، زبیر قریشی، فدائے وطن عبد الغفار خان۔ ناخدا عمران انصاری۔ دہقان اخلاق محمد خاں۔ کی ادارت میں شائع ہوئے ٹھاکر لال سنگھ نے ہندو مہاسبھا کی طرف سے پرجا پکار ہندی ۱۹۳۵ء اور سیٹھ لکشمی پر جا پتر ۱۹۳۵ء میں نکالا ان اخباروں میں سنجیدہ و شائستہ نرم گرم انداز میں حقوق طلبی کے مضامین منظر عام پر آنے لگے اور بھوپال کے عوام میں حقوق طلبی کا شعور بیدار ہوتا گیا انجمن خدام وطن کے اندر جن نوجوانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں ابو سعید بزمی قدوس صہبائی، طرزی مشرقی، لطف اللہ نظمی فضل علی سرور وغیرہ وغیرہ پیش پیش تھے پھر اس انجمن کے گویا مستقل صدر طرزی مشرقی ہوئے اور آصف علی خاں نائب صدر رہے اخبار صبح وطن کے خلاف گورنمنٹ نے مقدمہ قائم کر کے شاکر علی خاں، احمد مکی، عبد الرحمٰن کوکب وغیرہ کو تین ماہ کے لیے

جیل بھیج دیا۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ فرنگی سامراج کے خلاف سب سے پہلے علم بغاوت مسلم علمائے حق نے اپنا مذہبی دملی فریضہ سمجھ کر اپنے کندھوں پر اس وقت اٹھایا جب کہ برادران وطن خصوصاً بنگال کے بابو انگریزی تعلیم و تہذیب کی طرف تیزی سے قدم بڑھا رہے اور فرنگی سامراج کے اعلیٰ عہدوں کے حاصل کرنے میں پیش قدمی کر رہے تھے چوں کہ برطانوی سامراج نے پورے ملک کو مسلمانوں سے ہی چھینا اور اس پر ناجائز قبضہ جمایا تھا اس لیے وہ اس میدان میں سب سے پہلے کود پڑے۔ برادران وطن کی سیاست کا آغاز تقسیم بنگال ۱۹۰۵ء سے ہوا تھا جب کہ علمائے حق فرنگی سامراج کے خلاف محاذ قائم کر کے کئی معرکہ سر چکے تھے۔ بہر حال جس طرح ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کے قدم پہلے پڑے تھے اسی طرح ریاست بھوپال کی بھی خوش قسمتی ہے کہ یہاں بھی حقوق طلبی کی جنگ میں مسلمان ہی پیش پیش رہے اور اس سیاسی جنگ کو فرقہ وارانہ رنگ نہیں دیا بلکہ اس کو قوم پروری کے سانچے میں ڈھالا ریاست کی ہندو اکثریت اس تحریک سے بے تعلق رہ کر زیادہ تر تجارت کی گرم بازاری میں لگی رہی چنانچہ ماسٹر لال سنگھ جو بعد میں پرجامنڈل کے لیڈر کی حیثیت سے ابھرے ابتدا میں ۱۹۳۴ء مہاسبھا کی داغ بیل ڈالی ایسے ہی پنڈت چیتر نارائن مالوی پنڈت لکشمن جی ریا اور دیگر برادران وطن اس تحریک میں شامل ہوتے چلے گئے۔ بہر حال ان تحریکات کا سارا بوجھ مسلمانوں نے اپنے کندھوں پر اٹھایا اس طرح ہر آزادی پسند ایک ایک کر کے شامل ہوتا گیا۔ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور قافلہ بنتا گیا

ریاست میں پہلی انتخابی کشمکش ۱۹۳۴ء

ریاست بھوپال کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں عہد سلطانی میں دستور ساز اسمبلی (لیجسلیٹو کونسل) قائم ہوئی جو شہر و مفصلات کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی تھی لیکن اس کی بنیاد پرانے جاگیردارانہ نظام پر رکھی گئی تھی اس لیے سرکار اپنے وفاداروں خوشامدی لوگوں اور جاگیرداروں کو رکن بناتی تھی اس طرح اس کی بناوٹ الیکشن کے بجائے سلکشن پر مبنی تھی لیکن جب بھوپال میں سیاسی انجمنیں بنیں اور ان کے ذریعہ عام رعایا میں حقوق طلبی کا جذبہ ابھرا اور سیاسی شعور بیدار ہوا تو اب حکومت کے چشم ابرو کے اشارے پر نمایندہ منتخب کرنے کے بجائے اپنے پسندیدہ نمایندہ کو کھڑا کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا چنانچہ جب کونسل کا انتخابی اعلان ہوا تو سرکار کے حمایتی نصیر الدین وکیل کے مقابلہ میں ستار جمال، بھوپال کے نمایندہ کی حیثیت سے اس میدان میں اترے ان کا یہ اقدام پچھلی روایات کے خلاف غیر معمولی اقدام تھا اس لیے عوام میں زبردست ہماہمی پیدا ہوئی۔ برطانوی ہند کی انتخابی کشمکش کا نظارہ ریاست میں پہلی بار دیکھنے میں آیا عوامی جوش و خروش نے سرکاری مشنری پوری حرکت میں آنے کے باوجود اپنے نمایندہ کو کامیاب بنایا جس کا سرکاری حلقوں میں سخت ردّ عمل ہوا ستار جمال کے خلاف ان کی نااہلیت کی عذرداری کا مقدمہ ۱۹۳۴ء میں دائر ہوا اور ان کے خلاف فیصلہ ہوا اس فیصلے نے بھوپال کی سیاست میں نئی کروٹ لی عوام میں حکام بالا کے خلاف نفرت کی لہر پھیل گئی نواب صاحب اس وقت انگلستان میں تھے جب بھوپال واپس ہوئے تو ازراہِ سیاست مراحم خسروانہ کے عنوان سے ایک فرمان جاری کیا جس کے اندر ستار جمال کے دوبارہ کونسل کی امیدواری کے لیے کھڑے ہونے کی اجازت دی گئی پھر ستار جمال جب مقابلہ میں کامیاب ہوئے تو صبح وطن نے "غیر ملکی فرعون

کی شکست فاش "، کے عنوانوں سے اس خبر کو شائع کیا عام رعایا کے گرم احساسات بظاہر ٹھنڈے پڑ گئے لیکن اندر ہی اندر حکام بالا کے خلاف جذبات پرورش پاتے گئے اور سیاسی انجمنیں اور اس کے سیاسی کارکن اس کو ہوا دیتے رہے۔

اس عوامی فتح نے سیاسی رہنماؤں میں ایک نیا حوصلہ اور نیا ولولہ بخشا بکھرے ہوئے شیرازہ کو جمع کرنے کا خیال اور حکومت سے سیدھا سیدھا ٹکر لینے کا عزم پیدا کیا اس وقت شاکر علی خاں ایک تجربہ کار جرنیل کی طرح غیر ملکیوں کے خلاف ایک ہی ہلا بول کر فتح کا جھنڈا لہرانے کا ارادہ کرنے لگے چنانچہ شاکر صاحب نے صبح وطن میں ایسا کارٹون چھاپنا چاہا جس سے عدالت کی تحقیر ہو سکے اور چھپنے سے پہلے کانوں کان اس کی خبر نہ ہو ایم عرفان نے وہ کارٹون بنایا اور صبح سویرے چھپتے ہی سڑکوں، چوراہوں پر لگ گیا پورے شہر میں ہلچل مچ گئی۔ خفیہ پولیس پاگلوں کی طرح سڑکوں پر دوڑتی اور اس کو پھاڑتی نظر آنے لگی پولیس ساڑھے چار بجے صبح وطن کے دفتر میں شاکر علی خاں، احمد مکی، سید حافظ علی، بھگوان دیال نشاط کے نام وارنٹ لے کر پہونچ گئی۔ علوی پریس کی تلاشی لی اور اس کے مالک اصغر حسین صاحب کا ضمانتی وارنٹ لے کر پریس میں حاضر ہوئے مولوی صاحب نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا صبح وطن کی تلاشی پر ہزاروں شہریوں کا سیلاب امنڈ آیا بھوپال کی سیاسی تاریخ میں یہ سب سے بڑا عوامی مظاہرہ تھا جو پولس کے خلاف ظہور میں آیا۔ اخبار کا چارج قدوس صہبائی اور فضل انصاری نے لیا جب ۲۲ اگست ۱۹۳۷ء کو ان کو دیر سے عدالت لایا گیا تو راستہ میں انسانوں کا دریا لہریں لے رہا تھا بھوپال زندہ باد صبح وطن زندہ باد کے نعروں سے پوری فضا گونج رہی تھی۔ حکومت نے عوام کو مرعوب کرنے کے لیے جیل پہاڑی سے عدالت تک دورویہ پولس لائن کھڑی کر دی تھی لیکن عوام بے تحاشا گھروں سے نکل کر ان سیاسی قیدیوں کی پذیرائی کر رہے تھے بعض پر جوش لوگ اسٹکوں سے مسلح ہو کر اپنے محبوب رہنماؤں کو چھڑانے

کے عزم سے آئے تھے لیکن پولس کی مدافعت سے زیادہ ولی عہد عابدہ سلطان کی یقین دہانی اور خود ان رہنماؤں کی اپیل پر مجمع پیچھے ہٹ گئے شاکر علی خاں نے بیان دیا کہ میں غیر ملکی جج صاحبان کو جواب نہیں دوں گا اگر بھوپالی جج ہوں گے تو جواب دوں گا۔ میں نے ہی کارٹون بنایا اور اس کو چھاپا ہم نے عدالت کی کوئی تحقیر نہیں کی اگر کرنا ہوگا تو ڈنکے کی چوٹ پر کروں گا ۲۵ اگست ۱۹۲۹ء میں تین ماہ کی سزا کا فیصلہ سنایا گیا بھگوان دیال نشاط بری کر دیئے گئے۔ یاد رہے کہ یہ سید حافظ علی وہی سیاسی کارکن ہیں جن کو ریاست نے آخر میں سلطان پور میں گوشہ نشین ہونے پر مجبور کیا۔ اسی روز شام کو مولانا رزمی دہلی سے بھوپال پہونچے اور کملا پارک میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کر کے ایسی ولولہ انگیز تقریر کی عوام کے دل و دماغ کو گرما دیا۔

پریس ایکٹ کا نفاذ ۱۹۳۶ء

چوں کہ حکومت کے خلاف جذبات پیدا کرنے میں قومی اخبارات خصوصاً صبح وطن کا بڑا ہاتھ تھا اس لیے حکومت نے قانون پریس ایکٹ ۱۹۳۶ء میں اخبارات کا گلا دبانے کے لیے بھوپال کونسل سے پاس کرانا چاہا مولوی عبد الغفور وزیر قانون انصاف نے کونسل میں اپنی رپورٹ کو سنایا جس کے اندر سیٹھ من موہن داس اور مفتی فضل اللہ کا اختلافی نوٹ تھا لیکن حامد رضوی صاحب نے اصل مسودہ سے اختلاف کیا ستار جمال نے کہا میں نے اس مسودہ کو نافذ الوقت پریس ایکٹ کی موجودگی میں قطعاً غیر ضروری اور غیر آزادی تحریر و تقریر کیلئے ناواجبی جکڑ بندیوں کے مترادف سمجھتا ہوں مولانا خالد انصاری نے اصل مسودہ سے مکرر اختلاف کرتے ہوئے دفعہ ۵۳ء کے حوالہ سے کہا کہ اس مسودہ کو اجلاس میں پیش کرنا اس لیے جائز نہیں ہے کہ اس کے پہلے سے مشتہر ہی نہ ہو سکی مولانا کی اس گرفت سے سرکاری بینچ پر سناٹا چھا گیا لیکن جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آرہا

ہے کہ طاقت واکثریت کے بل بوتے پر یہ کالا قانون اسی طرح پاس کر دیا گیا جیسا ہماری قومی پارلیمنٹ میں پاس ہو جاتا ہے۔

بھوپال نیشنل لیگ کا قیام

پریس ایکٹ کے اس کالے قانون کے ساتھ مزید ایک اور سنگین قانون ملازمان سرکاری کے لیے پاس کر دیا گیا کہ وہ گورنمنٹ کے خلاف کسی تحریک میں خفیہ یا علانیہ حصہ نہ لیں اس لیے سیاسی کارکنوں کا پہلا جلسہ منصب منزل احمد آباد اور دوسرا جلسہ حامد رضوی صاحب کے مکان پر زیر صدارت ملک راج منعقد ہوا صدارت کی تجویز شاکر علی خاں اور تائید حکیم قمرالحسن اور ظہیر الدین انصاری نے کی۔ تائید سے پہلے بھوپال نیشنل لیگ کا قیام عمل میں آیا حافظ نصیر الدین ٹھیکیدار صدر۔ پنڈت لکشمن آیا نائب صدر شاکر علی خاں ایڈیٹر صبح وطن سکریٹری ظہیر الدین انصاری نائب سکریٹری ملک راج خزانچی ہوئے مجلس عاملہ کے ارکان میں حامد رضوی مولانا خالد انصاری۔ ابوسعید بزمی۔ ٹھاکر لال سنگھ نصیر الدین وکیل۔ عطاء اللہ خاں حکیم سید قمرالحسن تھے۔

اس جماعت کے اغراض و مقاصد حسب ذیل قرار پائے۔

(۱) نظام حکومت میں مناسب اصلاحات کے پرامن وآئینی ذرائع سے جد و جہد کرنا۔

(۲) ریاست کا ادنیٰ و اعلیٰ تمام سرکاری ملازمین میں اہل بھوپال کو داخل کرنے کی سعی کرنا۔

(۳) عوام کے دماغوں کو تربیت دینا اور ان کو دستوری اصولوں اور بنیادی حقوق سے واقف کرنا۔

(۴) افلاس و بے روزگاری وجہالت کا کلیتہً استیصال کرنے کے لیے بنیادی اصلاحات کے حصول کی کوشش کرنا

(۵) کاشتکاروں اور پسماندہ طبقات کی معاشرتی و ذہنی و اخلاقی سطح کو بلند کرنا دستوری اصول کے مطابق ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے جائز اور قانونی حقوق کی حفاظت کرنا۔ (شعلہ حیات یکم ستمبر ۶۲ء)

اب صبح وطن ثانی کے ایڈیٹر شاکر علی خاں اور اعزازی مدیر قدوس صہبائی ہوچکے تھے اور بھوپال میں اخبار "نوجوان" عمران انصاری "مصنف" شیام بہاری لال نے نکالا۔ حکومت کی طرف سے اخبار ندیم ۱۹۳۶ء محمود الحسن صدیقی کی ادارات میں نکلنا شروع ہوچکا تھا اب ہم یہاں اخبار صبح وطن کا ایک اداریہ نمونہ کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ اس کے انداز تحریر کا اندازہ کیا جاسکے؟

"بھوپال میں ملکی و غیر ملکی کا سوال جو اہمیت حاصل کرچکا ہے وہ ظاہر ہے یہ امر اہل ملک پر بالبداہت ثابت ہوچکا ہے کہ ملکیوں و غیر ملکیوں کے درمیان کوئی مستقل حد فاصل قائم نہ کی جائے گی تو ان کے سیاسی و ملکی حقوق محفوظ نہ رہ سکیں گے ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہمارے پیدائشی حقوق کی پامالی ملکی و ملّی موت ہے اگر ہمیں اپنی زندگی منظور ہے اگر ہمیں حکومت زندہ رکھنا چاہتی ہے اور بھوپال کے مستقبل قریب میں بھوکے اور ننگ انسانیت افراد کی کوئی شرمناک و ذلیل بستی بنا دینا نہیں چاہتی تو اس کا فرض ہے کہ وہ ہمارے مخلصانہ اور دانشمندانہ مشوروں پر عمل کرے ہمارے حیات کے بنیادی اسباب ہم سے نہ چھینے کہ کسی ملک کی فلاح و ترقی کا راز اس کے پیدائشی حقوق کی حفاظت و اور صیانت میں مضمر ہے (صبح وطن ثانی آگرہ ایڈیشن یکم نومبر ۱۹۳۶ء)

اس کے بعد دوبارہ صبح وطن میں ایک قابل اعتراض کارٹون مارچ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا جس پر حکومت بھوپال کے خلاف بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور ۲/۲ سال کی قید بامشقت دی گئی اس کارٹون میں ایک حوض دکھایا گیا تھا جس کا پانی ٹونٹیوں کے ذریعہ سے غیر ملکی حکام بھر رہے تھے اور دیسی لوگ اپنے برتن لیے ہوئے ان کے منہ تک رہے تھے چنانچہ

شاکر صاحب ۔ طرزی مشرقی فضل علی سرور ۔ عبدالرحمٰن کو کب سزایاب ہوتے اس مقدمہ کے سلسلے میں شاکر صاحب نے جیل سے ایک مفصل بیان جاری کیا جس کا قابل ذکر حصہ یہ ہے ۔

"تمام انسانوں کا طبعی میلان و شعور تقریباً یکساں رہا ہے یعنی سبھی اپنے وطن میں پھلنا پھولنا چاہتے تھے اور مقام پیدائش سے غذا حاصل کرنا چاہتے ہیں انسان ہی نہیں حیوانات نباتات بھی یہی رجحانات رکھتے ہیں اور وہ حق رکھتے ہیں کہ ان تمام دقتوں کو رفع کریں جو کسی نہج سے ان کے نشو و نما میں مانع ہوتی ہوں ان حقائق کے باوجود زندگی اور اس کے بڑھنے کی ہر تڑپ بھوپال میں جرم قرار دی جاتی ہے تو ہم ضرور مجرم ہیں اور یہ جرم ہم سے ہمیشہ سرزد ہوتا رہے گا ۔

شاکر صاحب جیل میں ۶ / ماہ رہے پھر ان کو والد کی وفات کی وجہ سے رہا کر دیا گیا وہ اس غم کو لے کر بیٹھے نہیں بلکہ پرانی سیاسی سرگرمیوں کا دوبارہ آغاز کیا اور ۱۹۳۷ء تک سیاسی تنظیم میں لگے رہے ۔

سیاسی رہنماؤں پر بیجا مقدمات

ریاست میں حقوق طلبی کا وہ قافلہ جو ابتدا میں چند گنے چنے افراد پر مشتمل تھا ریاستی حالات اور برطانوی ہند کی حریت پسندانہ تحریکات کی ہواؤں میں آگے بڑھتا گیا نوجوان طبقہ جن کی رگوں میں ہمیشہ تازہ و گرم خون گردش کرتا رہتا ہے اس قسم کی پرجوش تحریکات میں پیش پیش رہتے ہیں بھوپال میں بھی حمید قریشی عمران انصاری ۔ یحییٰ علی خاں وغیرہ جیسے سرگرم نوجوان اس قافلہ میں شامل ہوتے چلے گئے ۔

اس دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے ریاستی سیاست کے ساکن سمندر میں غیر معمولی تموج پیدا کیا موٹر یونین کے صدر میاں فضل انصاری

نے اپنی یونین کے جلسہ میں حمید قریشی کو دعوت تقریر دی حمید صاحب نے اپنی تقریر میں یونین کے مطالبات کی پرجوش انداز میں حمایت کرتے ہوئے اس طرح کے الفاظ کہے۔

ایسے خداوند جن کی حکومت میں غریب کو روٹی کپڑا اور ضروریات زندگی کا سامان نہ مل سکے ہم اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں،،

ان کی زبان سے نکلے ہوئے ان تیروں کا نشانہ حکومت تھی اس کے ان کے خلاف عدالت میں مقدمہ درج کر لیا گیا جب یہ واقعہ انجمن کے ارکان تک پہونچا تو زیادہ تر لوگوں نے الفاظ کے واپس لینے کا مشورہ دیا لیکن شاکر صاحب نے نجی طور پر ان سے کہا کہ انسان کے لیے آگے بڑھنا اور لیڈر بننے کے ایسے زریں موقع کم آتے ہیں اس موقع کو ہاتھ سے نہ دینا چاہتے چنانچہ حمید صاحب اپنے موقف پر جمے رہے اور گرفتار ہو کر نظر بند کر دیئے گئے جب عدالت میں چالان پیش ہوا اور حمید صاحب کو عدالت لایا گیا تو یہ عدالت نے حکم جاری کیا کہ اس مقدمہ کی کارروائی خفیتہً ہوگی۔ اس اعلان سے عوام میں جوش وخروش کا سیلاب ابل پڑا اور ریمر گیٹ سے ہائی کورٹ تک عوام کا سمندر راہریں لینے لگا۔ پولس کی مزاحمت کے باوجود پرجوش عوام کا ایک مجمع عدالت کے کمرے میں گھس پڑا اس کے اندر شاکر علیخاں لطف اللہ خاں نظمی وغیرہ بھی تھے اس غیر معمولی ہنگامہ کو دیکھ کر لوگوں کے بھوپال زندہ باد انجمن خدام وطن زندہ باد کے مسلسل نعروں کی گونج نے عدالت کو بوکھلا دیا۔ مقدمہ کی سماعت ملتوی اور خود ملزم پولس کی گرفت سے آزاد ہو گیا عوام کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر تھا اور حمید قریشی خدام وطن کے ارکان ان لہروں میں بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے پولس شمندر تھی جب عمران انصاری اور دوسرے لوگوں نے قریشی صاحب کو ہار پہنائے تب پولس حمید صاحب کو موٹر میں بٹھا کر جیل لے گئی لیکن اس حادثہ کی وجہ سے حکومت نے اصل ملزم کے ساتھ انجمن کے ارکان پر بھی دو مقدمہ بلوہ اور نقب زنی کے قائم کر دیئے

قومی رہنماؤں پر یہ انوکھے چارج لگاکر عدالت نے ان سیاسی ملزموں کو اخلاقی مجرموں کے کٹہرے میں لاکر کھڑا کردیا۔

بجلی کی روشنی میں اس اندھیرنے جاہل و ناخواندہ عوام کے ساتھ سنجیدہ اصحاب فکر کو بھی حکومت سے بدظن کردیا حکام بالا کے خلاف جو جذبات عوام تک محدود تھے اب ان کا دائرہ خواص تک پہونچ گیا جو جو یا غیابہ خیالات سینے میں چھپے ہوتے تھے اب زبان کے ساحل سے ٹکرانے لگے۔ ان مقدمات اور ان کے فیصلوں نے بھوپال کی سیاست کے تھمے ہوتے دریا میں روانی پیدا کردی ان رہنماؤں کو ۲ و ۲ دو سال قید بامشقت کی سزا دیدی گئی شاکر علی خاں قدوس صہبائی۔ چتر نارائن مالویہ، نور باز خاں لطف اللہ خاں نظمی حفیظ الرحمان دبھورے میاں، غلام رسول قادری عمران انصاری اور حمید قریشی ہیں۔

جب ان رہنماؤں کو دو سال کی سزا دی گئی تو میاں اخلاق محمد خاں جو خدام وطن کے بنیادی ارکان میں سے تھے ایک مضمون ”بھوپال قتل گاہِ عوام“ کے عنوان سے مدینہ اخبار میں شائع کرادیا ان کے خلاف وارنٹ جاری ہوا اور وہ اپنے گاؤں سے وردشہ چلے گئے چھ ماہ کی جلاوطنی کے بعد واپس لوٹے۔ بہرحال قومی رہنماؤں کے ساتھ یہ عجیب وغریب مقدمہ اور اس کا فیصلہ بھوپال کی ان ہنگامی ریاست کے لیے سنگ میل ثابت ہوا ۔

ع یہ پرپروانہ شاید بادبانِ کشتی مئی تھا۔
ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

بھوپال کا دوسرا انتخابی ہنگامہ

ایک طرف حقوق طلبی کا قافلہ بوڑھوں کے ساتھ نوجوانوں کو اپنے ساتھ لیکر قدم بڑھا رہا تھا دوسری طرف ریاست میں لیجسلیٹیو کونسل کے دوسرے انتخاب کا شور پھیلا سرکار کے حمایتی امیدواروں کے ساتھ انجمن خدام کے کچھ ارکان

ابوسعید بزمی، قدوس صہبائی، محمود الحسن (سیہور) اور مدن لال گپتا ہی میدانِ انتخاب میں اترے بزمی صاحب نے اپنی تقاریر کے علاوہ سچی باتیں کڑوی باتیں،، کے عنوان سے عوام میں حقوق شناسی کے پمفلٹ شائع کئے ایک طرف انتخابات کی وہ شورا شوری رہی کہ الامان والحفیظ دوسری طرف یہ بے تمکی ہوئی کہ جب مدن لال گپتا کے علاوہ عوامی نمائندے کامیاب ہوئے تو بزمی صاحب کے خلاف ان پمفلٹوں کی بنا پر مقدمہ قائم ہوا اور سزایاب ہو کر جیل بھیجدیئے گئے بہر حال ان نمایندوں کے عوام کے حقوق کی ترجمانی کی ان کی وجہ سے کونسل میں ہماہمی رہی۔

پرجا منڈل کا قیام ۱۹۳۸ء

ریاست بھوپال میں سیاسی سرگرمیوں کا آغاز چند گرم جوش منچلے نوجوانوں کے ہاتھوں ہوا تھا جو سب کے سب مسلمان تھے لیکن پچھلی سیاسی کارروائیوں کے اتار چڑھاؤ نے ہر طبقہ خیال کو اپنی طرف کھینچ لیا برادرانِ وطن جو ابھی تک اپنے خول میں ہندو مہاسبھا جیسی جماعتوں کے حصار میں محصور تھے خدام وطن کی تحریک نے ان کے اندر زندگی کا ولولہ اور مقابلہ کا حوصلہ پیدا کیا اس لئے جس طرح شیخ الہند کی تحریک جہاد کی ناکامی نے علماء حق کو آزادی ہند کی مہم میں برادران وطن کے اشتراک پر مجبور کیا اسی طرح خدام وطن کے کارکنوں نے حقوق طلبی کی تحریک کے اس معرکہ کو یکہ وتنہا سر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لیے ماسٹر لال سنگھ پنڈت چتر نارائن مالوی اور دیگر برادران وطن کو ایک مشترک جماعت بنانے کی دعوت دی کہ وہ فرقہ پرست جماعت کو توڑ کر مشترک جماعت میں شریک ہو جائیں یہ دعوت اس لحاظ سے کامیاب ہوئی کہ برادرانِ وطن میں آزادی پسند افراد اس جماعت کی تشکیل میں شریک ہوئے لیکن مہاسبھا بدستور قائم رہی انجمن خدام وطن کو توڑ کر پرجا منڈل ۱۹۳۸ء میں اس طرح بنی کہ ردبی ہوٹل میں

اس کے لیے دعوت نامہ چار صاحبان کی طرف سے جاری کیا گیا شاکر علی خاں ، ابو سعید بزمی ، ارشد تھانوی ، ردی دت شرما ، کل گیارہ آدمی اس میٹنگ میں حاضر آئے داعیوں کے علاوہ ٹھاکر لال سنگھ چتر نرائن مالوی ، جمنا پرشاد بھٹ اخلاق محمد خان مشرف محمد خاں عرشی باسط بھوپالی چنانچہ اس کے کنوینر شاکر صاحب ہوئے اور ممبر سازی کے بعد اس کے صدر ابو سعید بزمی اور بابو لال شرما اس کے سکریٹری اور مذکورۃ الصدر افراد مجلس عاملہ کے ارکان بنائے گئے۔ پرجا منڈل کا الحاق آل انڈیا اسٹیٹ پیپلز کانفرنس سے ۱۹۳۹ء میں ہوا جس کا پہلا اجلاس لدھیانہ میں پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں ہوا اس اجلاس میں شاکر صاحب نے بھوپال کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی۔

دیسی اور پردیسی کا مسئلہ

اس وقت تک بھوپال میں جو بھی انجمنیں حقوق طلبی کے میدان میں جدوجہد کر رہی تھیں ان کا مطمح نظر دیسی و پردیسی مسئلہ تھا۔ حیدرآباد اور دوسری ریاستوں میں بھی یہی مسئلہ اس وقت زور شور سے ہنگامہ پیرا تھا اور اس کا حل بقول بزمی صاحب یہی قرار دیا گیا تھا کہ حکومت میں افسرانِ بالا سے لے کر نیچے کے درجے تک ملکی باشندوں کو ترجیح دی جائے پہلے تو یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ دیسی کون ؟ پردیسی کون ؟ پھر اگر کوئی قانون بنا لیا جائے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ دیسی لوگوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد ملکی باشندوں کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے کیوں کہ بارہا کے تجربات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اقتدار اعلیٰ کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد دیسی پردیسی کے رویہ میں کچھ مستثنیات کو چھوڑ کر کچھ فرق نہ ہوا بقول شخصے کہ "ہر کہ در کان نمک رفت نمک شد" اقتدار پرستانہ ماحول میں پہونچ کر ہر آدمی اسی رنگ میں رنگ جاتا ہے اس لیے عوام کے جو مسائل حل طلب تھے وہ جب بھی حل طلب رہے کیوں کہ مرض کی صحیح تشخیص نہیں کی گئی

اس لیے وہ علاج بھی کارگر نہ ہو سکا۔

ریاستی باشندوں کی شکایات بقول بزمی صاحب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ عوام کے بنیادی حقوق فنڈمنٹل رائٹس ریاستوں میں غیر محفوظ بلکہ مفقود ہیں یعنی نہ تو عوام کی زندگی سدھارنے اور ان کے لیے وسائل معاش فراہم کرنے کی طرف ریاست نے کوئی توجہ کی نہ تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے نہ سرکاری ملازمتوں میں مساوی و یکساں حقوق حاصل ہیں شہری ہونے کی حیثیت سے کوئی عزت ہے نہ تعلیم و تربیت کا خیال ہے۔

۲۔ اصول حفظان صحت کے اعتبار سے محلوں، گلیوں، سڑکوں کی صفائی کھلی ہوا و روشنی کا معقول اہتمام نہ گندے پانی کی نکاسی کا انتظام ہے نہ ان کے لیے تفریح گاہیں نہ پارک، اس کی مثال قصبہ سیہور، بھوپال ہے جب تک ایجنسی کے ماتحت تھا نہایت صاف ستھرا تھا کاروبار کی حالت بھی عمدہ تھی لیکن ریاست میں شامل ہوتے ہی وہ بہتر حالت بدتر اور کاروباری احوال ابتر ہوتے چلے گئے، اس لیے قصبہ میں پہلی سی صفائی ہے نہ رونق و آبادی نہ وہ پہلی سی چہل پہل۔

۳۔ حکومت کی آمدنی کے اصل حقدار عوام ہیں لیکن یہ روپیہ چند مخصوص افراد پر خرچ ہوتا ہے اور عام انسان فاقہ کشی میں مبتلا رہتے ہیں۔

۴۔ عوام کو اعلیٰ تعلیم کی برکات سے محروم رکھا جاتا ہے اور ان کی ذہنی و دماغی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور پھر کہا جاتا ہے کہ ان کے اندر حکومتی ذمہ داریوں کے سنبھالنے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۵۔ کسانوں کی نہ تعلیم و تربیت ہے اور نہ ان کی کاشتکاری کے لیے سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں لیکن لگان اور ٹیکس ہر وقت بڑھتے رہتے ہیں غرض ان مسائل کا حل دیسی پردیسی میں مضمر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صحیح حل ذمہ دار حکومت ہے جو عوام کے سامنے جوابدہ ہو اور عوام کے ووٹ سے منتخب ہو کر آئی ہو رہا اقلیتوں کے مذہبی شعار اور خصوصی مراسم کی حفاظت کا ذمے دار فرمان روا

ہو گا (تلخیص ریاستوں کی سیاست ص ۲۰ - ۱۹)

چوں کہ کانگریس براہِ راست ریاستوں سے چھیڑ کرنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نوع کی جماعتوں کے قائم ہونے میں دلچسپی رکھتی تھی اس لیے پرجا منڈل جو دراصل کانگریس کی ریاستی شاخ تھی اس نے اب آگے بڑھ کر ذمہ دار حکومت کو نصب العین ٹھہرایا مسلم ریاستوں میں مسلم عوام کو اکثریت کے ہوّے سے ڈرایا جاتا تھا لیکن ان کو اس امر کے اعتراف میں ذرہ برابر جھجک نہیں کہ پرجا منڈل کے رہنماؤں میں ہندو مسلم عوام کے ذہن سے اس خوف کو نکالا اور ریاست بھوپال اپنی ہندو مسلم روایتی اتحاد کا آئینہ بنی رہی۔

کیوں کہ ریاستوں کی پسماندگی کی وجہ سے فرنگی سامراج کی ڈپلومیسی کے مکروہ اثرات ریاستوں کے باشندوں تک نہ پہونچ سکے تھے اس لیے برطانوی ہند کی طرح یہاں ہندو مسلم دنگے کبھی نہیں ہوئے اس مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ فرنگی سامراج کی منحوس سایہ کے پڑنے سے پہلے مشرق کے باشندوں کی رگ رگ میں مذہب و روحانیت رچی بسی ہوئی تھی مسلمان اپنے مذہب میں پختہ اور ہندو اپنے دھرم میں پکا تھا اس لیے اس قسم کے فسادات برپا نہیں ہوئے البتہ مغربی تہذیب کی اثرات سے جب یہاں کی قوموں کا اپنے مذہب و دھرم سے رشتہ کمزور پڑ گیا تب مذہب کے نام پر سامراج اور سرمایہ دار ٹولی نے فسادات اپنے سیاسی و اقتصادی ناجائز مصالح کے لیے شروع کرا دیئے اس لیے یہ مذہبی فسادات نہیں بلکہ برطانوی سامراج اور اس کے حواریین کے سیاسی ہتھکنڈے ہیں جو آج تک جاری ہیں بہرحال ان فسادات سے ریاستیں بہت حد تک محفوظ رہیں ان دور میں مسلم ریاستوں میں ہندو وزیر اعلیٰ اور ہندو ریاستوں میں مسلمان دیوان ہوتے تھے اور دونوں پہیوں سے حکومت کی گاڑی چلتی تھی بہرحال پرجا منڈل کے رہنماؤں کے ذہن میں عوام کے اصلاح حال کے یہ خاکے تھے جس کے اندر رنگ بھرنے کے لیے ملک کی آزادی مطلوب

تھی لیکن آزادی کا ناگہانی سیلاب جس طرح ملک میں آیا اس نے ان سارے منصوں پر پانی پھیر دیا ہے

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

مزدور تحریک اور بھوپال

جیسا کہ بار بار گذر چکا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں انقلاب کا پیش خیمہ بن کر آئی جس کی بنیاد مشینی نظام پر قائم ہوئی۔ یوں تو دنیا میں غربت و پسماندگی افلاس و بھکمری کا دور دورہ ہر دور میں رہا ہے قبائلی زندگی ہو یا شہنشاہی نظام جس کی بنیادیں جاگیر دارانہ نظام پر کھڑی کی گئیں تھیں لیکن دنیا کے پردے پر جب صنعتی نظام نے اپنا پر توڈالا اور انسانی ضروریات کی تکمیل کے لیے مشینیں حرکت میں آئیں تو کارخانہ عالم میں ایک نئی زندگی منظر وجود پر جلوہ گر ہوئی ان سائنسی اختراعات و ایجادات سے سالوں کا کام مہینوں اور مہینوں کا کام ہفتوں اور ہفتوں کا کام دنوں میں انجام پانے لگا اور ہر قسم کی مصنوعات کی پیداوار بہت تیزی سے بازاروں اور منڈیوں میں پہونچنے لگی تصویر کے اس روشن رخ کے ساتھ دوسرا تاریک پہلو بھی سامنے آیا کہ ان مشینوں نے ہزاروں آدمیوں کے کاموں کو چند ہاتھوں میں دے دیا جس کی وجہ سے عالمگیر بے روزگاری کے تاریک سائے ہر طرف پھیلنے لگے اس حقیقت کو اس طرح تمثیلی پیرایہ میں ادا کیا جا سکتا ہے کہ پہلے زمانے میں شہروں کے اندر رات کے اندھیرے میں روشنی کرنے کے لیے سرشام لالٹین میں تیل ڈالنے اور ان کو روشن کرنے کے لیے سیکڑوں آدمی روزگار سے لگے ہوئے تھے اور جونہی الکٹرک پاور کے ذریعہ بجلی کا جال پھیلا تو بجلی گھر کے ڈیا ورہاؤس، گنے چنے ملازموں کو چھوڑ کر بقیہ سارے آدمی بیکار ہو گئے ایسے ہی کلاتھ مل اور مختلف کارخانوں کے قائم ہونے سے لاکھوں آدمی بے روزگاری اور بھکمری کا شکار ہو گئے اس مسئلہ نے پہلے یورپ

اور پھر ساری دنیا کو عالمگیر خلفشار سے دوچار کر دیا اس صنعتی نظام سے سرمایہ دارانہ نظام کی داغ بیل پڑی اور مل مالکوں اور سرمایہ داروں نے دنیا کے غریبوں ضرورتمندوں کا استحصال (ناجائز نفع اندوزی) شروع کر دیا کیوں کہ سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جائز و ناجائز طریقہ سے دولت سمٹ کر آتی تھی۔

اس لیے انھوں نے اس محنت کو جو اصل میں دولت کو وجود میں لانیوالی اور خود اصل دولت ہے جس کو مارکس نے قدرِ زائد سے تعبیر کیا ہے اس کو اپنی چابکدستی سے تھوڑی سی اجرت کے ذریعہ قبضہ کر لیا اور مزدوروں کو صیدِ زبوں بنا لیا بقول اقبال ؎

ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغ کارزاری ہے
تعجب ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے

اس ظالم و جابر سرمایہ داری کا توڑ بن کر اشتراکیت و اشتمالیت نمودار ہوئی جس نے محنت و دولت دونوں ہی کو حکومت کا حق قرار دے کر معمولی روٹی کپڑا، دیگر اور کلچر پروگرام کے تماشوں میں الجھا کر عوام کو اپنے شکنجے میں کس لیا وہاں مٹھی بھر چند چالاک سرمایہ دار رکھنے یہاں طاقتور و حریت پسند حکومت جس نے مزدوروں کے نام پر آمریت ڈکٹیٹرشپ، پرولتاریہ کا چولا بدل کر انسانوں کو صدیوں کی محنت سے حاصل کردہ آزادیوں سے محروم کر دیا اس طرح دنیا دو کیمپوں میں بٹ گئی ایک طرف سرمایہ داری نے بہترین دماغوں کو خرید کر ان کے ذریعہ اپنا تحفظ کرنا چاہا دوسری طرف انسان کی بنیادی ضروریات سے محرومی اور عوام کی اکثریت کے افلاس اور بھکمری نے قلب و ضمیر کو دستک دی اس لیے اب ہماری دنیا محنت و سرمایہ کی دائمی جنگ کا اکھاڑہ بن گئی ہے جس کے دو مشہورِ عالم پہلوان امریکہ و روس ہیں ان دونوں نظاموں کے باہمی تصادم سے پوری انسانیت چکی کے دو پاٹوں

کے زیج پس رہی ہے۔

ریاست بھوپال میں جب دور حمیدی نے ۱۹۲۶ء میں قدم رکھا تو نواب صاحب نے پہلے سیہور شوگر فیکٹری اور پھر بھوپال میں کلاتھ مل کی بنیاد ڈالی سیکڑوں لوگ جس سے برسرکار ہوئے تھوڑے عرصہ بعد مزدور و سرمایہ دار کی کشمکش کا آغاز ہوا "خدام وطن" کے ارکان اس میدان میں بھی کود پڑے جس کے سپہ سالار شاکر علی خاں تھے۔ شاکر صاحب مزدوروں کی حق طلبی کے جرم میں پہلی بار ۱۹۳۹ء میں نو ماہ تک نظر بند رہے پھر عوام کے سیاسی شعور کے ابھارنے اور مظلوم تحریک کو منظم کرنے کی پاداش میں ۲ دو سال کے لیے دوبارہ جیل میں ڈال دیئے گیے اس قید سے رہا ہو کر آنے نہ پاتے تھے کہ ہندوستان چھوڑدو کی تحریک میں پھر گرفتار کر کے مزید دو سال کے لیے جیل جا پہنچے۔ گویا جیل ان کیلئے صحن آنگن بن گئی تھی ان کی ان خدمات نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا قید و بند کی ان سزاؤں نے ان محبان وطن کی ذوق سیاست کو پختہ و مضبوط کر دیا بقول حالی ؎

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

ہندوستان چھوڑدو کی تحریک اور بھوپال

برطانوی سامراج نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کو حکومت برطانیہ کی ایک ماتحت نوآبادی قرار دیکر آئینی حکومت کے ڈھانچہ کا اعلان کیا ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافی کے بعد ہمارا ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے بے ایمان ظالم اور ستمگر تاجروں کے ہاتھ سے نکل کر براہ راست انگلستان سے متعلق ہو گیا لیکن برطانوی سامراج نے حکومت کا ایسا آئینی ڈھانچہ تیار کیا جس کی رو سے ہندوستان کی دولت مستقل طور پر انگلستان منتقل ہونے لگی ملک کنگال بنتا گیا تمام کلیدی عہدے

انگریزوں نے اپنے ہاتھ میں رکھے افسری لائن کی بڑی ملازمتیں انگریزوں کے لیے محفوظ کردی گئیں اور اپنے دفتری فولادی نظام کے شکنجہ میں معمولی سی تنخواہ پر ہندوستانیوں کو جکڑ لیا گیا تحصیلداری ڈپٹی کلکٹری ہندوستانیوں کی ملازمتی ترقیوں کی معراج تھی پھر برطانوی اور ہندوستانی باشندوں کی تنخواہوں میں زمین و آسمان کا فاصلہ تھا غرض برطانوی شہنشاہیت نے اپنی ناپاک اغراض کے ماتحت دستوری طریقہ سے ملکی دولت کو تیزی سے انگلستان پہنچانے کی راہ کو ہموار کیا سب سے پہلے بنگال کے تعلیم یافتہ طبقہ نے حقوق طلبی کا سوال اٹھایا اور پھر پورے ملک میں اس کا احساس جاگ اٹھا اس احساس کو انقلابی کو روکنے کے لیے مسٹر ہیوم کے ذریعہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد پڑ گئی جس کے سالانہ اجتماعات حکومت اور تعلیم یافتہ طبقہ میں ربط پیدا کرنے کے لیے شاندار ہوٹلوں، اور ڈرائنگ روم میں تجویزیں پاس ہوتی تھیں اس جماعت کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ پورے ملک کو ایک قوم مان کر ملکی مسائل کے حل کا بیڑا اٹھایا تھا کانگریس برسوں مسٹر ہیوم کا پڑھایا ہوا سبق دہراتی اور حکومت کے آگے عرضداشتیں پیش کرتی رہی مسلمان علماء ۵۷ء کے پر تشدد مظالم اور خوشامد پرستانہ سیاست کے فروغ پانے کی وجہ سے گوشہ نشیں ہو کر مستقبل کے لیے نقشہ بنا رہے تھے سرسید کے نام سے علیگڈھ کے انگریز پرنسپل رجعت پسندانہ جماعتیں تشکیل کر کے مسلمانوں کو آزادی کی راہ میں آگے بڑھنے سے روک بنے ہوئے تھے۔

لیکن جنگ عظیم ۱۹۱۴ء نے دنیا کی پرانی ذہنیت کو الٹ کر رکھ دیا کیونکہ جنگ ایک زلزلہ بن کر دماغوں کو زیر و زبر کر دیتی ہے یعنی جس طرح زلزلہ زمین کی تہوں کو الٹ کر نئے معدنیات کو باہر نکال پھینکتا ہے اس طرح ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے غلام اقوام میں ایک نئی لہر اور نئے انقلابی خیالات پیدا کر دیئے برطانوی سامراج جو ہمیشہ اصلاحات کے کھلونوں سے ہندوستانیوں کو طفلِ ناداں سمجھ کر بہلاتا رہتا تھا اس جنگ میں ہندوستانیوں کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا کہ وہ اعلان کر دیں

کہ اب ہم بچوں کی طرح ان جھوٹوں وعدوں سے بہلنے والے نہیں ہیں جب تک ہمارے بنیادی حق آزادی کو تسلیم نہ کیا جائے۔

اتحادیوں کی فتح ۱۹۱۸ء آٹھ سو سالہ ترکی خلافت کے خاتمہ کے بھیانک حادثہ کے جلو میں آئی اس لیے مسلمانانِ ہند (جو علماء حق کے زیر تربیت رہ کر مذہبی جذبات سے لبریز تھے) اس ناگہانی سانحہ سے تلملا اٹھے چوں کہ مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم برطانیہ نے ۱۹۱۸ء کو اپنی تقریر میں کہا تھا "ہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دار الحکومت سے محروم کر دیں یا اسے ایشیائے کوچک اور اس کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیں" مگر فتح کے ہوتے ہی مسٹر ولیم کے اصول تسلیم کرنے کے باوجود اتحادیوں نے ترکی کے حصے بخرے کر کے "ترکی تمام شد" کا اعلان کر دیا اس لیے پورے ہندوستان میں برطانیہ کی اس غداری کے خلاف غم وغصہ کے جذبات بھڑک اٹھے خلافت کمیٹی ۱۹۱۹ء میں قائم ہو گئی جس کے اندر علی برادران نے مولانا عبدالباری فرنگی محلی کی قیادت میں ملک کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک دورہ کر کے ملتِ اسلامیہ کے جذبات کو گرما دیا یہی وہ زمانہ تھا جب کہ ولی اللہی تحریک جہاد کے آخری امام شیخ الہند مولانا محمود الحسن مالٹا سے اپنے جہادی منصوبے کو ادھورا چھوڑ کر ہندوستان واپس ہوئے تھے اور علماء نے برطانیہ جیسی فتحمند اور مغرور طاقتور دشمن کے مقابلہ میں مسلح انقلاب کے ذریعہ آزادی کو اب ناقابل عمل سمجھا اس لیے مشترک سیاست میں مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا چنانچہ اس موقع پر علی برادران نے گاندھی جی کا ملک سے تعارف کرایا اور ان کو سیاست کے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔

مولانا ابوالکلام جو اپنے اخبار "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعہ گاندھی جی کی آمد سے پہلے ۱۹۱۴ء ملک میں آزادی کا صور پھونک رہے تھے ان کے زرخیز دماغ نے ۲۰ دسمبر ۱۹۲۰ء میں مقاومت بالصبر کے عنوان سے سب سے پہلے سول نافرمانی کی تجویز خلافت کمیٹی میں پیش کی اسی

دوران میں حسن اتفاق سے یہی تجویز گاندھی جی نے کانگریس میں رکھی۔ مولانا ابوالکلامؒ نے اس تحریک کو وقتی و عارضی ضرورت کے اعتبار سے اختیار کیا تھا لیکن گاندھی جی نے اس کو اپنی زندگی کا مستقل مشن بنا لیا جس کی وجہ سے وہ ستیہ گرہ کے بانی کی حیثیت سے مشہور عالم ہوئے چوں کہ اب پرانی خوشامد پرستانہ سیاست نے دم توڑ دیا تھا اور کھلے بندوں برطانوی سامراج کے خلاف عوام میدان میں اتر آئے تھے اس لیے ولی اللہی جماعت نے اس میدان میں ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ العلماء کے نام سے قدم رکھ دیا اور اپنے پہلے ہی اجلاس میں اپنے انقلابی عزائم کے ماتحت آزادی کامل کی قرارداد پاس کر دی جس منزل تک پہنچنے کے لیے ہماری قومی جماعت کو دس سال لگے۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس لاہور ۱۹۲۱ء میں پانچ سو علماء نے ترک موالات کا فتویٰ جاری کیا جس کے اندر برطانیہ کے جشن صلح میں شرکت سے انکار سرکاری اداروں سے عدم تعاون اور ولایتی مال کا بائیکاٹ شامل تھا ترک موالات کی اس تحریک سے پورے ملک میں جرات و ہمت اور جوش و خروش کا دریا ابل پڑا عوام متحد ہو کر جوق در جوق سول نافرمانی کے لیے سڑکوں بازاروں میں نکل پڑے حکومت بوکھلا اٹھی ہندوستانی سیاست کا یہ موسم فصل بہار کا تھا جہاں حوصلوں و ولولوں کے رنگارنگ پھول کھل رہے اور کلیاں چٹک رہی تھیں اور ملک کے مشام جان کو اتحاد و اتفاق کی خوشبوئیں معطر کر رہی تھیں ہندوستان کی روح مذہبی بیدار ہو تی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کے روح پرور نظارے ملک کے ہر گوشہ میں آنکھوں کی ٹھنڈک بخش رہے تھے اس وقت خلافت، جمعیۃ، کانگریس و مسلم لیگ تمام جماعتیں قدم سے قدم ملا کر منزل مقصود کی طرف بڑھ رہی تھیں برطانوی سامراج کو یہ ملک کا اتحاد ایک آنکھ نہ بھایا اس نے ملک و ملت کی متحدہ صفوں میں ایک شگاف ڈالنے کے لیے شدھی سنگٹھن کو قائم کی جس کے جواب میں تبلیغ اسلام کی

جماعت کھڑی ہو گئی حکومت کے ملأ اعلیٰ سے شردھانندجی کے کانوں میں شدھی کی بات پھونکی گئی اور میاں سر فضل حسین نے حکومت کے مخفی اشارے پر تبلیغ کی تجویز مسلمانوں کے آگے رکھ دی آناً فاناً ملک میں ہندو مسلم فوج در فوج اس میدان میں اتر کر باہم دست و گریباں ہو گئے ایشیائی قوموں کے مذہبی جذبات سے کھیلنا اور ان کو باہم دست و گریباں سامراج کا پرانا محبوب مشغلہ ہے۔

دانایانِ فرنگ نے مشرقی قوموں کے برسوں نفسیاتی مطالعہ سے اس راز کو پالیا تھا کہ وہ مذہبی جذبات و احساسات سے بہت جلد منفعل و مشتعل اور متاثر ہوتے ہیں ان کے مذہبی احساسات کے تاروں کو چھیڑ کر ایک دوسرے سے باآسانی ٹکرایا جاسکتا ہے خصوصاً ایک ایسے ملک میں جو مختلف مذہبوں و رنگارنگ تہذیبوں کا گہوارہ ہو چنانچہ فرنگی سامراج نے اس دکھتی رگ کو پکڑ کر پہلے آزمایا اور کارآزمودہ نسخہ پایا مشرقی قوموں میں دین و مذہب کے نام پر جتنے فتنے اٹھائے گئے اور فسادات کرائے گئے وہ سامراجی تاریخ کا سیاہ باب ہے اور ہر سامراج آج بھی اس نسخہ کو استعمال کرتا ہے مغربی سامراج نے مسلمانوں میں اختلاف ملی کا پرانا فتنہ (شیعہ و سنی) کے ابھارنے کے علاوہ خود اہل سنت کے درمیان وہابی و غیرہ وہابی فتنے کو خوب بھڑکایا جس میں دیوبندی اور بریلی کے نام سے مسلمان ایک دوسرے سے دست گریباں ہوتے رہے بریلی کی طرف سے چھوٹے موٹے الزامات لگا کر علمارِ حق کے دامن تقدس کو داغدار کرنا چاہا اور ان کو تکفیر کا نشانہ بنایا باہمی مناظروں کی گرم بازاری ہوئی جس نے مجادلہ و مقاتلہ کی صورت اختیار کر لی اور خود پھر سامراج ثالث بن کر فیصلہ کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا علاوہ ازیں مسلمانوں کو مستقل طور پر دو فرقوں میں بانٹنے کے لیے پنجاب کی مردم خیز و فتنہ انگیز سرزمین (قادیان) سے ایک مصنوعی اور جعلی اور چھوٹی نبوت کو کھڑا کیا گیا تھوڑے ہی عرصہ میں یہ خود کاشتہ پودا برگ و بار لے آیا اور اس شجر خبیث کی شاخیں ملک محروسہ برطانیہ میں پھیلتی چلی گئیں۔

یہ اور اسی نوع کے صدہا فتنے برطانوی سامراج کے چشم و ابرو کے اشارے پر پیدا کیئے گئے تاکہ سامراج دشمن علمار حق کی توانائیاں سامراج کے خلاف صرف ہونے کے بجائے انھیں فتنوں کی سرکوبی اور آپسی کشاکش میں خرچ ہو جائیں بہرحال شدھی سنگھٹن نے ملک کی خوشگوار فضار کو مسموم کردیا بدقسمتی سے اسی اثنار میں چورا چوری کا پرتشدد حادثہ رونما ہوا گاندھی جی نے اپنی تحریک کو واپس لے کر بڑھتے ہوئے قدموں کو روک دیا جس کے اندر تیس ہزار ہندوستانیوں نے جیلوں کو بھر دیا تھا اس التوار سے نہ صرف تحریک کو سخت دھکا لگا بلکہ آزادی کا وہ قافلہ جو منزل سے ہمکنار ہوا چاہتا تھا۔ ٹھٹک کر رہ گیا اور پھر فرنگی سیاست نے ہندو مسلم سمجھوتہ کے رشتہ میں ایسی گرہیں ڈال دیں کہ ان کا ناخن فکر سے سلجھانا ناممکن ہو گیا کہ ملک کی تقسیم کے بعد بھی یہ سدابہار فتنہ آج تک زندہ ہے اسی کے ساتھ یہ امر بھی مخفی نہ رہے کہ جب بھی ہندوستانیوں نے کوئی فیصلہ کن اقدام کیا اور اس راہ میں تن من کی بازی لگائی تو برطانوی سامراج نے اصلاحات کے نام فریبکاری و مکاری کے جال بچھا دیئے اور اہل ملک کو اصلاحات کے جھولے میں جھلاتی رہی چنانچہ اس موقع پر لارڈ اروِن نے ۱۹۲۲ء میں ایک مبہم اعلان کیا۔

ہندوستان کی آئینی ترقی کا قدرتی نتیجہ نوآبادیات کا اصول ہے یہ اعلان برطانوی شہنشاہیت کی بدنیتی کو پوری طرح واضح کر رہا تھا اس لیے کانگریس نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر کے آزادی کامل کی تجویز پاس کردی اور سول نافرمانی کی تحریک کا بگل بجا دیا چنانچہ اس تحریک سے حکومت کو سوچنے پر مجبور کر دیا مسلمانان سرحد نے اس تحریک میں بارہ ہزار آدمیوں کو جیل میں بھیجا تھا اس لیے تحریک کو دبانے کے لیے حکومت نے اصلاحات کی پانچویں قسط کا اعلان کر دیا جو ۱۹۳۵ء میں نفاذ پذیر ہوئی یہ اصلاحات ہندوستانیوں کے امنگوں کے لحاظ سے کم تھی اس کے لیے

کہ ہندوستانیوں کے مقابلہ میں گورنروں کو بے پناہ اختیارات سے مسلح کردیا تھا اور ان کو ہر طرح بالادستی دیدی گئی تھی اس لیے کانگریس نے ان کو مسترد کردیا جس کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس بلائی گئی اس کانفرنس میں آزادی کے لیے ہندو مسلم سمجھوتہ کی شرط لگاکر پھر سامراج نے کانفرنس کو ناکام کردیا گاندھی جی نے لندن سے واپسی کے بعد جب دوبارہ سول نافرمانی کو بروئے کار لانا پڑا تو بساط کا نقشہ ہی پلٹ چکا تھا لارڈ ویلنگٹن جو نہایت سخت گیر اور کانگریس کے مخالف تھے ۱۹۳۱ء میں والیسرائے بناکر بھیجے گئے انھوں نے قومی تحریک کو اپنی آہنی طاقت سے دبانا چاہا لیکن اس خطرناک ماحول میں بھی کانگریس کا جلسہ اپریل ۳۲ء چاندنی چوک میں منعقد ہوا۔ برطانوی شہنشاہیت کے اصلی عزائم کو جاننے کے لیے مسٹر چرچل کی تقریر پیش ہے جو انھوں نے پارلیمنٹ میں ۳۲ء میں کی تھی یہ تقریر برطانوی سامراج کی حقیقی ڈپلومیسی کی آئینہ دار ہے۔

"وزیر اعظم (مسٹر میکڈانلڈ) نے یہ طے کرلیا ہے کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں گے میرے نزدیک اس میں سخت خطرہ ہے اگر انھوں نے جملہ جماعتوں کو خوش کرنے کی کوشش کی تو وہ کسی کو بھی خوش نہ کرسکیں گے اہل روم کا اصول نفاق ڈالو اور حکومت کرو تھا لیکن ہم نے بالاتفاق طے کرلیا ہے مگر اسی کیساتھ اس اصول کو بھی اختیار نہ کرنا چاہیئے جو اس کے برعکس ہے اور وہ یہ ہے کہ رعایا کو متحد کردیا جائے جس کا نتیجہ سلطنت سے دست کشی ہوگا دراصل یہ ایک بڑا خطرہ اور اندیشہ ہے کہ ہم اس بہت بڑی غلطی میں نہ پڑ جائیں (لیڈر ۳۲ء بحوالہ روشن مستقبل ص ۱۲۰)

غرض ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو مسلم سمجھوتہ کی جو شرط برطانوی حکومت نے سوچ سمجھ کر لگائی تھی اس نے اس رشتہ اتحاد میں مزید ایسی گرہیں ڈال دیں کہ وہ ناقابل حل پیچیدہ مسئلہ بن گیا پھر حکومت نے ۱۹۳۵ء میں

مسلمانوں کو کانگریس کے خلاف لاکر کھڑا کر دیا ابھی ہندوستانی سیاست کامیابی و ناکامی کے مرحلوں سے گذر رہی تھی کہ سامراجی طاقتوں کی باہمی آویزشوں نے پھر دنیا کو تیسری عالمگیر جنگ ۱۹۳۹ء کی بھٹی میں جھونک دیا برطانیہ کا اس جنگ میں بنفس نفیس حصہ لینا اس لیے مشکل نہ تھا کہ اس کو ہندوستان جیسے غریب ملک کے مفت اور سستے رنگ روٹ آسانی سے مل جاتے تھے لہذا پورے ملک میں رنگ روٹوں کے بھرتی کیمپ کھول دیئے گئے کانگریس اور قوم پرور جماعتوں نے اس کی مخالفت کی کہ جب تک ہندوستان کی آزادی کی گارنٹی نہ دی جائے اس وقت تک وہ فوجی بھرتی کی مخالفت کریں گے مگر مسلم لیگ نے لاہور میں تقسیم ہند کی تجویز ۱۹۴۰ء میں پاس کر کے کانگریس کی آزادی کامل کی تجویز کو ضغطہ میں ڈال دیا حکومت برطانیہ اہل ملک کا متفقہ مطالبہ آزادی کو طرح طرح کے حیلوں حوالوں سے ٹالتی چلی آرہی تھی اب لیگ کی بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ سیاست سے اس کو مضبوط سہارا مل گیا کانگریس نے ۱۹۴۲ء میں مجبور ہو کر کوئٹ انڈیا کا تاریخی اعلان کر دیا جو برطانوی سامراج کے لیے ایک دھماکہ بن کر پھوٹا ہر چند مسلم لیگ اس کے آڑے آئی لیکن ہندو مسلم حریت پسندوں نے اس کے اندر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جملہ قومی رہنما گرفتار کر لئے گئے لیکن تحریک عرصہ تک چلتی رہی ہم نے ہندوستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ کو اس لیے ذکر کیا ہے کہ جو کچھ برطانوی ہند میں بڑے پیمانہ پر آزادی کے لیے کوششیں کی جارہی تھیں اس کل کا ایک چھوٹا سا فرد یعنی بھوپال بھی اس پیچھے نہ رہا۔

ریاست میں حقوق طلبی کی جو تحریک ۱۹۳۳ء میں چند افراد سے شروع ہوئی تھی وہ ۱۹۴۲ء تک پہونچتے پہونچتے ایک مضبوط جماعت بن کر آگے بڑھتی رہی چوں کہ ریاستی سیاست میں مسلم عوام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لیے تحریک آگے بڑھتی رہی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی سیاست میں گرمی اسی وقت آئی جب مسلمان جیسی جوشیلی قوم اس میدان

ہیں کو دی سرحد کے جنگجو قوم نے خان عبد الغفار خان کی رہنمائی میں قصہ خوانی بازار میں جب عدم تشدد کا مظاہرہ کیا تو فرنگی سامراج کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی بھوپال ریاست بھی سرحد کے ان پٹھانوں کی یادگار تھی جنھوں نے بھوپال کو اپنا وطن بنایا چنانچہ خدام وطن سے لے کر پرجا منڈل کے رہنماؤں کی اکثریت انھیں پٹھانوں پر مشتمل تھی اگرچہ ریاستی سیاست اور ہندوستانی سیاست کے طریق کار میں تھوڑا بہت فرق رہا لیکن مقاصد کے اشتراک کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں ریاستی سیاست ہندوستانی سیاست کی دست و بازو بن گئی بہر حال جب گاندھی جی نے برطانوی حکومت کی طول طویل گفتگو اور پر پیچ ترکیبوں سے اکتا کر ۱۹۴۲ء میں "کرو یا مرو" کا نعرہ دیا تو پرجا منڈل کے رہنماؤں نے اسی نعرہ کو ببانگ دہل دہرایا اور کوئٹ انڈیا کی تجویز پاس کر دی چنانچہ برطانوی ہند کی طرح پرجا منڈل لیڈروں کی دھڑا دھڑ گرفتاریاں عمل میں آئیں جن کے نام یہ ہیں شاکر علی خاں، پنڈت چتر نرائن مالوی ظہور ہاشمی سعید اللہ خاں رزمی، لطف اللہ خاں نظمی، بندرابن داس گوبند پرشاد نشاط و الطاف یزدانی جن کو مختلف دفعات کے تحت سزائیں دی گئیں۔

آزادی سے پہلے کی ہندوستانی سیاست

جیسا کہ ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ دنیا خیر و شر حق و باطل اور نیک و بد کا گہوارہ ہے خدا اپنی حکمت بالغہ سے ظلمت میں سے نور خزاں میں سے بہار اور شر سے خیر بھی پیدا کرتا رہتا ہے چنانچہ انسانوں کی باہمی جنگ و جدال لڑائی بھڑائی شر و بدی کی حامل ہے لیکن خدا اس شر میں سے خیر کی صورت پیدا فرماتا ہے اگر قوموں میں حرب و ضرب ایک دوسرے سے جنگ و جدل کا میدان گرم نہ ہوتا تو غالب اقوام خود کو دنیا کا ٹھیکیدار سمجھ کر کمزور قوموں کو صفحہ ہستی

سے نیست و نابود کرڈالتیں یا غلامی کی شکنجہ میں کس کر جانوروں کی سی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیتی جب بھی طاقتوروں کو ایسا موقع ملا ہے وہ ایسا کر گزرتے ہیں اس صورت میں نہ مذاہب وملل آزاد رہ سکتے اور نہ قوموں کی تہذیب وتمدن کو آزادانہ فضاؤں میں نشوونما پانے کا موقع نصیب ہوتا کلیت پسند حکومتوں کی طرح سب کو ایک ہی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتے اور دنیا کا باغ جو گلہائے رنگارنگ کا چمن ہے وہ اس یک رنگی سے بے رونق ہو جاتا اس لیے جنگ یا لڑائی جہاں انسانیت کے لیے بڑا عذاب ولعنت ہے وہیں خدا کی طرف سے اس کے اندر خیر ورحمت کا پہلو ہے کہ اس کے ذریعہ خدا کمزوروں کو اوپر اٹھاتا اور طاقتوروں کو نیچے گراتا ہے اور ہر قوم کو اس امتحانی میں نیک عملی وبد عملی کی زندگی گذارنے کا پورا پورا موقع فراہم کرتا ہے چنانچہ دنیا کی ہر جنگ میں قوموں کے عروج وزوال کا تماشہ نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے۔

مغرب کے شیطانی سامراج نے پچھلی نصف صدی میں عالم انسانیت کو دو ایسی مہیب وخوفناک اور لرزہ براندام کرنے والی جنگوں کی بھٹی میں جھونک دیا کہ جس کی نظیر سے تاریخ عالم خالی تھی۔ مہلک وقاتل ہتھیاروں، انسانیت کش اسلحوں سے شہروں کی تباہی نہیں ملکوں کی بربادی لاکھوں انسانوں کی ہلاکت سامانی کے خونیں نظارے آنکھوں کے سامنے ہیں اس کے زخموں سے ابھی تک عالم انسانی کراہ رہا ہے چنانچہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے ترکی وجرمنی کے عالمی سیاست کو ختم کرکے برطانیہ وفرانس کو دنیا کا چودھری بنا دیا لیکن ۳۹ء کی عالمگیر جنگ نے چودھراہٹ کے اس تاج کو ان کے سر سے اتار کر امریکہ وروس کے سر پر رکھدیا برطانیہ نے اس فتح کو چرچل کے الفاظ میں ہزاروں انسانوں کی خون کی دھاروں اور خون کی آنسوؤں سے حاصل کیا تھا لیکن برطانوی شہنشاہیت کے لیے یہ فتح عظیم شکست کی تمہید بن کر آئی برطانیہ وفرانس کی نو آبادیاتی اقتدار کا خیمہ لڑکھڑا کر گر گیا ان کی فرعونی گردن جنگی اخراجات کے تلے دب کر رہ گئی۔

سامراجی عزائم کے دست و بازو شل ہو گئے برطانوی حکومت کو اپنا نوآبادیاتی نظام کا ڈھانچہ قائم کرنا محال نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا اس لیے فرنگی سامراج نے اپنی روایتی مکاری و عیاری کو بروئے کار لا کر اپنی پرانی ڈپلومیسی کے طریقہ پر ملکوں کو تقسیم در تقسیم کی تلوار سے پارہ پارہ کر دیا اور ان ملکوں کے باشندوں کے درمیان مستقل جنگ کی بنیاد رکھ دی برطانوی سامراج کو اپنے اندرونی حالات اور بین الاقوامی دباؤ کی بناء پر ان ملکوں کو آزاد کرنے پر مجبور ہونا پڑا انیوی (بحریہ) کی بغاوت سے اپنے پاؤں کے نیچے زمین سرکتی نظر آئی اس خونی انقلاب کی بو سونگھ لی جو ہندوستان کو برطانیہ کا ہمیشہ دشمن بنا دیتی لیکن برطانوی سامراج چلتے چلتے بھی اپنی کرنی سے باز نہ آیا۔ "دکھاؤ نہیں توڑ ھاکاؤ" کی ضرب المثل کے مطابق آزادی کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں اور ایسا طریقہ اختیار کیا کہ آزادی کے سورج کے طلوع ہونے پر مسرت و خوشی کی روشن شعاعیں پھیکی پڑ گئیں خون کی بہتی ہوئی ندیوں، لاکھوں انسانوں کی بے گور و کفن لاشوں کے جلو میں ہندوستان اس طرح آزاد ہوا کہ ہر طرف تباہیاں و بربادیاں منہ کھولے کھڑی تھیں ہمارے نزدیک برطانیہ نے ہندوستان کو اس وقت آزاد کیا جب کہ وہ ہندوستانیوں کے مخصوص طبقہ کو ذہنی طور پر غلام بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس نے محسوس کر لیا تھا کہ مغربی تہذیب کے سایہ میں پروردہ یہ غلام آزادی کے بھی مغربی سیاست کے خطوط پر ان ملکوں کو چلائیں گے نظام حکومت میں یورپ کو اپنا قائد و رہنما بنائیں گے مشرقی اقوام کی مذہبی و اخلاقی و روحانی اقدار کو دریا برد کر دیں گے۔

چنانچہ بہت سے ملکوں میں ایسا ہی ہوا آزادی کے مسئلہ میں برطانیہ نے مختلف پیچیدگیاں پیدا کر کے اپنے اقتدار کی مدت کو دراز کرنا چاہا لیکن بین الاقوامی احوال اور قوموں کی امنگوں کے آگے اس کو جھکنا پڑا با دلِ نخواستہ آزادی بصورت بربادی ملک کو تقسیم کر کے ہمارے سروں کو تھوپ دیا۔

اگر کہا جائے کہ مسلمانوں کے مطالبے ملک کو تقسیم کا زخم چکھنا پڑا تو اس کا جواب یہ ہے کہ فلسطین کے تقسیم کا کن مسلمانوں نے مطالبہ کیا تھا شام و لبنان و دیگر اسلامی ممالک کو (جو ترکی خلافت کے ماتحت متحد ہوکر رہ رہے تھے) ان کو کس نے تقسیم کرایا بہر حال ہندوستان کی تقسیم فرنگی سامراج کا ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا جب پورے ملک کی سیاست فرنگی ڈپلومیسی کی گرداب میں پھنسی ہوئی تھی تو ریاستی سیاست کے دریا میں روانی کہاں سے آتی اس وقت پرجامنڈل ایک غیر یقینی ماحول اور مذبذب حالات سے گذر رہی وہ حالات کو دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر چل رہی تھی البتہ شاکر صاحب مزدوروں میں کام کرتے رہے اور مختلف یونینوں کے بنانے میں سرگرم رہے۔

جنگ کے بعد ہوشربا گرانی اور کساد بازاری نے ہندوستانی عوام کی زندگی کو اجیرن کر دیا تھا اور بڑھتی ہوئی مہنگائی نے پورے ملک کو ہلا ڈالا ریاست بھوپال جو ایک غریب ریاست وہ سب سے زیادہ متاثر ہوئی اس لیے خودنمائی کا شائبہ نہ ہوتا تو راقم الحروف اس کا ذکر کرتا کہ اس فقیر نے اگرچہ سیاست میں براہ راست قدم نہیں رکھا لیکن بالواسطہ بھوپال ٹیچرس ایسوسی ایشن اور پھر ریاست کے جملہ ملازمان کے تعاون سے فیڈرل یونین کے ذریعہ سب سے پہلے ریاست میں پرامن ملازمانی تحریک چلائی سلیمان آرزو اس کے سکریٹری تھے اس تحریک سے ملازمین میں ہماہمی و سرگرمی اور عوام میں اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوئی شہر د اضلاع میں جلسہ کیے گئے یوم دعا منایا گیا کیوں کہ سبھی باشندے اس گرانی کی لپیٹ میں آگئے تھے اس لیے ان کی ہمدردیوں کی وجہ سے یہ جلسے عوامی بن گئے اگرچہ اس تحریک سے خاطر خواہ نتیجہ تو نہ نکلا لیکن کچھ نہ کچھ کامیابی ضرور حاصل ہوئی اس وقت کس کو معلوم تھا کہ گرانی و مہنگائی کا یہ پتلا سانپ سامراج کی اقتصادیات کی کینچلی بدل کر اژدہا بن کر سارے عالم کو اپنے لپیٹ میں لے لیگا اسی طرح

راقم الحروف اور اس کے ساتھیوں نے دوسرے ادبی محاذ (انجمن ترقی پسند مصنفین) کے ذریعہ (جو اس وقت تک ہر مکتبہ خیال کے ادیبوں کی جماعت تھی) اور جس کی بنیاد ہمارے ساتھیوں نے سب سے پہلے ڈالی تھی) اس انجمن کے ذریعہ سیاسی رہنماؤں کی اہم تائید کرتے رہے اور اپنی تجویزوں سے پرجا منڈل کو تقویت بخشی جس کا اعتراف بارہا شاکر صاحب بر ملا مجلسوں میں کیا بہر حال جو کچھ بھی کیا تھا وہ ایک فریضہ کی ادائیگی کے لیے تھا جس کے اندر نہ عہدوں کی طلب تھی نہ نام و نمود کی خواہش جب وہ انجمن ایک مکتبہ فکر کی جاگیر بن گئی تو ہمارے ساتھیوں نے بغاوت کی اس اجمال کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔

بھوپال میں چیف کمشنری راج

جب حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی غلامی کی مدت کو دراز کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے اور وہ ناکارہ ثابت ہوئے تو آخر میں متحدہ ہندوستان کے شجر عظیم کو تقسیم کی کلہاڑی سے کاٹ کر دو حصوں میں بانٹ دیا پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی ایک اندھیری رات مژدۂ سحر لے کر آئی ہندوستان و پاکستان دو آزاد حکومتیں دنیا کے نقشہ پر ابھر آئیں ایک طرف خوشیوں و مسرتوں کے شادیانے بج رہے تھے تو دوسری طرف لاکھوں انسانوں کے قافلے بیکسی و بے سروسامانی کی حالت میں صدیوں کے وطنی مقامات کو چھوڑ کر ماتم کناں اِدھر اُدھر منتقل ہو رہے تھے ان لاکھوں انسانوں کو خون کے دریاؤں سے گذرنا پڑا جس خون ناحق کا وبال یقیناً برطانوی سامراج کی گردن پر ہے۔
بہر حال قہقہوں اور آنسوؤں کے درمیان ہمارے ملک کے افق پر آزادی کا سورج طلوع ہوا اس پر مسرت واقعہ مگر غمگین صورت حال نے سیاسی باشندوں کو سراسیمہ حیران و پریشان کر دیا تھا۔
اگرچہ صدیوں کی غلامی سے آزادی کی مسرت کی چمک ہر ایک چہرے سے

جھلک رہی تھی مگر کرب و الم وغم کے خطوط بھی ہر ایک کی پیشانی پر نمایاں تھے کیونکہ
اس حسرت کدہ عالم میں نہ کوئی مسرت خالص ہے اور نہ کوئی غم خالص اس
چمنستانِ دہر میں جہاں پھول ہیں وہاں کانٹے بھی جہاں بہار کی جلوہ آرائی
ہے وہیں خزاں کی وحشت سامانی بھی اہل بھوپال نے مسرت وغم کے ان ملے جلے
جذبات کے ساتھ آزادی کا خیر مقدم کیا شاطر برطانیہ نے ملک کو دو حصوں میں
تقسیم ہونے کا اعلان تو کر دیا لیکن ان ساڑھے چھ سو ۶۵۰ ریاستوں کا کیا ہوگا اور ان
رئیسوں، راجاؤں، کا حشر کیا ہوگا جو تاج برطانیہ کے ازلی وفادار و جاں نثار
رہتے ہوئے ہر آڑے وقت میں کام آتے اور ہمیشہ اس کے گن گاتے رہتے تھے
فرنگی سامراج نے اپنی روایتی بے وفائی و غداری سے کام لے کر ان کو بے یار و مددگار
و تنہا چھوڑ دیا۔

اس پر آشوب پر خطر دور کے ایک اہم واقعہ کا اظہار ضروری ہے جب کہ
۱۹۴۶-۴۷ء میں خونی فسادات کا سیلاب امنڈ آیا تھا اور جب کہ جنون و دیوانگی
کا پورے ملک پر دور دورہ تھا مار کاٹ جاری اور خوف دہشت کا ماحول
طاری تھا ارد گرد کے مسلمان اپنے صدیوں کے ٹھکانوں کو چھوڑ کر بھوپال
پہونچنے لگے اس وقت ہندو مسلم بھائیوں نے مل جل کر بھوپال کی قدیم روایاتی
اتحاد کے مطابق سب کو گلے لگایا ان کے کھانے پینے کے لیے در در گھر گھر پہونچ کر
روٹیاں فراہم کرنے اور ان کے ٹھہرانے کے انتظام میں لگے ہوتے تھے نوابصاحب
بھوپال نے بھی بڑی فیاضی و رواداری و فراخ دلی کے ساتھ ان کے ٹھہرنے
کھانے پینے کا انتظام کیا بیراگڈھ کیمپ ان کے لیے کھول دیا گیا ان کی پریشانی
و خستہ حالی دور کرنے کی تدبیریں اختیار کیں نفرت و بربریت کے ان
اندھیریوں میں ریاست بھوپال الفت و محبت کی مینار روشنی بن کر چمکی خدا کی
مخلوق کے ساتھ بلا تفریق مذہب و ملت کے یہ درخشاں نظارے نگاہوں کو
روشن اور دلوں کو سکون بخش رہے تھے بھوپال کے درد مند افراد کمر بانده کر

ہر باہر کے آنے والے لوگوں کا خیر مقدم کرتے تسلی و دلاسا دیتے خیموں میں ٹھہراتے اور پھر کیمپ میں لے جاتے تھے شاکر صاحب و قاسم میاں وغیرہ اس کے اندر پیش پیش تھے راقم السطور بھی ان مہاجرین کے درمیان ہر جمعہ کو واعظ کی حیثیت سے اصلاح و دل جوئی کا فرض انجام دیتا تھا نواب صاحب بھوپال نے ایوان رؤسا کے صدر کی حیثیت سے ریاستوں کی خود مختاری کا ایک پلان رکھا تھا لیکن وہ سیاست کی ہواؤں میں اڑ گیا آزادی سے پہلے برطانوی حکومت نے انٹریم گورنمنٹ (عبوری حکومت) بنا کر ملک کی مختلف جماعتوں پر مشتمل کابینہ بنائی تھی، جو باہمی معرکہ آرائی کا شکار ہوئی نواب صاحب بھوپال کے سیاسی دماغ نے مرکزی نقشہ کے مطابق عارضی حکومت قائم کر دی جو سعید اللہ خان رزمی (کانگریس ملک راج) (پولوٹیکل لیگ) مظفر علی خان (مسلم لیگ) کے نمائندوں پر مشتمل تھی اس وزارت نے سال بھر کے قریب کام چلایا۔ پرجا منڈل جو عوامی نمائندہ جماعت تھی اس کو وزارت سے علاحدہ رکھا گیا اس لیے اس نے کانگریس ہائی کمان سے مشورہ کیا اور قدوس صہبائی کے ذریعہ نواب صاحب کو راست اقدام کی دھمکی دی چونکہ مرکز میں اب کانگریس برسر اقتدار آچکی تھی اور پرجا منڈل اسی کی شاخ تھی اسی لیے نواب صاحب نے پہلی وزارت کو توڑ کر پرجا منڈل کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ دوڑ دیدی چتر نرائن مالوی وزیر اعلیٰ ظہور ہاشمی، کامتا پرشاد اور محمود حسین اس کے وزیر تھے پرجا منڈل بھوپال کی آزادی پسندوں کی پرانی جماعت تھی۔ جو اس راہ میں قربانیاں دیتی چلی آرہی تھی ایک مشترک مقصد نے اس کے ارکان کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا تھا اس لیے وہ کاندھے سے کاندھا ملا کر منزل کی طرف گامزن رہی جو کچھ اختلاف ابھرتے وہ جمہوریت کے اصول پر دور کر لیے جاتے تھے لیکن اب ایک نیا مرحلہ درپیش آیا پرجا منڈل کے رہنماؤں نے اپنی تحریک کا جو پودا لگایا اور اس کو خون پسینہ سے سینچا تھا وہ ثمردار درخت بن گیا اب اس درخت سے حکومت و وزارت کے پھل ٹپکنے لگے

اس لیے اس منزل پر پہونچ کر ہر کارکن اس پھل سے نفع اندوز ہونا چاہتا تھا اقتدار واختیارات حکومت وسلطنت کی کرسی پر پہونچنے کے لیے باہمی کشمکش ارباب سیاست کا ہمیشہ وطیرہ رہا ہے جو جماعتوں کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے بہر حال یہ عوامی وزارت ان پرشور حالات میں پوری طرح قدم نہ جمانے پائے تھے کہ اس کے خلاف انضمام (مرجر) کی تحریک اسی کانگریس کی طرف سے اٹھ کھڑی ہوئی جس نے وزارت بنانے کا مشورہ دیا تھا وزارت کے مخالف گروپ نے جن کو وزارت یا عہدوں کی توقعات وابستہ تھیں جب وہ پوری نہ ہوسکیں تو انھوں نے باہر کے شورش پسندوں سے ساز باز کر لیا جو ریاست کے وحدت کو فوراً تحلیل کر کے قریبی صوبے میں ضم کرنا چاہتے تھے قصبہ بریلی کے فرقہ پرستوں نے باہر کے لوگوں کی شہ پر اس کا بیڑا لگایا اور وہاں کے سیٹھ ساہوکار اس کی پشت پر امداد کے لیے کھڑے ہوگئے چنانچہ ایک ہی فرقہ کے لوگوں کے ذریعہ یہ تحریک شروع کرادی گئی کانگریس ہائی کمان کے مشورے سے جو ذمہ دار حکومت بنی تھی جب صورتِ حال کی طرف توجہ دلائی گئی تو ہائی کمان نے آنکھیں چرالیں اور بعد میں خدا جانے کن اسباب کے ماتحت اس تحریک کو قومی تحریک مان لیا گیا بہر حال پرجا منڈل کے رہنماؤں کے لیے یہ عجب کشمکش کا دور تھا کہ عمر بھر جس مقصد کے لیے پاپڑ بیلتے رہے اور جس منزل تک پہونچنے کے لیے قدم بڑھاتے رہے جب اس بام بلند تک پہونچنے کے لیے دو چار سیڑھیاں رہ گئیں تو وہ کمند ہی ٹوٹ کر رہ گئی کانگریس ہائی کمان نے پرجا منڈل کو اس لڑکھڑاتے ہوئے حالات میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا اور اپنا ہاتھ اس کے سر پر سے اٹھا لیا۔

اس سے بھی بڑھ کر اس وزارت پر یہ قیامت ٹوٹی کہ شاکر علی خاں جو پرجا منڈل کے بانیوں میں سے تھے پارٹی سے استعفا دیدیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خزاں رسیدہ اوراق یا پت جھڑ کے پتوں کی طرح اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

آٹھ نو ماہ کے یہ وزراء گھروں میں مستعفی ہو کر بیٹھ گئے جب پرجا منڈل کی وزارت کا اس طرح ڈرامہ ڈراپ سین ہوا تو ریاستی سیاست کی سطح پر ڈاکٹر شنکر دیال یکایک نمودار ہوئے اور اپنی حکمت عملی اور جوڑ توڑ کی سیاست سے جلد کامیابی حاصل کرلی

بھوپال کی اس سیاسی تحریک بلکہ قوم پرور مسلمانوں کی قوم پرور تحریکات کا زبردست المیہ یہ ہے کہ مسلم رہنما اور وہ مسلمان عوام جنھوں نے فرنگی سامراج کی غلامی سے آزادی کے لیے اور اپنی مذہبی آزادی کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائی تھی اور جن میں سے بہت سے نوجوان جو اس سلسلہ میں وطن سے ایسے بے وطن ہوئے کہ پھر ان کو دوبارہ وطن آنا نصیب نہ ہو سکا بہت سے وہ تھے کہ جو اپنی اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کو ٹھکرا کر اس میدان میں کود ے اور اپنے روشن مستقبل کو تاریک بنا لیا وہ بھی تھے جنھوں نے اپنی جائیداد و جاگیر کو لات مار کر فاقہ کشی اور بھکمری کے شکار ہوئے غرض اس راہ کی کون سی قربانی تھی جس سے وہ نہ گذرے ہوں لیکن اپنے لگائے ہوئے باغ کے پھل کھانے سے محروم رہے یہ قصہ صرف بھوپال کا نہیں بلکہ ہندوستانی مسلم رہنماؤں کا عمومی حال ہے مولانا برکت اللہ بھوپالی۔ مولانا عبیداللہ سندھی مولانا منصور انصاری خان عبدالغفار خاں اور بھوپال کے شیر دل رہنما شاکر علی خاں اور اسی قسم کے سیکڑوں گمنام مجاہدین آزادی ہیں جو نہ تاریخ کے عنوان بن سکے اور نہ ہماری قومی تاریخ میں اپنے صفحات میں ان کو جگہ دی ان گمنام مجاہدین کے حصہ میں آزادی کی راہ میں صعوبتیں۔ مصیبتیں۔ مشکلات و دشواریاں غرض ہر طرح کی قربانیاں ہی ان کے حصہ میں آئیں اس راستہ کے کانٹوں کا ہٹانا ان کی زندگی کا حاصل رہا پھولوں کا چننا اور اس کے پھل کھانا انھوں نے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا ملک کے چمن میں ان کی قربانیوں کے نغموں کی گونج ہے مگر بقول میر ؎

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

جمیعتہ علمائے بھوپال کا ۴۹ء میں قیام

جون ۴۹ء میں نواب صاحب بھوپال نے ریاست کو ایک معاہدہ کے ماتحت انڈین یونین میں ضم کر دیا اور چیف کمشنری راج قائم ہو گیا بھوپال کی زمین پر چیف کمشنری راج بم کی طرح پھوٹا جس کے ایک دھماکے میں نقشہ ہی بدل گیا نہ پچھلی ریاست رہی نہ پرانی سیاست نہ قدیمی ماحول رہا نہ سابقہ فضا تیزی کے ساتھ جاری شدہ نئے نئے احکام نے پچھلے دور کے بنے بنائے نقشوں کو یکسر بدل ڈالا تخفیف کی کلہاڑی نے پرانے ملازمین کے جنگل کا صفایا کر کے میدان صاف کر دیا باہر سے نئی پلٹنیں اتار دی گئیں ان بیرونی حکام نے خود کو فاتح تصور کیا اور بھوپال کی رعایا کو مفتوح گردان کر ان کے ساتھ ویسا برتاؤ شروع کر دیا دل ٹوٹ گئے ہمتیں پست ہو گئیں آزادی کا جو کچھ خواب دیکھا تھا وہ چکنا چور ہو کر رہ گیا سیاسی رہنماؤں نے آزادی کے بعد دودھ کی نہریں بہنے گھی کے چراغ جلانے کے جو خواب دکھائے تھے وہ حقیقت کی دنیا میں سراب ثابت ہوئے غرض انقلاب زندہ باد کی ایک نئی تفسیر سامنے آئی بنرجی پہلا چیف کمشنر ایک پرانا، آئی، سی، ایس تھا جس نے آہستہ آہستہ تبدیلیاں لانے کا عملی نظام بنایا لیکن اس کے جانشین وشوانا تھن نے آتے ہی افراتفری مچا دی۔ زبانوں پر مہر لگا دی گئی اور قلم چلتے چلتے رک گئے آزادی پسند بڑے بڑے سورما چپ سادھ کر بیٹھ گئے البتہ شیر بھوپال خان شاکر علی خان نے اس نئے راج کے خلاف سخت تقریر کر ڈالی وارنٹ جاری ہوا اور انھوں نے بھوپال سے رخت سفر باندھ لینے میں ہی خیریت سمجھی اور دارالسلطنت دہلی پہونچ کر جمیعتہ علمائے ہند کے ساتھ خدمت خلق کے نئے میدان دمنو یہ عورتوں

کی بازیابی کی مہم، میں حصہ لیا۔

اس وقت جب نوابی حکومت کی بساط لپٹی جا چکی تھی اور چیف کمشنری راج نے پرانے نظام کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا جس کا زیادہ تر نزلہ عضوِ ضعیف (مسلمانوں) پر پڑ رہا تھا کیوں کہ ان کی بڑی تعداد ادنیٰ اور درمیانی درجوں کی ملازمتوں میں مست و مگن رہ کر تجارت و صنعت و حرفت سے کوسوں دور جا پڑی تھی۔ تخفیف کے دھچکے سے ان کا معاشی ڈھانچہ دھڑام سے گر کر رہ گیا ایک طرف اس بیکاری و بے روزگاری کی بھنور میں پھنس کر کچھ لوگ پریشاں حالی میں پاکستان بھاگ نکلے لیکن زیادہ تر لوگ تلاش و معاش میں سرگرداں ہو کر تجارت و صنعت کی طرف مائل ہوئے ایک طرف مسلمانوں میں بے روزگاری کا یہ طوفان امنڈ پڑا تھا دوسری طرف کسٹوڈین کی جو شاخ بھوپال میں قائم ہوئی اس نے اندھادھند مسلم جائیدادوں کی ضبطیاں شروع کر دیں پرانے باشندوں کے مکانوں پر قبضہ کر کے اندھیر مچا دی اس بے بسی اور پریشان حالی کے ماحول میں راقم الحروف نے اپنے استاد مولانا عبدالرشید مسکین کی صدارت میں اپنے مخلص ساتھیوں کے تعاون سے جمعیتہ العلماء کی داغ بیل ڈالی۔
شہر کے سیاسی رہنماؤں اور مخلص بزرگوں نے اس تنظیم میں جس قدر تعاون دیا وہ حد بیان سے باہر ہے۔ بہر حال جمعیتہ کی طرف سے محلے محلے جلسے کیے گئے، مسلمانان بھوپال کی دل جوئی و تسلی دلائی گئی احساس کمتری کو دور کیا گیا تجارت و صنعت کے ذریعہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی دوسری طرف کسٹوڈین نے جو اندھیر مچا رکھی تھی شہر کے معززین کو دعوت دے کر ایک مجلس عمل بنائی گئی اس وقت جو کچھ تھوڑا بہت کیا جا سکتا تھا اس فقیر نے اس فرض کو انجام دیا شہر کے سیاسی و سماجی مسلم کارکنوں کو اس رشتہ سے جوڑا اس

تنظیم کی دعوت پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مجاہد ملت
حضرت مولانا حفظ الرحمنؒ بھوپال تشریف لائے ان بزرگوں کی تقریروں سے
دماغوں میں جو دھند چھائی ہوئی تھی دور ہوئی اور جو ذہنی انتشار اور عملی
خلفشار پھیلا ہوا تھا وہ ایک حد تک کافور ہوا پھر جب راقم کچھ عرصہ کے لیے
باہر چلا گیا تو مولانا خالد میاں انصاری، صدر اور شرقی عثمانی نے سکریٹری کی
حیثیت سے اس ذمہ داری کو سنبھالا باہر کی واپسی پر مولانا صدر الدین اور اس
حقیر نے جماعتی نظام کو مضبوط و مستحکم بنایا اور نئے صوبوں مدھیہ بھارت، مہاکوشل
اور وندھیہ پردیش کی جمعیتوں سے رشتہ اتحاد قائم کیا اس دور میں مسلم ممالک
کے بے شمار مسائل فلسطینی قضیہ الجزائر کی آزادی کا قصہ، مراکش کا واقعہ تے
پورے ملک میں ہلچل پیدا کر رکھی تھی۔ اس فقیر نے یہاں کی سیاسی جماعتوں کو فرقہ پرستوں کے علاوہ
سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور ان کی آزادی و استقلال کی تجویزیں
متفقہ طور پر منظور کرا کے بھیجیں۔ اس دوران میں ہندو مسلم فساد کی ہلکی لہریں
بھوپال کے امن پرور ساحل سے ٹکرانے لگیں ان کو روکنے اور مظلوموں کی
امداد کرنے میں جمعیۃ نے اپنا رول ادا کیا۔ پھر جب بھوپال ایم پی کی راجدھانی
بن گیا تو صوبائی جمعیۃ کا مرکز بھوپال ہی قرار پایا اور ایک عرصہ سے مفتی عبد الرزاق
خان صاحب اس نظام کو چلا رہے ہیں اور جمعیۃ اپنے اغراض و مقاصد کے
ماتحت مسلمانوں کی خدمت میں مصروف ہے غرض وقت کا قافلہ آہستہ رفتار
دریا کی طرح گذرتا رہا۔ پچھلے زخم بھرتے چلے گئے پریشان حال مسلم عوام
جد و جہد کے میدان میں کود پڑے زندگی نے اپنی بقا کے ساز و سامان
مہیا کیے ہر شخص نئے حالات کے سانچے میں خود ڈھالنے میں لگ گیا آخری
کمشنر بھگوان سہائے نے اپنی رواداری اور غریب پروری سے پچھلی سخت گیری
کی تلافی کر کے عوام کو راحت پہونچائی اور بہت سی سہولتیں فراہم کیں پھر
مرکزی حکومت نے ریاستوں کو تقسیم کر کے ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی

احکام جاری کئے چنانچہ بھوپال پارٹ سی کی ریاست ٹھہری اور عوامی انتخابات میں کانگریس کامیاب ہوئی بھوپال کے پرانے لیڈر ماسٹر لال سنگھ کے سر پر وزارت کا تاج رکھا جاتا لیکن وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور مسٹر شنکر دیال شرما جو اپنے جوڑ توڑ اور عوام کے ساتھ رکھ رکھاؤ میں ماہر اور بھوپال کے اعلیٰ تعلیم یافتہ فرد تھے ان کے حصہ میں وزارت ۱۹۵۴ء میں آئی طرزی مشرقی جو شاکر علیخان کو شکست دیکر کامیاب ہوئے اور بابو کامتا پرشاد سیہور وزارت میں لیے گئے بہرحال چیف کمشنری راج سے بھوپال کو نجات ملی تو دماغوں کا بوجھ اتر گیا اور عوامی وزارت بننے سے مایوسیوں کے اندھیروں سے امید کی صبح نمودار ہوئی شاکر علی خاں دہلی سے واپس لوٹے تو انھوں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نئی راہ پارٹی بنائی بال کرشن گیتا گووند بابو متھرا پرشاد۔ اکشے کمار موہنی دیوی اس پارٹی کے ارکان تھے نئی راہ نے کچھ عرصہ بعد کروٹ بدل کر کمیونسٹ پارٹی کا جامہ پہنا اور شاکر صاحب مزدور لیڈر کی روپ میں بھوپال کی سیاسی سطح پر نمایاں ہوتے جب کانگریس میں نیا خون دوڑایا گیا تو بھوپال کے پرانے کانگریسی پیچھے ڈھکیل دیئے گئے اور نئے نئے چہرے سامنے آتے گئے جو ڈاکٹر صاحب کی عصری سیاست کی مشاقی کی دلیل ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے دور حکومت میں بھوپال کو اونچا اٹھانے میں زبردست حصہ لیا اتچ۔ ای۔ ایل ایشیا میں بجلی کا عظیم کارخانہ ان کے دور کی یادگار ہے پرانے بھوپال نے نئے صنعتی اداروں کی شکل میں ایک نئے بھوپال کو جنم دیا۔

نیا بھوپال ایک جدید ترقی یافتہ شہر اور پرانا بھوپال آثار قدیمہ کی یادگار کے طور پر بدستور سابق قائم ہے اب ہم اس فصل کو ایم عرفان کی ایک تحریر پر ختم کرتے ہیں جس کے اندر انھوں نے بھوپال کی تحریک آزادی کے تدریجی ارتقاء

کا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

جب بھوپال میں جذبۂ حریت معدوم تھا	تو فاضل محمد خاں، عارف شاہ، مہاپیر ولی شاہ اور مولا ۱۸۵۷ء میں اپنا سر دیکر اس کو وجود میں لائے۔
وہ نیم جاں تھا	سنہ ۱۸۸۰ء میں نواب صدیق الحسن خاں نے اس کے اندر روح پھونکی۔
بے عمل تھا	سنہ ۱۹۱۰ء میں مولانا برکت اللہ بھوپالی نے عمل سکھایا۔
خیالوں کی بستی میں تھا	سنہ ۱۹۲۲ء میں قیصر خان نے اس کو ہوشیار کیا۔
حسین خواب دیکھ رہا تھا	سنہ ۱۹۲۶ء میں سید عبدالکریم عرف بابو میاں نے بیدار کیا
ابھی کمسن تھا	سنہ ۱۹۲۹ء میں سید حامد رضوی نے چلنا سکھایا۔
کم ہمت تھا	سنہ ۱۹۳۴ء میں سعید اللہ خاں رزمی نے ہمت و جراءت پیدا کی۔
عالم انتشار میں تھا	سنہ ۱۹۳۹ء میں شاکر علی خاں نے منتحکم کیا

(شعلہ حیات یکم ستمبر سنہ ۱۹۶۲ء)

بھوپال ایم۔پی۔ کی راجدھانی

جب مرکزی حکومت نے صوبوں کی جدید تشکیل کی تو وسطانی صوبہ (یعنی مدھیہ پردیش) پچھلے اکائیوں (مہاکوشل، مالوہ، ونادھیہ پردیش اور بھوپال) کو جوڑ کر ملکی سطح پر ابھر آیا یہ صوبہ رقبہ کی وسعت کے لحاظ سے ملک

کا سب سے بڑا صوبہ ہے اگرچہ یو.پی. آبادی وغیرہ میں اس سے بڑھا ہوا ہے اس صوبہ کی جدید تشکیل کے بعد سب سے اہم مسئلہ راجدھانی کا تھا جس کے اندر مہا کوشل اور مدھیہ بھارت کے لوگ اپنے اپنے علاقے کے شہروں (اندور گوالیار اور جبلپور) کو راجدھانی بنانے پر زور دے رہے تھے جو اپنی شہریت و آبادی اور صنعتی ترقیات کے لحاظ سے راجدھانی بننے کا حق بھی رکھتے تھے ان کے مقابلہ میں شہر بھوپال ایک پسہ قدیمی شہر تھا لیکن جس طرح پورے ملک میں مدھیہ پردیش قلب کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے مدھیہ پردیش کا دل بھوپال ہی ہونا چاہیئے تھا. چنانچہ بھوپال راجدھانی بناؤ کمیٹی نے اپنے ٹھوس و مضبوط دلائل سے اپنے مقدمے کو مرکز میں پیش کیا اس سلسلہ کے خصوصی ارکان ڈاکٹر شنکر دیال، شاکر علیخان ظہور ہاشمی اور خود نواب صاحب بھوپال بھی تھے اس صوبہ کے پہلے وزیر اعلیٰ روی شنکر شکلا ہوئے لیکن وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئے اور ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو نے اس کی باگ دوڑ سنبھالی ان کا وزارتی دور افراتفری کا دور رہا ان کے ہی دور میں ساگر، جبلپور میں رسوائے عالم فسادات ہوئے جس پر پنڈت نہرو کے کہنے کے مطابق ملک کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا افسوس ہے کہ ۳۵ برس گذر جانے کے بعد بھی ان فسادات کی وجہ سے ہمارا سر جھکا ہوا ہے پھر بھگت راؤ منڈلوئی نے وزارت بنائی جس سے بہت کچھ توقعات تھیں لیکن کامراج پلان کے نفاذ نے ان امیدوں پر پانی پھیر دیا اس عرصہ میں حزب مخالف کی وزارت گووند نرائن سنگھ نے قائم کی جس کو استحکام حاصل نہ ہو سکا اس کے بعد شیاما چرن شکلا نے اپنے اقتدار کا سکہ جمایا اس عرصہ میں اندرا مخالف لہر چلی اور پورے ملک میں غیر کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں چنانچہ اولاً کیلاش جوشی اور ادر پھر ویریندر کمار سکلیچا کی وزارت بنی جو کچھ عرصہ کے بعد تحلیل ہو گئی اور سنہ ۱۹۸۰ء کے انتخاب میں دوبارہ کانگریس کامیاب ہوئی اور ٹھاکر ارجن سنگھ نے ۹ جون ۸۰ء کو زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ درمیان میں پرکاش چندر سیٹھی کی وزارت قائم ہوئی تھی،

ان کا پنجسالہ دورِ حکومت صوبہ کی ترقیات اور اقلیتی تحفظات کے لیے سنہرا ثابت ہوا اس دور میں ہمارا صوبہ فسادات کی وبا سے محفوظ رہا، اقلیتی مسائل اور پسماندہ طبقات کی طرف خصوصی توجہ دی گئی جو کچھ مستقبل کے لیے خاکے بنائے گئے ہیں اگر اس میں عملی رنگ بھر دیا گیا اور نوکرشاہی آڑے نہ آئی جو فرنگی سامراج کی یادگار کے طور پر انتظامیہ پر چھائی ہوئی ہے تو ہمارے صوبے کا مستقبل شاندار ہے اگرچہ ہمارے ملک میں موجودہ جمہوریت باہر سے آئی ہے لیکن اس کی جڑیں اس سرزمین میں پنچایتی نظام کی شکل میں پہلے سے موجود تھیں اس لیے یہ پودا حکومت اور عوام کی آبیاری سے ایک تناور درخت بنتا جا رہا ہے لیکن اس کی سست رفتاری اور نوکرشاہی کی رکاوٹیں عوام میں مایوسی پیدا کر دیتی ہیں لیکن امید کی جاتی ہے کہ تعلیم و سیاسی شعور کی ترقی کے ساتھ مطلع صاف ہوتا جائے گا۔

بھوپال ہندوستان کی ثقافتی راجدھانی

شہر بھوپال جو ملک کے نیک نام و مقبول راجہ بھوج کے نام پر ابتداءً آباد ہوا تھا اور ان کے ہاتھوں علم و معرفت کی شمع یہاں روشن ہوتی تھی حوادثِ زمانہ کے ہاتھوں نہ وہ آبادی رہی نہ علم و معرفت کی روشنی یہ شہر اجڑ کر ماہی گیروں کی بستی بنا رہا اس کی قسمت کا ستارہ دوبارہ اس وقت چمکا جب سرحد آزاد کے ایک سیدھے سچے پٹھان سردار دوست محمد خان نے ۱۷۰۹ء اس کو دوبارہ آباد کیا پرانے باشندوں نے نئے آنے والے قافلوں کا استقبال کیا۔ جو ملک کے مختلف خطوں سے آکر اس کی رونق بڑھاتے رہے سردار صاحب کے جانشین نواب یار محمد خاں نے بھوپال سے باہر کے علماء فضلا کو خصوصی طور پر مدعو کیا کہ شہر کی اصل رونق ارباب علم و فضل سے ہوتی ہے بعد کے نوابوں کے دور میں بھی شمال و جنوب سے آنے والے قافلوں کا تانتا بندھا رہا یہاں تک

بیگمات کے زریں دور میں باقاعدہ مہم کے طور پر ہندوستان کے شرفاء اور علماء وفضلاء کو دعوت دے کر یہاں بلایا گیا دورِ جہانگیری وعہد سکندری میں شہر بھوپال میں دلّی اور لکھنؤ کی تہذیب نے آکر دم لیا اردو زبان کی طرح بھوپال کی تہذیب مختلف تہذیبوں کے اختلاط اور مختلف شہروں سے آنیوالے لوگوں کے باہمی ارتباط سے پیدا کر ایک حسین تہذیب کا گلدستہ بن کر نمودار ہوئی جس کی بنیادی خصوصیت باہمی رواداری ملنساری اور آپس کے تعلقات میں خوش گواری رہی اس طرح شہر بھوپال ابتداء ہی سے گوناگوں تہذیبوں اور بوقلموں تمدنوں کا سنگم بنتا گیا اور یہاں کے باشندے ہر باہر کے آنیوالے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے بھوپال نے ہر باہر کے بھوپالی بن کر آنیوالے مہمانوں کا دل سے خیر مقدم کیا اور ان کو اپنے دلوں میں جگہ دی ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمان مصیبت زدوں کا جس طرح دل کھول کر تعاون دیا اسی طرح پاکستان سے آنیوالے سندھی بھائیوں سے ہاتھ ملایا بھوپال تال کی یہ خاصیت مشہور چلی آرہی ہے کہ جس نے اس کا پانی پی لیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا چنانچہ بھوپال مرکزی راجدھانی دہلی کی طرح مختلف صوبوں کے باشندوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ بن گیا ہے حکومت ہند نے اس خصوصیت کو مخصوص کر کے یہاں بھارت بھون تعمیر کرایا جس کی بنیاد رکھنے والوں میں ایک راقم الحروف بھی ہے۔

بھارت بھون ہندوستانی قوموں کے ادب شاعری کا مرکز ہے جہاں آئے دن ادیبوں شاعروں اور فنون لطیفہ کے ماہروں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے اس لیے ہم بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ شہر بھوپال کو پورے ہندوستان کی ثقافتی راجدھانی ہونے کا حق حاصل ہے۔

تاریخِ آزادی کا گم کردہ ورق

ہندوستان جنت نشان

رنگا رنگ پھولوں کا ہے گلشن مرا ہندوستاں
ہر روش پر جلوہ فرما رنگ و بو کا کارواں

اس چمن کے حسن پر نازاں ہے ارضِ ایشیا
دل ربا ہر خطہ اس کا، ہر علاقہ دل کشا

باغِ جنت کے مانند ہے اس کے باغوں کی بہار
آسماں سے باتیں کرتے ہیں یہاں کے کوہسار

اس کی ہر گھاٹی ہے تاباں اس کی ہر وادی حسین
مہرِ گردوں کی طرح روشن ہمالہ کی جبیں

خوبصورت، خوش فضا ہیں اس کے صحرا اور پہاڑ
کیا بھلے لگتے ہیں میدانوں میں سر سبز جھاڑ

اس کے دریا بہہ رہے ہیں پیچ و خم کھاتے ہوئے
جانبِ منزل رواں ہیں خوب اٹھلاتے ہوئے

چوڑے چکلے اس کے میدانوں کی وسعت الاماں
یا اتر کر آگیا ہے اس زمیں پر آسماں

کسقدر شاداب ہے۔ دوآبہ گنگ و جمن
نورِ عرفاں کی شعاعیں ہر طرف جلوہ فگن

کوہِ وندھیا چل کا پھیلاؤ نظر میں ہے بسا
اونچے نیچے ہے پہاڑوں کا سنہری سلسلہ

اس چمن کا گل کدہ کشمیر ہے جنت نظیر
ہر نظارہ جاں فزا ہر ایک منظر دل پذیر

سیم و زر، لعل و گہر سے ہے بھرا کان وکن
دل کش و دل چسپ اس خطہ کے ہیں کوہ و دمن

ساحلوں پر سر پٹکنے والی موجوں کا سماں
دیکھنے سے کس قدر ہوتا ہے ہر دل شادماں

آئینہ میں اس کے ہر ملک کی ہیں جھلکیاں
ساری دنیا کے نمونہ ہے مرا ہندوستاں

باغبانِ بزمِ فطرت نے سجایا ہے اسے
خوشنما گلدستۂ قدرت نے بنایا ہے اسے

روزِ اوّل سے بنا ہے یہ نوعِ انساں کا وطن
خلد کی خوشبو سے مہکا ہوا میرا چمن

ہندوستان میں اسلام کا داخلہ

حضرت آدم کا لنکا میں ہوا پہلے نزول
فخر گلشن بن گیا یہ گلشن جنت کا پھول

حضرت شیث نبی کا بن گیا پھر جلوہ گاہ
روشنی سے ان کے تاباں ہو گئے قلب و نگاہ

قافلے انسانیت کے پے بہ پے آتے رہے
بادۂ تہذیب کے پیمانے چھلکاتے رہے

قافلے گزرے ہیں کتنے اس کی ارض پاک پر
کتنی قوموں کے نشاں ہیں اس زمیں کی خاک پر

مشرق و مغرب کی تہذیبوں کا گہوارہ وطن
جاذب قلب و نظر ہے خلد نظارہ وطن

سب سے آخر میں عرب کا قافلہ اترا یہاں
مشعل ایماں تھی جسکے ہاتھوں میں جلوہ فشاں

تاجروں کا، صوفیوں کا کارواں باصفا
اس گلستاں میں اتر کر ہو گیا نغمہ سرا

گونج اٹھا نغمۂ توحید سے یہ گلستاں
ہو گیا نور مساوات واخوت ضوفشاں

اک نئی آواز مشرق و غرب لہرانے لگی
ملک کے دیوار و در سے یہ صدا آنے لگی

شوق عرفاں کا پیام جاں فزا پلنے لگا
غنچۂ امید باغ یاس میں کھلنے لگا

داعیان حق کی تھی آواز صور ارتقا
سو رہا تھا یہ چمن انگڑائیاں لینے لگا

ہند کے ظلمت کدہ میں جگمگائی شمع نور
غیب کے پردہ سے دعوت کا ہوا گویا ظہور

نور حق کی جگمگاہٹ سے جبیں روشن ہوئی
اولیاء اللہ سے یہ سرزمیں روشن ہوئی

فاتحوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے شمشیر وسناں
ہوتا ہے طاقت کے بل پر ان کا ہر سکہ رواں

فاتحوں کے دل میں لرزاں ہیں شرار اقتدار
روح مذہب سے پرے ہیں ان کے اکثر کاروبار

اقتدار ان کا فقط جسموں پر ہوتا ہے ضرور
ان کی شخصیت مگر حسن عقیدت سے ہے دور

صوفیہ کرام اور اسلام

اصل دعوت کے امانت دار ارباب یقین
بے غرض بندوں سے پھیلا ہے جہاں میں اصل دیں

صوفیانے ذوق عرفاں کا جلایا ہے چراغ
آبیاری سے انھیں کے لہلہا اٹھا یہ باغ

صوفیا ہیں نوع انساں کے حقیقی خیر خواہ
ان کے دل ہمدردیٔ انساں سے ہیں الفت پناہ

عشقِ حق سینوں میں ان کے الفت نوع بشر
آئینے شانِ ربوبیت کے ہیں قلب و نظر

ساری مخلوقِ خدا کا ان کے دل میں ہے پیار
خلق کے ہر ایک دکھ پر ان کی آنکھیں اشکبار

خلق کے ہر اک ستم پر ہوتے ہیں سینہ سپر
رنج و راحت میں ہیں مخلوق خدا کے ہم سفر

ان کے دل پاکیزہ حبِ جاہ و حب مال سے
ہر طرح فارغ اور یکسو جی کے اس جنجال سے

ان بزرگوں نے یہاں پھیلایا روحانی نظام
حضرت خواجہ معین الدین ہیں سب کے امام

ملک میں پھیلا جو ہے روحانیت کا سلسلہ
خواجۂ چشتی کے ہے فیض نظر کا ماجرا

جلوہ نورِ قطب سے ہند روشن ہو گیا
فیض روحانی سے عرفاں کا نشیمن بن گیا

اس گلستاں کے مہکتے پھول ہیں بابا فرید
بارگاہ خلق میں مقبول ہیں بابا فرید

خواجہ صابر علی احمد ہے جن کا پاک نام
ان سے پھیلا اس علاقہ میں محبت کا پیام

حضرت اقدس نظام الدین امام الاولیا
ان کے نورِ قلب سے روشن ہوئی ساری فضا

حضرت خواجہ نصیر الدین دہلی کے چراغ
ان سے تاباں ہو گئے ہندوستاں کے باغ و راغ

ماہ و انجم کی طرح ہیں آسماں پر ضو فشاں
ان بزرگوں کی ضیاء باری سے روشن گلستاں

صوفیا چشت سے پرنور افغانوں کا دور
ملک میں پھیلا ہوا تھا معرفت کا زور و شور

دورِ مغلیہ میں دعوتِ تجدید (حضرت مجدد الف ثانی)

یک بیک تاریخ نے تیزی سے الٹا اک ورق
شام کے پردہ پر چھایا جلوۂ رنگ شفق

اک نیا عہد سیاست ملک بھر میں چھا گیا
مغلیہ دورِ حکومت کا علم لہرایا گیا

پھر چمک اٹھا جہاں کے پردہ پر ہندوستان
اکبر اعظم کا عہد زرنگار و زرفشاں

ذوقِ روحانی کے جھوٹے مدعی پیدا ہوئے
پیشہ ور صوفی اور جھوٹے مولوی پیدا ہوئے

اس جفا پیشہ جماعت نے بگاڑا دین کو
اپنی اوچھی حرکتوں سے ہے اجاڑا دین کو

عہد اکبر میں سیاست کو فروغ حاصل ہوا
تیغ بے دینی سے دین مصطفیٰ گھائل ہوا

نورِ علم و معرفت کا بجھ گیا روشن چراغ
یوں چلی آندھی کہ جس سے ہوگیا تاراج باغ

مطلعِ سرہند سے نکلا درخشاں آفتاب
دعوت تجدید سے جسکی کھلا اک تازہ باب

جمع اس نے ملتِ بیضاء کا شیرازہ کیا
اس نے دینِ مصطفٰی کو پھر تروتازہ کیا

راہ دعوت میں مصائب گو اٹھائے تھے بہت
اپنے سینہ پر ستم کے تیر کھائے تھے بہت

اپنی دعوت پر رہا قائم وہ مردِ پُروقار
اسکے سر پر سے تھے گزرے ظلم کے طوفاں ہزار

قافلہ اسلام کا پھر راہ حق پر چل پڑا
قافلے کو مل گئے پھر رہبرانِ باصفا

نسلِ تیموری میں فخرِ خانداں پیدا ہوئے
شاہ عالم گیر و شاہ شاہ جہاں پیدا ہوئے

قعرِ پستی میں ہے گرنا ہر بلندی کا مآل
عام ہے قانونِ قدرت ہر کمالے را زوال

نت نئے فتنوں کا طوفاں چرخ پر چھاتا رہا
خاندانِ مغلیہ کا گرد فر جاتا رہا

بن گئے کمزور و بے بس ملک کے شاہ و وزیر
سامراجی پنجہ میں گویا ہوئے قید و اسیر

سازشوں کا جال سارے ملک میں بچھتا گیا
رفتہ رفتہ سب کو زنجیر غلامی میں کسا

ہندوستان میں سامراج کا حملہ

حملہ آور ہوگیا اب ایشیا پر سامراج
آگئے خطرہ میں سارے صاحبان تخت و تاج

مذہب و تہذیب پر حملوں کا اک طوفاں اٹھا
سامراج اٹھا کہ گویا فتنۂ گر شیطاں اٹھا

مغربی ملکوں نے پھینکا ایشیا میں اپنا دام
اپنے مکر و دجل سے سب کو بنا ڈالا غلام

خانہ جنگی کے نئے ماحول کو پیدا کیا
ملکوں کو باہم لڑا کر فتنوں کو برپا کیا

ہند کی روشن فضا میں اک اندھیرا چھا گیا
نت نئے طوفان لے کر جیسے شیطان آگیا

بزمِ فطرت میں جہاں دن ہے وہیں موجود رات
نور ظلمت کے جلو میں آگے بڑھتی ہے حیات

حق و باطل کا تصادم سرخئ نقشِ حیات
جد و جہد زندگی سے ملتی ہے راہ نجات

جد و جہد زندگی کا صفحۂ روشن جہاد
جس کے ہاتھوں مٹتا ہے آفاق سے شر و فساد

اک جماعت حق پسند باصفا پیدا ہوئی
قوت باطل سے پنجہ آزما پیدا ہوئی

وہ جماعت برسر میدان باطل آگئی سامراجی فوج کے مد مقابل آگئی
ملک میں قائم ہوا دعوت کا روحانی نظام
حضرت شاہ ولی اللہ ہیں اس کے امام

دعوتِ ولی اللّٰہی اور ہندوستان

وہ حکیم الہند، فخر کشور ہندوستان جس کی حکمت کی زباں ہے زندگی کی ترجماں
اس کے خامہ نے انوکھی شرع کی تفسیر کی دین فطرت کی نرالی شرح عالمگیر کی
سب سے پہلے اسنے کھولی حکمت قدر معاش کر دیا اسرار دین کو اپنی تحریروں سے فاش
جب تلک قائم نہ ہو موزوں معاشی انتظام کارفرما ہو نہیں سکتا شریعت کا نظام
اسکی دعوت کی ہے عالمگیر قدروں پر اساس اس کے قامت پر اگرچہ زیب وتن ملکی لباس
سب سے پہلے اس نے چھیڑا ہے معاشیات کو سب سے پہلے اسنے پرکھا عصر کے حالات کو
انقلابی فکر سے روح عمل بیدار کی سامراجی طاقتوں کو دعوت پیکار دی
شاہ صاحب کی ہے دعوت، دعوتِ علم ویقیں فکرِ روشن سے منور اس کی تابندہ جبیں
پھونکی اس دعوت نے اہل دین میں روح انقلاب جاگ اٹھے اس کو سن کر خفتگان بزم خواب
اس کی شاخیں پھوٹ نکلیں ملک کے اکناف میں خوب پھیلی یہ جماعت ہند کے اطراف میں
داعی اکبر بنے اس کے شہ عبد العزیز نابغہ اس عصر کے اور صاحبِ فضل وتمیز
شارح قرآن وسنت، مجدد عظمت کے نشاں حکمت وفکر ولی اللہ کے تھے ترجماں
کس قدر تھی تیغ بُرّاں انکی وہ تیغ قلم فتویٰ دار الحرب کا دیکر اٹھایا اک قدم
ملک کے ہر گوشہ میں کھلبلی سی مچ گئی سامراجی طاقتوں کو آگئی اک جھرجھری
ظلم ودہشت کے پہاڑ اس ذات پر توڑے گئے اس کے جسم زار پر یہ ستم توڑے گئے

راہ حق کا وہ مجاہد آگے ہی بڑھتا رہا
کوہ طور امتحاں پر بے تکاں چڑھتا رہا

دعوتِ جہاد اور سیّد احمد شہید

اس چمن میں داغ بیل اسکی جماعت سے پڑی
فوج باطل کے مقابل ہو گئی آکر کھڑی

ہر مجاہد اس جماعت کا جواں بخت وسعید
قافلہ سالار اس کے سید احمد شہیدؒ

دعوت ارشاد کا اک سلسلہ برپا کیا
خلق کی رشد و ہدایت کے لیے دورہ کیا

نور عرفاں کی شعاعوں سے چمک اٹھا جہاں
ہر طرف ذوق شہادت ہو گیا جلوہ فشاں

سرحد آزاد جاکر نظم ملت کا کیا
لاکر میداں میں عدو سے معرکہ آرا کیا

کچھ دنوں میں کامیابی نے قدم چومے وہاں
ہو گئے ظاہر افق پر فتح یابی کے نشاں

جلوہ فرما ہو گیا سرحد میں اسلامی نظام
جاگ اٹھا ذوقِ عبادت، بندگی کا اہتمام

جلوۂ ایثار والفت سے فضا روشن ہوئی
سرزمینِ کوہ وصحرا، وادیٔ ایمن ہوئی

ایسا لگتا تھا صحابہؓ کا زمانہ آگیا
منظرِ عہدِ نبوت ہر نظر میں چھا گیا

جب مسلسل فتح یاب ہوتے گئے اہل غزا
کر دیا شیطاں نے سرداروں کو آتش زیر پا

عہد شکنی پر ہوئیں آمادہ خفیہ بستیاں
اک شب میں ذبح کر ڈالے جو قاضی تھے وہاں

غدر کر کے نظم اسلامی کو برہم کر دیا
اہل دل کی آنکھوں کو اشکوں سے پرنم کر دیا

نذرِ سازش ہو گئے سردار پیماں توڑ کر
قصر دیں کو ڈھا دیا باطل سے رشتہ جوڑ کر

یہ مجاہد نذرِ میدان شہادت ہو گئے
کس مسرت سے شہید راہ الفت ہو گئے

ملک کی تاریخ آزادی کا عنواں بالاکوٹ
سرخیٔ خون شہادت سے ہے تاباں بالاکوٹ

قافلہ نے اہل ہمت کے نہ مانی یہ شکست
کر لیا ان جاں نثاروں نے نیا اک بندوبست

ایک نیا عزم جواں لے کر نبرد آرا رہے
فوج سے برطانیہ کے معرکہ فرما رہے

یہ جماعت برسرپیکار آخر تک رہی
سلطنت برطانیہ کی جڑ ہی کٹ کر رہ گئی

دعوتِ ارشاد

ایک نیا نقشہ جہاد حق کا ابھرا ہند میں
اِس نئے نقشہ سے اک سیلاب اٹھا ہند میں

غازیوں کی اک جماعت مصلحوں کا اک گروہ — ہیبت حق کی ضیا سے ان کے چہرے پرشکوہ
ملک بھر میں داعیانِ حق کا سچا قافلہ — پھر لگا پھیلانے ایمان و یقین کا سلسلہ
تحفۂ علم و عمل تقسیم فرمانے لگا — دعوتِ ایمان و عرفاں عام فرمانے لگا
ہو گیا تھا ملک میں کمزور مرکز کا نظام
جہل میں ڈوبے ہوئے تھے ملک کے اکثر عوام

فرنگی سامراج اور ہندوستان

سر زمین ہند میں لہرا سکے ان کا علم — رکھے انگریزوں نے پردہ میں تجارت کے قدم
دھیرے دھیرے ہو گیا غالب فرنگی سامراج — ظلم و دہشت اسکی فطرت، لوٹ مار اسکا مزاج
رفتہ رفتہ ملک میں اس کے قدم بڑھنے لگے — مکر کی سیڑھی لگا کر بام و در چڑھنے لگے
ظلم کے ہاتھوں مخالف اک فضا پیدا ہوئی — اپنے ہتھکنڈوں سے خود ہی کمپنی رسوا ہوئی
آگ سینوں میں بھڑک کر تیز تر ہونے لگی — ملک کی ساری فضا زیر و زبر ہونے لگی
ساری قومیں سینہ تانے آگئیں میدان میں
تہلکہ اک مچ گیا اقلیم ہندوستان میں

معرکۂ جہاد ۱۸۵۷ء

بے محابا اس جماعت نے اٹھایا پھر قدم — اپنے کندھوں پر اٹھایا پھر بغاوت کا علم
اس جہاد حریت میں سب ہی حق آگاہ تھے — قافلہ سالار اس کے حاجی امداد اللہ تھے
حضرت قاسم، رشید احمد تھے اس میں سربراہ — تھے ولی اللّٰہی جماعت کے یہ سب نور نگاہ
فتح کر کے بڑھ رہے تھے اہل عرفان و یقین — شاہدِ عادل ہے اس پر شاملی کی سر زمین
غدر سے اپنوں کے پھر پانسہ پلٹ کر رہ گیا — سارا ہنگامہ بغاوت کا سمٹ کر رہ گیا
خوب ڈھایا ملک میں جور و ستم انگریز نے — لال قلعہ پر اڑایا پھر علم انگریز نے
ظالموں کے پنجہ میں جب نظم ملکی آگیا — ملک جور و ظلم کی تلوار سے تھرّا گیا

تعلیمی دعوت اور دیوبند

اس جماعت نے نیا نقشہ بنایا کام کیا
اک نیا خاکہ بنایا ربطِ خاص و عام کا

درس گاہوں کا سنہری سلسلہ قائم کیا
ملّتِ بیضا سے تازہ رابطہ قائم کیا

ملک کے ہر گوشہ میں اک جال سا بچھتا گیا
نسخۂ تحریکِ آزادی سمجھ میں آگیا

جہل کے ظلمات میں جو قوم پھنس کر رہ گئی
اوج رفعت سے لڑھک کر قعرِ پستی میں گری

علم کے ذوقِ تجسّس سے جو بیگانہ رہا
خانۂ دل تیرگی سے اس کا ویرانہ رہا

علم اک نورِ سحر ہے جہل اک شام سیاہ
اس زمیں سے آسماں تک علم کی ہے جلوہ گاہ

علم ہے تسخیرِ فطرت علم ہے تسخیرِ جاں
علم کے زیرِ نگیں ہے محفلِ کون ومکاں

علم ظاہر علم سائنس، علم باطن، علم دین
ظاہر و باطن کی آمیزش سے ہے علم الیقین

علم دین و علم دنیا میں ہے ربط باطنی
روح و تن کے رشتہ سے قائم ہے جیسے زندگی

غفلتوں میں علم کی میراث کو کھوتا رہا
یعنی یورپ جاگ اٹھا اور ایشیا سوتا رہا

قوم بنتی ہے جہاں میں قوتِ تنظیم سے
انقلابی روح پیدا ہوتی ہے تعلیم سے

آدمی جب تک کہ حق سے آشنا ہوتا نہیں
قوتِ باطل سے پنجہ آزما ہوتا نہیں

حق شناسی آدمی کے واسطے تلوار ہے
یہ جہانِ رنگ و بو، اک عرصۂ پیکار ہے

ہر عمل نیکی کا انساں کے لیے ہے اک جہاد
نیکوکاری سے جہاں میں کھلتی ہے راہ معاد

لوحِ دل میں جب ہوا نقشِ صداقت مرتسم
محو ہو جاتا ہے دل سے زندگی کا خوف و غم

علم کا مرکز بنی پھر سرزمینِ دیوبند
ہند میں جس نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

بن گیا اک قلعہ آزادی پسندوں کا جہاں
تربیت پانے لگے آ آ کر ملّت کے جواں

ہو گئے پھر جمع اس مرکز میں اربابِ نظر
شورِ حریت سے گونج اٹھے بام و در

شیخ الہند کی دعوت جہاد

اس جماعت میں سے مردِ باصفا پیدا ہوا
جادۂ حق کا مجاہد، رہ نما پیدا ہوا

عشق حق کے واسطے اسکی خوشی تھی اس کا غم
خلق کی خدمت میں تھے اٹھتے ہوئے اس کے قدم

عشق حق کی راہ میں سرمست دیوانہ رہا
شہرت و نام آوری سے دور و بیگانہ رہا

جلوہ اخلاص کامل اس کے چہرہ کا تھا نور
بے نیاز زعہدہ و منصب تھا وہ مرد غیور

گم رہا پردہ میں گمنامی کے مرد خوش سیر
جس طرح پتوں میں چھپ جاتا ہے اک شیریں ثمر

وہ مجاہد جس کی ہستی خود بجائے انجمن
نام نامی اس کا شیخ الہند محمود الحسن

اس مجاہد نے مذاق حریت تازہ کیا
دھیرے دھیرے اس نے جمع شیرازہ کیا

جسنے آزادی کی پھر تحریک کو جاری کیا
اپنے شاگردوں سے پیماں جاں نثاری کا لیا

بیج دعوت کا وہ ارض ہند میں بوتا رہا
سامراج بستر پر غفلت کے پڑا سوتا رہا

شیخ کا حلقہ عقیدت کا تھا پھیلا ہوا
اک جہاں زنجیر نورانی میں تھا جکڑا ہوا

ملک کے مشہور رہبر شیخ کے تھے جاں نثار
شمع اخلاص عمل کے معتقد پروانہ دار

اس قدر دعوت یہ خفیہ ملک میں چلتی رہی
اپنوں بیگانوں کی نظروں سے بھی یہ مخفی رہی

اس کے دل کی آگ پھیلی ارض یاغستان تک
ہند سے اڑ کر وہ پہنچی چین اور جاپان تک

ہر طرف بڑھتا رہا اس کے مشن کا دائرہ
شعلۂ خاموش کے مانند اس کا سلسلہ

جنگِ عظیم اور شیخ الہند

ناگہاں یورپ میں بھڑکا اک شرارا جنگ کا
پھیلتا، بڑھتا گیا، خونیں نظارا جنگ کا

یہ تباہی دیکھ کر دل ہو گیا اس کا دو نیم
جنگ کے شعلے جو بھڑکے بن گئی جنگ عظیم

روشنی آئی نظر ظلمت میں صبح عید کی
اس اندھیرے میں سے پھوٹی اک کرن امید کی

باندھ لی اپنی کمر ان تازہ احساسات سے
صبر کا پیمانہ چھلکا ان نئے حالات سے

راہ ہجرت پر ہوا مرد مجاہد گامزن
اپنے نصب العین کی خاطر لیا ترکِ وطن

جا کر مکہ اور مدینہ میں بچھائی اک بساط
ترک کے سرداروں سے قائم کیا پھر ارتباط

ہند کا آزاد کرنے کا نیا نقشہ بنا
جس کا ہر اک مرحلہ تھا پر خطر صبر آزما

پرخطر میدانوں میں ہر اک فدائی تھا کھڑا ‌‌ جاں نثاروں نے کیا اپنے فریضہ کو ادا

سلطنت برطانیہ سے تھا بغاوت کا نظام ‌‌ ریشمی سازش کا جس کو دیدیا بدنام نام

سوز دل سے چرخ پر برق و شرر پیدا ہوئے ‌‌ مطلع اخلاص سے شمس و قمر پیدا ہوئے

ایک کوکب تھے عبید اللہ سندھی جن کا نام ‌‌ چرخ پر قربانیوں کے ان کا اونچا ہے مقام

حضرت شیخ حسین احمد ہوئے جو جانشین ‌‌ چمکے جو عالم میں بن کر یادگار آخریں

برکت اللہ مطلع بھوپال کے ماہ تمام ‌‌ صفحۂ تاریخ عالم پر درخشاں جن کا نام

سیکڑوں انجم تھے اس چرخ مکوکب میں جڑے ‌‌ صفحۂ عالم میں جن کے جا بجا جھنڈے گڑے

دوسرا جنگی محاذ پھر شیخ نے قائم کیا ‌‌ سوئے کابل شیخ سندھی کو روانہ کر دیا

تھل رہے مہر بھارت تھے اس میں سرو و یاسمن ‌‌ بن گیا تھا شہر کابل انقلابوں کا چمن

ہند کی آزادی کی اک حکومت بن گئی ‌‌ یہ حکومت ثمرۂ تاریخ دعوت بن گئی

ایشیا کے چرخ پر پھر کالی بدلی چھا گئی ‌‌ پھول بننے سے ہی پہلے یہ کلی مرجھا گئی

دیکھتے ہی دیکھتے پانسہ پلٹ کر رہ گیا ‌‌ شیخ کا منصوبہ طوفانوں میں گھر کر رہ گیا

اتحادی طاقتوں کا بول بالا ہو گیا ‌‌ ایشیا کا چرخ پھر ظلمت سے کالا ہو گیا

اپنے موقف پر رہا قائم وہ مرد خدا ‌‌ شہسوار حریت ہے وہ اسیر مالٹا

ہے شکست و فتح کا قصہ خدا کے ہاتھ میں ‌‌ جیت کا اور ہار کا رشتہ خدا کے ہاتھ میں

رشتۂ جد و جہد کا انساں کے ہاتھوں میں دیا ‌‌ عہد و پیمان عمل قدرت نے ہم سے ہے لیا

خالق کل نے کیا انسان کو پابند عمل ‌‌ ہر نتیجہ کا ہے مالک خود خدائے لم یزل

ہر نتیجہ کا ہے مالک، مالک ہر دوسرا ‌‌ فیصلہ ہے "لیس للانسان الا ما سعیٰ"

تخم ریزی کی ہے حد تک محنت ہر کاشتکار ‌‌ فصل کا اگانا شان قدرت پروردگار

ان بزرگوں نے ہے ڈالا تخم محنت کا یہاں ‌‌ پھوٹ کر پودا ہوا تازہ ہواؤں سے جواں

انکے خون دل سے اس گلشن میں آئی ہے بہار ‌‌ جلوۂ خون شہادت سے گلستاں لالہ زار

اس چمن میں پھول پھل ان کی ہی محنت سے لگے ‌‌ کس مزہ سے ان پھلوں کو سارے انسان کھا رہے

راہ حق پر گامزن ہر دم رہے مردان کار ‌‌ خلق کی خدمت خلوص دل سے ان کا تھا شعار

پردہ میں اخلاص کے ہر طرح پوشیدہ رکھا — ان کا ہر ہر کارنامہ حسبۃً للہ رہا
یہ نفوس قدسیہ مہر و مہ افلاک ہیں — شہرت و نام آوری سے ان کے دامن پاک ہیں
صفحۂ تاریخ گو خالی ہے ان کے نام سے — ہر عمل ان کا تھا بے پروا غم انجام سے
حلقۂ اہل سیاست حلقۂ نام و نمود — ان کے دام مکر سے نالاں ہے بزم ہست بود
ہر عمل شہرت کی خاطر ہر قدم بہروپیا — پاک اِن ذہنوں سے یکسر دامن اہل صفا
یہ نفوس قدسیہ ہیں نازش انسانیت — نے سیاست ان کا مقصد نے حصول سلطنت
چہرۂ تاریخ نورانی ہے ان کے نام سے — مفتخر یہ بزم انسانی ہے ان کے نام سے

ان کے اخلاص عمل سے دہر کا قائم نظام
ان نفوس پاک پر ہو حق کی رحمت اور سلام

(ختم شد)